مداوا

فرقت کاکوروی

ناشر

یوسفی پریس لکھنؤ

بار اول ۱۰۰۰ ... ... جنوری سنہ ۱۹۴۴ء ... ... قیمت چار روپیہ

اُن "ناترقی پسندوں" کے نام

جو

ترقی پسندوں کو بدنام کرتے ہیں

(مولوی حکیم) محمد ادریس انصاری پرنٹر پبلشر نے
یوسفی پریس فرنگی محل لکھنؤ میں چھپا کر شایع کی

فہرست مضامین

پیش لفظ

از مولانا عبدالماجد صاحب دریاآبادی

ترقی تو ادب میں ہونی ہی تھی، اور حرکت جب ہر چیز میں ہے تو ظاہر ہے کہ شاعری کیسے ساکن و جامد رہ سکتی تھی، لیکن بے راہ روی کا نام ترقی رکھ دینا اور بے قیدی کو آزادی سے تعبیر کرنے لگنا ایسا ہی ہے جیسے کسی کے جسم پر آماس ہو آئے اور ہم اُسے دیکھ کر کہیں کہ دیکھو یہ کیسا موٹا تازہ، تیار و تنومند ہے! ——— اونٹ جیسا حلیم و شائستہ جانور بھی جب شتر بے مہار بن جاتا ہے، تو اُس کے شتر غمزوں سے خدا کی پناہ!

پرانی شاعری اور پرانا ادب کوئی وحی آسمانی نہیں، کہ اس کا کوئی نقطہ نہ بدل سکے، کوئی شوشہ نہ ٹل سکے۔ خیالات بدلیں گے۔ اسلوبِ بیان بدلیں گے، اور بدلتے رہتے ہی ہیں۔ ولی کی شاعری غالب کی شاعری نہیں اور فسانۂ عجائب کی زبان امراؤ جان کی زبان نہیں، چراغ سے چراغ جلتا ہی آتا ہے اور شاخ سے شاخ پھوٹتی ہی رہتی ہے۔ بچہ جوان ہوتا ہے اور جوان بڑھاپے میں قدم رکھتا ہے۔ قدرت کا دستور ہی یہ ہے لیکن کوئی زبردستی کھینچ تان کر اگر بچہ کو جوان اور جوان کو بوڑھا بنانے لگے، تو یہ ارتقاء طبعی نہ ہوا۔ یہ فطرت سے کشتی اور زور آزمائی ہوئی جدت اگر محض جدت کی خاطر ہے۔ تو اس کا نام ندرت نہیں بدعت ہے، شگفتگی نہیں غرابت ہے۔

"ترقی پسند" ادیبوں کی فہرست میں نام منشی پریم چند آنجہانی اور قاضی عبدالغفار صاحب (مدیر پیام دکن) اور یہاں تک کہ "بابائے اردو"

ڈاکٹر عبدالحق سے بھی لئے گئے ہیں۔ اگر ترقی پسندی کا یہی معیار ہے تو پھر ہم سب ترقی پسند ہی ہیں اور اس ترقی پسندی سے انکار کس کافر کو ہو سکتا ہے؟ لیکن کاش اس دعوے میں خلوص ہوتا! دریا کے مقابلہ میں چند قطرے، خرمن کے سامنے چند دانے ہستی ہی کیا رکھتے ہیں "ترقی پسند" ادب کے نام سے جو سیلاب عظیم نثر و نظم دونوں میں بدمذاقیوں، عریانیوں اور گندہ بیانیوں کا چل پڑا ہے، اس نے حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پرانے ادب کے بڑے سے بڑے فحش نویس اور بڑے سے بڑے ہزل گو کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اور رنام از سر نو جان صاحب کا۔ بلکہ بعض حیثیتوں سے میاں چرکین کا چمکا دیا ہے! انا للہ ——— بدعقیدگی اور اخلاقی بیہودگی کو تو چھوڑیئے، آخر مذاق سلیم اور تمیز داری بھی تو دنیا کے ادب میں ایک چیز ہے۔ ان ظالم لکھنے والوں اور لکھنے والیوں کے صفحات میں تو آنکھیں اس کو بھی ترستی رہ جاتی ہیں! اسے

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے   حوران خلد میں تری صورت مگر ملے

جی خوش ہوا کہ ملک میں اس طوفان بے تمیزی (طوفان کو آپ مجاز کہہ لیجیے لیکن بے تمیزی کو حقیقت کے بجائے مجاز سمجھنا ظلم ہوگا!) کے خلاف تحریک پیدا ہوئی ہے اور جا بجا مزاحی اور سنجیدہ دونوں رنگ میں کوششیں رد و اصلاح کی شروع ہو گئی ہیں۔ انھیں کوششوں کی ایک عملی شکل یہ پیش نظر کتاب بھی ہے۔ کاکوری کے جوان عمر و جوان ہمت فرقت بی۔اے کے قلم سے اسکے مسودہ کے دو چار صفحہ مجھے بھی دکھلائے گئے، یقین ہے کہ ساری ہی کتاب اسی طرز و انداز کی ہوگی لکھنؤ زبان و ادب کی خدمت و اصلاح کے سلسلہ میں ممتاز شروع سے چلا آرہا ہے حق تھا کہ ایسی اصلاحی کتاب کی اشاعت بھی یہیں کی کسی اشاعت گاہ سے ہو۔

مقدمہ

از مولانا سید اختر علی صاحب تلہری

جناب فرقت کی تازہ ترین لطیف نظموں کے مجموعہ پر اظہار خیال کرنے سے پہلے اس کا اعتراف نہایت ضروری ہے کہ بدنصیبی سے میری فطرت تعلیم و تربیت کے پرانے دقیانوسی سانچوں میں ڈھلی ہے تعلیم و تربیت کی اس بدتوفیقی کا نتیجہ ہے کہ میرے ادبی و شعری ذوق کا مزاج بھی کہنہ ہے، دوسرے لفظوں میں جہاں تک ذوق کا تعلق ہے وہی دور از کار شاعری پسند آتی ہے جس کی بنیاد نغمہ آفریں اوزان پر ہو جس میں اُن سچے جذبات کی تصویر کشی کی گئی ہو جو ایک حد تک مستقل حیثیت رکھتے ہیں یہی نہیں بلکہ اس کا اسلوب بیان بھی رنگین ہو لفظوں کے استعمال میں بھی حسین تراش خراش پائی جاتی ہو. ظاہر ہے جو شخص شاعری سے متعلق اتنا بوسیدہ ذوق رکھتا ہو وہ اپنے مذاق کی فطرت کے لحاظ سے کس طرح اس نئی شاعری کو پسند کر سکتا ہے جس کا رُخ دوسری طرف مڑا ہوا ہے؟

غالباً اسی "ذہنی و جذباتی ماحول" کی وجہ سے ن. م راشد اور میراجی وغیرہم کی شعری کائنات سے مجھے کبھی لطف حاصل نہ ہوا اور اُن کے اشعار کی لے میرے سامعہ کے لئے بار ہی ہوتی رہی جب اس طرف حضرت فرقت کی دلپذیر نظمیں جو نئی شاعری کا اعلیٰ کارنامہ ہیں نظر سے گزریں تو میرے فطری ذوق کی تیوریاں چڑھ گئیں لیکن یہ کلام ایک شناسا کا تھا، اپنے دوست کا تھا، دوبارہ پھر اُسے دیکھا اور اس نظر سے دیکھا کہ اس میں جو خوبیاں ہیں انھیں بہر حال پا ہی لیا جائے کلّ جدید لذیذ ہر نئی چیز لذت بخش ہوتی ہے یہ بہت پرانا عربی کا مقولہ ہے اور اس میں انسانیت کے

سالہاسال کے تجربہ کا نچوڑ ہے۔ ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں ہے کہ نئی شاعری لذت بخشی کی خصوصیت سے خالی ہو صرف طلبِ صادق چاہئے۔ مانا کہ پرانے ذوقی نقطۂ نظر سے جدید شاعری میں نغمہ آفریں موزونیت کا وجود نہیں خیالات میں کوئی نظم نہیں اندازِ بیان میں بھی دلآویزی نہیں معانی و بیان و بدیع کے نکتوں سے بھی اُسے کوئی واسطہ نہیں اور یہ بھی تسلیم کرلیا کہ وہ "اخلاقی قدروں" کے لئے تباہ کُن ہے۔ یہ سب سہی مگر بہر حال وہ جدید ہے اور یہی وہ اس کی خصوصیت ہے جو کُلُّ جدیدٌ لذیذٌ کی بنا پر خواہ مخواہ ہر طرف سے اس میں لذتیں اکٹھا کر دے گی۔ اب رہی یہ بات کہ میرے ذوق کو، تعلیم و تربیت کے پرانے سانچوں میں ڈھلے ہوئے ذوق کو، اس میں لذت محسوس نہیں ہوتی تو مجھے خاموشی سے عرب کے نظریۂ بالا کی بنا پر یہ تسلیم کرلینا چاہئے کہ یہ خود میرے ذوق کی تشنہ لبی کا نقص ہے جو نئی شاعری کے افادی نکتوں کے قلزمِ زخار تک رسائی حاصل نہ کرسکا۔ اس نئی شاعری کی لذتوں سے کامیاب ہونے کے لئے ضروری ہے کہ بیسویں صدی کی "مارکسی عقل" سے جس پر ژولا اور عذرا پاؤنڈ کے ادبی دشعری جلوؤں کی چھوٹ پڑچکی ہو دستگیری کی خواہش کی جائے۔

بہت ممکن ہے کہ اگر حضرت فرقت کی تازہ نظموں پر اظہار خیال کی ضرورت نہ محسوس ہوتی تو میرے گھسے پٹے پرانے خیالات میں زندگی کی لہر نہ پیدا ہوتی اور میری فکر و خیال کی دنیا اسی طریقہ سے سوتی رہتی۔ نظموں کے اس مجموعہ کی یہ کامیابی کچھ کم قابلِ رشک نہیں ہے کہ اُس نے دفعتہً خیالات کا رُخ اس طرف موڑ ہی دیا اور ذوقی لحاظ سے نہ سہی "عقل ترقی اندیش" کے لحاظ سے ضرور اس قابل بنا دیا کہ نئی شاعری کے "افادی محاسن" کا تحلیل و تجزیہ سکون کے لمحوں میں کرسکوں۔ ذیل کی سطریں اسی عقیدت مندانہ تحلیل و تجزیہ کا نتیجہ ہیں جس کا نئی شاعری اپنے نقاد

قارئین سے مطالبہ کرتی ہے، ان میں شعر کے ذاتی حُسن کے بارے میں ذوق سے فیصلہ کہیں حاصل نہیں کیا گیا ہے بلکہ اُس کے حُسن کی جانچ کے لئے پہلے اس کا تاریخی اور سماجی پس منظر نگاہوں کے سامنے رکھا گیا ہے پھر اس پر غور کیا گیا ہے کہ اس میں اقتصادی اور سماجی افادیت کی متاعِ گراں ارز کس قدر موجود ہے اور اس کے نغموں کے گراموفون میں مزدوروں اور کسانوں کی کتنی آہیں اور کراہیں بھری گئی ہیں اس میں شک نہیں کہ نقطۂ نظر کے اس تغیر نے ادب و شعر کی نئی قدروں کا مکمل دفتر میرے سامنے رکھ دیا ہے، اب بفضلہٖ میں اس قابل ہوں کہ نئی شاعری کے ہر شاہکار پر خواہ وہ اس نوعیت کا ہو "بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" "بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے" یا پھر اس نوعیت کا ہو "تیرے رنگیں رس بھرے ہونٹوں کا لمس" گھنٹوں جھوموں اور اس کی ستایش میں سیکڑوں الفاظ لکھ ڈالوں خواہ میری اس حرکت پر میرا بدتمیز ذوق کتنے ہی طنز بھرے قہقہے لگائے

حضرت فرقت کو میں بہت زمانے سے جانتا ہوں۔ اس زمانہ سے جب اُن کی شاعری کی روح قدامت و فرسودگی کے ڈھانچہ میں بند تھی، اگرچہ وہ جوان تھے اور اچھی طرح جوان معلوم نہیں کہ اس طرف اُن کی اس حس لطیف نے کن دلچسپ حالات کے ماتحت کون سی دلچسپ کروٹیں لے ڈالیں کہ انھوں نے دفعتاً اپنی شاعری کا رُخ رومانیت کے ریگستان سے افادیت کے نخلستان کی طرف پھیر دیا۔ بہر حال اسباب کچھ ہوں اُن کی اس شاعری میں دنیا کی موجودہ "الجھنوں" کو سلجھانے کی کوششیں کی گئی ہیں "زندگی" کو سماج کے رشتہ میں دیکھا گیا ہے حقیقتوں سے آنکھیں چار کی گئی ہیں "جنسی بھوک" کے ہمہ گیر اثرات کو ابھارا گیا ہے۔ اُنکی پہلی شاعری "خلا میں لٹکی" ہوئی تھی حقیقتوں سے فرار کی کوششیں اس میں نمایاں ہوتی تھیں لیکن ان کی موجودہ شاعری کے تیور ہی اور ہیں حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے

"سماج کی مانگیں" اچھی طرح سے سمجھ لی ہیں اور دبے ہوئے کچلے ہوئے انسانی طبقوں کے دلوں کی دھڑکنوں کو انھوں نے خوب سُنا ہے ان کی موجودہ شاعری انھیں احساسات کی آواز بازگشت ہے اور اس لئے اس میں زندگی ہے، جان ہے، روح ہے۔ اور پھر راشد اور میراجی وغیرہ کی شاعری کی طرح وہ رینگتی ہوئی نہیں چلتی ہے بلکہ چھلانگیں لگاتی ہوئی اچھلتی کودتی چلتی ہے۔

آج کل کی جدید ترین شاعری کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ شاعر اپنے "نفسی تجزیہ" اور "جذباتی تسلسل" کے بہاؤ میں ہم آہنگی پیدا کرکے (اب خواہ وہ اسی طرح کیوں نہ ہو کہ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھانمتی نے کنبہ جوڑا) ذہنِ لاشعور میں سے آزاد تسلسل کو جنم دیتا ہے، ظاہر ہے کہ نفسی تجزیہ کے سلسلے میں اگر وہ ایمانداری کے ساتھ انجام دیا جائے، جنسی بھوک اپنی مختلف شکلوں میں سرفہرست نظر آئے گی اور فرائڈ کے مذاق کے مطابق ہر چیز پر وہی چھائی دکھائی دے گی۔ ن۔م۔ راشد وغیرہ کے یہاں یہ آزاد تسلسل پایا جاتا ہے اور جنسی بھوک اپنی تشنگی بجھانے کے لئے ہاتھ پیر مارتی نظر آتی ہے۔ مگر ان کوششوں میں صداقت کا نشان بہت کم ہے۔ حضرت فرقت کو اپنے ان محترم سابقین پر یہ فضیلت حاصل ہے کہ اُن کے یہاں یہ آزاد تسلسل بھی خاص شان سے پایا جاتا ہے، اس میں ابہام نہیں پیدا ہوتا اور یہ شاعر کی قوتِ تخیل و قوتِ بیان کا خاص ثبوت ہے۔ فرقت کی نئی شاعری میں جوش بھی ہے، صداقتِ تخیل و تصور بھی اور خلوصِ اظہار و بیان بھی۔ فرقت راشد وغیرہ کی طرح "فراری ذہنیت" رکھنے والے شاعر نہیں ہیں جو "اپنے گرد ایک مکڑی کا خول سا بُن لیں" وہ حقیقتوں سے آنکھیں چار کرنا جانتے ہیں اور اس لئے سچے سماجی شاعر ہیں، یہی وجہ ہے کہ فرقت جو "منطقی و نفسی ماحول" اپنی نظموں میں پیدا کرتے ہیں وہ پڑھنے والوں کے لئے مبہم و تاریک نہیں ہوتا "جنسی بھوک" متعلقہ اعضا میں جو گدگدی پیدا

کرتی ہے اُسے بھی شاعر چھپانا نہیں چاہتا کیونکہ وہ ایک سچا ترقی پسند شاعر ہے اور ایک سچے ترقی پسند شاعر کو پرانی اخلاقی قدروں سے کیا تعلق، وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے بغیر کسی جھجک کے براہِ راست کہتا ہے۔ فرقت کی ایک نظم ہے۔

کیا تری ساری کا آنچل اور ہٹ سکتا نہیں
اور ترے سینہ کا وہ رنگیں اُبھار
سامنے میرے نکھر سکتا نہیں
دے رہا ہے دیر سے جو
میری لاغر انگلیوں کو ہاتھ کی
شوخیوں کی دعوتیں

بادی النظر میں یہ نظم کسی "رومانوی تخیل" کا شاہکار معلوم ہوتی ہے اور اس لئے شاید نظر انداز کرنے کے قابل سمجھی جائے لیکن اس نظم کے اعصاب میں شدت جوعِ جنسی کا پیدا کیا ہوا جو تشنج محسوس ہوتا ہے وہ اُسے حقیقت کی ٹھوس زمین پر لے آتا ہے۔ اس کے ماسوا اسی سلسلے کے دوسرے بند میں "سیب" کو لب آسا ور کے "سیلونی قمقموں" کا مشبہ بہ بنا کر بھوک اور پیٹ کے مسئلہ کی اہمیت کا اعتراف کر لیا گیا ہے کیونکہ آزاد تسلسل کے سلسلہ میں اسی مشبہ بہ پر دفعتہً نگاہوں کا جم جانا اس کے سوا اور کوئی بات ثابت نہیں کرتا۔ یہ نظم کا وہ اہم پہلو ہے جس سے شاعر کے درخشاں سماجی نقطۂ نظر کا پتہ چلتا ہے اور نظم میں معاشی افادیت پیدا کرتا ہے۔ شاعر کا انگلیوں کی صفت لاغر لانا بھی اس کا ثبوت ہے کہ اُسے موجودہ معاشرت کی طبقاتی ناہمواری کا زبردست احساس ہے کیونکہ اس طبقاتی عدم مساوات کی فضا ہی میں زیادہ تر یہ ممکن ہوتا ہے کہ ایک کی انگلیاں لاغر ہو جائیں اور دوسرے کی فربہ۔

ن م راشد کی ایک نظم ہے "مکافات" اس کا آغاز اس شاندار اور تابناک

شعر سے ہوتا ہے ؎

رہی ہے حضرت یزداں سے دوستی میری
رہا ہے زہد سے یارانہ استوار مرا

اس بے تکلفانہ دوستی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ شاعر کسی معصیت میں مبتلا نہیں ہو سکا اور یہ نظم اس کے دل کے اس ارمان پر ختم ہوتی ہے۔

اے کاش چھپ کے کہیں اک گناہ کر لیتا
حلاوتوں سے جوانی کو اپنی بھر لیتا
گناہ ایک بھی اب تک کیا نہ کیوں میں نے

عین موسم شباب میں "حضرت یزداں" سے اس قدر گہری دوستی ہونا کہ جوانی کا منہ گناہوں کی حلاوتوں سے نہ بھرا جا سکے آج کل کے ترقی پسندانہ مذاق میں اس مضمحل بڑھاپے کی نشانی ہے جو بچپنے سے گلو گیر ہو جاتا ہے مگر نظم کا ہیرو اس کے اعتراف کی جرات نہیں رکھتا اپنی بے عملی کو حضرت یزداں کی دوستی کے پردے میں چھپانا چاہتا ہے۔

فرقت کی ایک نظم ہے "گھر اپنے واپس آؤں گا" اس کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے جہاں سے راشد نے نظم ختم کی ہے یعنی "اک گناہِ آتشیں کا مرتکب ہونے کے بعد" اس نظم میں فرقت کی حقیقت نگاری جو ان جنسی لگاتی نظر آتی ہے وہ اس ارتکاب معصیت کے بعد رومانوی قلعوں اور خیالی جنتوں میں پناہ گزیں ہونے کے بجائے مردانہ وار حکمت عملی کے ساتھ "ان حالات اور اُن قوتوں کا مقابلہ کرتا ہے جو اسکے کچلنے پر آمادہ ہیں" ؎

اک گناہِ آتشیں کا مرتکب ہونے کے بعد
اس طرح بھاگوں گا میں تیری نگاہِ گرم سے
جس طرح بندر کوئی کھمبا ہلا کر بھاگ جائے

اور دنیا ہکا بکا ہو کے دیکھے کون تھا!!

فراق کے یہاں تشبیہیں کچھ زیادہ نہیں ہیں لیکن جتنی ہیں وہ "نفسیاتی مصوری کی حیرت انگیز مثالیں" ہیں "بندر کا کھمبا ہلا کر بھاگ جانا" واقعہ کی پوری تصویر کھینچ دیتا ہے غور کی نگاہ اس میں مشرقی عورت کی بے بسی، بیچارگی اور مظلومی کا ہو بہو نقشہ بھی پاتی ہے جس طرح لقمے سے کھمبا بے جان، جامد اور بے بس ہوتا ہے اسی طریقہ سے مشرقی عورت بھی بیچارہ و مظلوم ہوتی ہے دست دراز اُسے ستا سکتے ہیں۔

بہت ممکن ہے کہ فراق کی یہ نظم "سیاسیات میں الجھے ہوئے کسی لمحہ کی پیداوار ہو" بندر کی طرح کھمبا ہلا کر بھاگ گیا پھر توکر بھیجکر پکڑ وا بلوایا جانا اور پٹوا یا جانا وغیرہ وغیرہ کیا الجھے ہوئے سیاسی تصورات کی طرف ایمائی نسبت نہیں رکھتے لیکن "شائد اس حسین اور انتہا درجے کی اثر آفریں نظم پر یہ الزام لگانا اسے مجروح کرنا ہوگا اس نظم کی کامیابی تو اس کی تاثیر ہی میں مضمر ہے۔

اس دلپذیر مجموعہ کی نظم "کل رات کو" بھی خاص طور سے اعلیٰ ترقی پسندانہ خاصیا کی حامل ہے اس میں آزاد تسلسل بھی ہے مگر وہ بھی ایک مسلسل سلسلہ کے ساتھ اہل دائیوں نرسوں کا ذکر کرتے کرتے شاعر کا خیال رجعت پسندانہ قوتوں کے سب سے بڑے مظہر مولوی اور ملا کی طرف منتقل ہو جاتا ہے ؎

کون ملا
زندگی کا جن کی کچھ مقصد نہیں
اور مقصد ہے تو یہ
دن رات ذکر و فکر میں
اوقات کو ضائع کریں
اور مفت کی کھایا کریں

اور دیں اذانوں پر اذاں

جس وقت ہم مشغول ہوں الخ

اِس مقام پر شاعر کی ترقی پسندی رجعت پسندی کی نمائندہ شخصیت کے خلاف آگ برسانے لگتی ہے۔ رجعت پسندی کے مشاغل کے خلاف شاعر نے یہاں طنز کی جو چنگاریاں اڑائی ہیں اُن کا جواب مشکل ہی سے اب تک کی جدید شاعری میں نکل سکیگا اسے پورے طور سے سمجھ لینا چاہئیے کہ فرقت کی شاعری اُس "منفی نظام زندگی" کا عکس نہیں ہے جو اس نے موجودہ دور سے ورثہ میں پائی ہے بلکہ بیشتر پرتو ہے اُس "اثباتیت" کا اس "ایجابیت" کا جو اس نے وراثت میں پائے ہوئے نظام زندگی کو روند کر کچل کر پیدا کی ہے۔ فرقت کا فلسفۂ حیات "رجائی" ہے وہ اپنی زندگی کے دامن میں یاس و قنوط کے جراثیم کی پرورش نہیں کرتا سسکتی ہوئی بلکتی ہوئی ہندوستان کی غلام دنیا کی آہیں اور کراہیں سنکر راشد کی طرح وہ یہ طے نہیں کر لیتا کہ "اب بیمار کے اچھا ہونے کی کوئی امید نہیں اسے اب مر ہی جانا چاہئیے" اسے یقین ہے کہ وہ اس بیمار کی رگوں میں نشاط و طرب کا تازہ خون پہونچا کر اس قابل کر سکتا ہے کہ وہ زندگی کے بازار میں پھر سے جوانی کا سکہ چلائے، اسی لئے میرا ان نوجوانوں کو جو زندگی کی نئی قدروں پر ایمان بالغیب لائے ہوئے ہیں اور جائز طور سے لائے ہوئے ہیں یہ مشورہ ہے کہ وہ "نقش فریادی" و "ن م راشد" کے بجائے اس مجموعہ کو حرز جاں بنالیں کیونکہ اُن سے زیادہ اس میں نئی زندگی کی "دوڑتی ہوئی اچکتی ہوئی پہل پہل" ملتی ہے۔

مقدمہ کے آخر میں ایک بات اور عرض کرنا ہے، اگرچہ وہ بات نئی شاعری پر خردہ گیری کی حیثیت رکھتی ہے تاہم وہ خلوص کے دل سے نکلی ہوئی ہے اور نئی

شاعری کے امکانات ارتقا کے آستانۂ قدس پر نیازمندانہ سجدے کے قبیل کی چیز ہے اس لئے توجہ سے سُنے جانے کے قابل ہے۔

نئی شاعری کی مقدس کائنات کا جائزہ لینے کے بعد محسوس یہ ہونے لگتا ہے کہ اس مبارک سلسلے میں ابتک جو کوششیں ہو رہی ہیں اُن کا رجحان خالص انقلابی نہیں ہو سکا ہے۔ انکی حیثیت اصلاحی ہے جس میں رجعت پسندانہ ادبی رجحانات کیساتھ مفاہمت کے جراثیم رینگتے ہوئے پائے جاتے ہیں "ماورا" کے دیباچہ میں ن۔ م راشد نے حالی سے متعلق لکھا ہے "حالی کے پاس اخلاقی قدروں کے سوا ادب کو جانچنے کا کوئی اور معیار نہ تھا قدیم تمثیلات اور اصنافِ سخن اور انداز بیان سے اس کی بغاوت محض ضمناً تھی، اگر حالی نے ان قدیم تمثیلات تصورات اور انداز بیان کو اولاً تباہ کرنے کی کوشش کی ہوتی جنھوں نے ہماری شاعری اور ادب کو آج بھی تیخ بستہ کر رکھا ہے تو اس نے بہت بڑا کام کیا ہوتا"۔ ن۔ م راشد نئی شاعری کے ایک بڑے رکن ہیں، اُن کا یہ ارشاد قابل توجہ ہے اور ضرورت ہے کہ اس کی روشنی میں موجودہ شاعری کا بھی جائزہ لیا جائے۔

نئی شاعری تمام "مفید قدروں" کی حامل ہونے کے بعد بھی یہ کمی ضرور رکھتی ہے کہ اس کی "تکنیک" میں بھی وہی سمجھوتے کی نشانیاں موجود ہیں جن حوصلہ مند افراد نے اس نئی عروس شاعری کو شاہد بہ استعارہ بہت ہی کہنہ و فرسودہ سمجھا جائے اس لئے اس کو یوں بدل لیجئے کہ اس نئی شاعری کی مشرس کو "اپنی آغوش" میں اچھی طرح بھینچ رکھا ہے، وہ بھی قدیم تمثیلات اور انداز بیان کو پوری طرح سے "شعوری طور" پر تباہ نہیں کر سکے ہیں بلکہ بیشتر تمثیلات و تشبیہات کا وہی رنگ ہے، مرکبات عطفی و توصیفی و اضافی کا وہی انداز ہے فعل و فاعل و مفعول کی وہی کیفیت ہے حروف جارہ وغیرہ کی وہی حالت ہے "انقلابی شکنجہ" میں ان میں سے کسی کو بھی نہیں

کہا گیا ہے یہ سچ ہے کہ حالی کے پاس "اخلاقی قدروں" کے سوا ادب کو جانچنے کا کوئی معیار نہ تھا مگر چبکے سے یہ بات پوچھ لینے کی ہے کہ نئے شاعروں کے پاس ادب کو جانچنے کا معیار "اقتصادی قدروں" کے سوا اور کیا ہے۔ ہاں مگر مجھ سے غلطی ہوئی، اقتصادی قدروں کے حلقہ سے باہر کوئی قدر نہیں ہے، اقتصادی قدروں کے مرکز پیٹ اور بھوک ہی کی طرف دنیا بھر کی قدریں سمٹی ہوئی چلی آتی ہیں، ایسی حالت میں اقتصادی قدروں سے اخلاقی قدروں کا جو آج کل کی تحقیق میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں کیا مقابلہ، بہر حال اس چبکے سے پوچھی ہوئی بات کو واپس لے لینے کے بعد بھی اس گذارش پر اصرار ہی کیا جائے گا کہ نئی شاعری انقلاب کے پینگ چار و نطرف بڑھاتی نظر نہیں آتی یہی کمی ہمارے محترم دوست فرقت کی موجودہ نئی شاعری میں بھی ہے، وہ اسے خوب اچھی طرح یاد رکھیں کہ نیا دور شاعری جب تک کامل و مکمل انقلابی کروٹیں نہیں لے گا اس وقت تک اس کی زندگی کی بھوک میں بیتابی نہیں پیدا ہوگی۔ جہاں تک میں ان کی اس شاعری سے اندازہ کر سکا ہوں حضرت فرقت میں انقلابی شاعری کا توانا مولود پیدا کرنے کی صلاحیت ہے، اس لئے میرا انھیں دوستانہ مشورہ ہے کہ وہ اس زمین پر قدم جمے نہ رکھیں بلکہ ابھی اور آگے بڑھیں اور یہ دیکھتے رہیں کہ جدید شاعری کے امکانات آگے پیچھے اوپر نیچے اور کیا کیا ہیں؟ اگر انھوں نے اس میدان میں سست گامی سے کام لیا تو پھر لازمی طور سے اُن کی جگہ کوئی دوسرا لے لیگا اور وہ بھی میر، غالب، انیس، اقبال، جوش کی طرح کل کی چیز ہو کر رہ جائیں گے۔

میری ناقص رائے میں ہماری شاعری کی "سیچ بستگی" کو دور کرنے کے لئے اس کی شدید ضرورت ہے کہ صورتاً و معنیً دونوں کے لحاظ سے شاعری کا چولا بدل دیا جائے نئی شاعری کے موجودہ علمبردار اب تک اپنے ذوقِ ترنم کو "فعول و مفاعیلن" کے حلقہ

سے باہر نہیں نکال سکے ہیں اور پرانی تیخ بستہ بحروں ہی سے کام لیتے ہیں اگرچہ کبھی کبھی ان کے اوزان میں کچھ کتر بیونت کر دیتے ہیں، سوال یہ ہے کہ آخر وزن کی ضرورت ہی کیا ہے؟ شاعری سی نازک دلنواز چیز کو ان غیر فطری بیڑیوں میں جکڑ دینا کوئی خوش مذاقی کی بات نہیں ہے۔ یہ سب باتیں ہمارے بڑے بوڑھوں کے لئے زیبا تھیں جنھیں "حُسن" کا صحیح احساس نہیں تھا وہ اگر "موزونیت" کو شعریت میں دلربائی پیدا کرنے کے لئے ضروری سمجھتے تھے اور نغمہ و ترنم کا حُسن اُن کے نزدیک یہی تھا کہ وہ توازن و تناسب اصوات کے مخصوص دائرے میں رہے تو ان کی ان بھولی بھالی باتوں کو "اگلے وقتوں کے" لوگوں کی باتیں کہہ کر ٹالا جا سکتا تھا مگر آج کل کے فرزانہ و پرکار ترقی پسند نوجوان شاعروں کے لئے یہ کیونکر جائز رکھا جا سکتا ہے کہ وہ شاعری کے مئے و نغمہ کا رنگ جمانے کے لئے وزن کے پیدا کئے ہوئے ترنم کے دریوزہ گر بنیں، دل کا اُبال، دماغ کا جوش، "وزن کی دیگچی" کا پابند نہیں کیا جا سکتا وہ جس طریقہ سے چاہے اُبلے، جوش مارے، فطرت کے روکنے کا حق تسلیم نہیں کیا جا سکتا ایک حقیقی شاعر کی گل افشانی گفتار میں کیف اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب وہ ان تصنعات و تکلفات سے آزاد ہو جائے۔

میراجی یقیناً اس معاملہ میں کسی قدر راہ راست پر ہیں، انھوں نے ارکان کے ساتھ تھوڑی سی آزادی برتی ہے، مگر وہ کافی نہیں، ضرورت ہے کہ ایک مصرعہ ایک صفحہ کا ہو تو دوسرا ایک لفظ کا اور پھر لطف تو جب ہے کہ ان میں پرانے ارکان کا کہیں عکس بھی نہ پڑے ذوق کو عادی ہونے دیجئے پھر اس میں نغموں کی بجلیاں پیشواز اٹھائے تھرکتی مٹکتی، ناچتی نظر آئیں گی اسی صورت میں شاعری صحیح معنوں میں "عوامی" بن سکے گی۔ اور سینٹ پرسینٹ ہندوستانی مزدور کسان ترقی پسند شاعر ہو جائے گا اور اس پر تنہا اجارہ مارکسی گرو بچوٹیوں یا پھر اُن سے

نقالوں کا نہیں رہ جائے گا اور یہی وہ جنت وہ فردوس ہے جس کی تخلیق کے لئے ہمارے کامریڈ بےچین ہو سکتے ہیں۔ یہ تو یقیناً قابل مبارکباد اقدام ہے کہ شعر سے قافیہ وغیرہ کی ادیری کھال کھینچ لی گئی مگر تنہا یہی کافی نہیں ہے، وزن کی باریک جھلی بھی اس سے الگ کر لی جائے، جس طرح "نالہ پابند نے نہیں ہے" اور جس طرح "فریاد کی کوئی لے نہیں ہے" اسی طرح اور بعینہ اسی طرح شاعری کے لئے وزن بھی نہیں ہے، وزن ہی وہ بلا ہے جس نے شاعری میں روائتی عناصر ہر طرف سے گھسیٹ لئے ہیں، مجھے یقین ہے کہ اگر وزن کو خیرباد کہہ دیا جائے تو پھر دوسرے تغیر آسانی سے ہو سکیں گے۔ بلبل کو دیس نکالا دیا ہی جا چکا ہے۔ ذرا سی توجہ میں زاغ و زغن وچند سے شعر کی بستی آباد ہو سکتی ہے، اسی طرح آسانی سے بہادر کی تمثیل کے لئے "شیر" کو ترک کیا جا سکتا اور اس کی جگہ خنزیر و خرس کو بٹھایا جا سکتا ہے یوں شعر کی تکنیک خوش اسلوبی سے بدل سکتی ہے اور اس میں روایتی عناصر کے بجائے وہ چیزیں داخل ہو سکتی ہیں جو زندگی کی حقیقتوں سے وابستہ ہیں۔ کیا امید کی جائے کہ موجودہ ترقی پسند نوجوان شاعر اس مخلصانہ مشورہ پر غور کریں گے۔

یہ سب کیونکر ہوا!

جولائی ۱۹۴۳ء کا ذکر ہے کہ میرے بہت ہی عزیز اور مخلص دوست مسٹر صباح الدین عمر ایم اے کے چھوٹے بھائی سخت علیل ہو کر میڈیکل کالج لکھنؤ کے یونیورسٹی اسٹوڈنٹ وارڈ میں داخل ہوئے۔ شام کو دفتر کا کام ختم کرنے کے بعد ہم اور صباح الدین دونوں میڈیکل کالج چلے جاتے اور وہاں رات کے دس گیارہ بج جاتے مختلف مسائل پر گفتگو رہتی۔ وارڈ کے ایک اور مریض کے پاس عصمت چغتائی کے افسانوں کا مجموعہ دیکھا عصمت کے کچھ افسانے میں نے پہلے بھی پڑھے تھے مگر جب صباح الدین نے ان کے افسانہ "لحاف" کا پلاٹ بتایا تو مجھے اس افسانہ کے پڑھنے کا اشتیاق اس قدر بڑھا کہ میں نے عصمت کا مجموعہ لے کر اس افسانہ کو وہیں پڑھا۔ لحاف کے اندر یہ چیزیں بھی ہو سکتی ہیں؟ یہ حقیقت مجھے عصمت کا افسانہ پڑھنے کے بعد ہی معلوم ہوئی اور اس وقت سے میں عصمت چغتائی کا بہت ممنون ہوں کہ انھوں نے یہ افسانہ لکھ کر نہ صرف میرے بلکہ کتنے مردوں اور عورتوں کے معلومات میں اضافہ کر دیا۔ اس افسانہ پر بحث ہونے لگی سوال یہ تھا کہ آخر عصمت صاحبہ نے "لذت النساء" یا "تصویر" یا "کوک شاستر" کیوں نہیں لکھا۔ صباح الدین خاموش بیٹھے تھے میں نے اُن سے پوچھا "آپ کی کیا رائے ہے"۔ بولے "کرشن چندر صاحب کا مقدمہ دیکھ لیجئے"۔

اس پر میں نے کتاب کا مقدمہ دیکھنا شروع کیا۔ کرشن چندر صاحب نے اس افسانہ کا "پس منظر" یہ بتایا ہے کہ اگر کسی جوان عورت کی شادی کسی بوڑھے سے ہو جاتی ہے تو وہ عورتوں ہی سے دل بہلانے لگتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس افسانہ میں وہ حقیقت کو ڈرامائی انداز میں جلوہ گر کرنا مقصود تھا تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی عورتوں کا

اپنی ہی صنف سے "دل بہلانا" کوئی عام اور قابل لحاظ حقیقت ہے؟ ایسے واقعے کو "الشاذ کل المعدوم" کی حیثیت تو حاصل نہیں ہے؟ کیا اس قابل استثنا واقعے کے مقابلہ میں یہ عام و ہمہ گیر حقیقت اور فطرت نہیں ہے کہ ایسی عورت کسی دوسرے مرد سے محبت کرنے لگے۔ کیا کرشن چندر صاحب اور عصمت چغتائی صاحبہ یہ بتا سکتی ہیں کہ انھیں اس قسم کی کتنی عورتوں کا تجربہ ہوا ہے جو کسی بوڑھے سے منسوب ہو جانیکے بعد "خالی سے بیگار بھلی" پر عمل کرنے لگتی ہیں۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ ایسی صورت میں عورت کسی دوسرے مرد کی طرف عموماً متوجہ ہو جاتی ہے تو اس غریب پر یہ الزام کیوں رکھدیا گیا کہ وہ اپنی بھانجی، بھتیجی اور خادمہ ہی پر کرم فرمائی کرنے لگتی ہے۔ اگر ترقی پسند حضرات کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ وہ زندگی کے حقائق کو منظر عام پر لاتے ہیں تو کیا وہ یہ بتا سکتے ہیں کہ ایسے حالات میں جبکہ کسی امر کے واقع ہونے کے جو عمومی امکانات ہوں انھیں نظر انداز کرکے وہ کسی ایسی بات پر کیوں زور دیتے ہیں جو "شاذ" ہوتی ہے اور جس پر زور دینے سے سوسائٹی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ بہرحال کرشن چندر کا نام آنے کے بعد ترقی پسند شعرا اور مصنفین پر بحث چھڑ گئی اور رفتہ رفتہ "آزاد شاعری" نے موضوع سخن کی حیثیت اختیار کرلی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو آزاد شاعری کے خصوصیات سمجھانے لگے۔ صباح الدین نے کہا چھوٹے بڑے غیر مربوط فقرے کئی صفحوں پر مصرعوں کی طرح لکھتے چلے جائیے جس میں "جنسی بھوک" بھی ہو "انقلاب" کا بھی تذکرہ ہو مزدور اور پیٹ کا بھی ذکر آجائے وہی آزاد شاعری ہے۔

"وار آف جنرل" ہم نے کہا یہ کیا۔ بولے ایک مصرعہ۔ ہم نے کہا دوسرا مصرع بولے "جس کا نمبر ایک ہے" ہم نے کہا تو؟ بولے "اس کا نظارہ ہے کتنا خوفناک" پھر بولے پانی پی لوں۔ پانی پی کر رومال سے منہ پونچھتے ہوئے بولے "ساتھ ہی دلکش بھی اور دلچسپ بھی" ہم نے کہا پانچواں مصرع۔ بولے میں آپ کی طرح شاعر تو ہوں نہیں.

اگر آپ پوری آزاد نظم ہی سننا چاہتے ہیں تو پانچ منٹ کی مہلت دیجئے۔ یہ کہہ کر جیب سے ایک سادہ کاغذ اور پنسل لے کر بیٹھ گئے۔ ہم لوگ کچھ اور باتیں کرنے لگے، پانچ سات منٹ بعد جب ہم پھر صباح الدین کی طرف مڑے تو ہم نے دیکھا کہ آپ ایک کاغذ کی لمبی چٹ لئے ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔ پوچھنے پر کہنے لگے نظم تیار ہے، یہ نظم آپ نے قلم برداشتہ نہیں بلکہ پنسل برداشتہ لکھی تھی۔ [''سک بلدانی'' کے نام سے مع کشاف (حبیب احمد قدوائی ایم، اے) کے ایک لاجواب تبصرہ کے لکھنؤ کے مشہور روزنامہ حقیقت میں شائع ہو چکی ہے]

وارڈ جنرل!

جس کا نمبر ایک ہے
اس کا نظارہ ہے کتنا خوفناک
ساتھ ہی رنگین اور دلچسپ بھی
اُف تری نرسوں کی

وہ
کالی اودی اور نیلی پیٹیاں
باندھتی ہیں جن سے وہ
اپنی کمر
کیسی کمر؟
پتلی کمر!
جیسے صراحی کا گلا
ہاں ہاں صراحی کا گلا

اور سینہ کا ابھار
گویا بہار اندر بہار
یعنی گلستاں در کنار
دے رہا ہے دعوتِ علم و عمل
بے عمل انساں کو!!

ایک کمرہ، مستطیل
عرض جس کا بیس فٹ
طول اس سے چوگنا
اُس کی دیواریں ہری
طوطیا اُن پر پھرا
بتیاں بجلی کی ہیں
چھت میں لگی

اور
پنکھے
چل رہے ہیں ہر طرف
تیس بستر اس میں ہیں
جس پہ لیٹے ہیں مریض
کالے، گورے، بوڑھے، بچے، نوجواں

سب ہیں گو اُس میں، مگر

وہ رونقِ بزمِ حیات
جس کے دم سے اس گلستانِ جہاں میں تازگی
جس کا وجود
باعثِ افزائشِ نسلِ جہاں
روح افزا کیف آور
جس کے دم سے
زندگی میں تازگی، تابندگی، لذت، سُرور
ہاں وہی بزمِ جہاں کی شمعِ نورانی
نظر آتی نہیں اس ہال میں

پھر بھی اُس کا کچھ بدل
نازنیں نرسوں سے ہو ہی جاتا ہے
کیسی نرسیں؟ کچھ نہ پوچھو
وہ کہ جن کا کام ہے
تیمار داری، دیکھ بھال
زخم پر پیار سے مرہم لگانا
اُن کا آنا اور جانا اِس طرف سے اُس طرف
جس طرح چلتی ہوں اُنگلی تار پر
طبلہ کا گویا زیر و بم
پاؤں کی آواز سے آتی کیا رنگین صدا!
کھٹ کھٹاک اور کھٹ کھٹاک

اونچی اونچی اور چھوٹی ہیل میں
کیا زندگی کا ساز ہے؟
ہاں ساز ہے!

ہونٹ پر سرخی ملے
سرخ!
سرخ بھی کیا رنگ ہے
یادگار انقلاب!
انقلاب لے انقلاب!!
وہ زمین رنگ و بو
جس پہ جنت ہے نثار
جو خوبیوں کی ہے ادا اور پرولیتیریت کی بزم گاہ
جس میں عورت اور مرد
دے رہے ہیں زندگی کا اک سبق
اپنے عمل اور فعل سے
جس میں یہ پابندیاں، مہمل، فضول
پائی نہیں جاتیں کہیں
لطف اٹھاتے ہیں جہاں
ہر مرد و زن باہم گر۔ ہر جگہ
ہوٹل ہو، گھر ہو، یا کہ پارک
عقد کا اور مہر کا جھگڑا جہاں ہوتا نہیں

ہائے اے نادان ملک
شرم کر ہندوستاں!
ماسکو سے کچھ تو سیکھ
تو بھی ان جھگڑوں کو چھوڑ
اور موقع دے کہ عورت اور مرد
اس دو روزہ زندگی میں
کچھ تو دادِ عیش دیں
مل سکیں ہر وقت، ہر دم، ہر گھڑی
ہر جگہ، ہر گھر میں، ہر سو، ہر طرف
کافی ہاؤس ہو کہ ہو وہ مے فروش
سرپرستی چوک کی ہر وقت کر کیونکہ آتی ہے نظر
مجھکو ترقی بس وہاں!

خبریں ختم ہو گئیں۔ دوسرے روز صباح الدین کو کچھ کتابیں خریدنا تھیں جب دفتر سے ساتھ چلے تو بولے کہ بھائی دانش محل ہوتے چلیں گے۔ ہم نے کہا بہت خوب۔ یہ کہکر ہم دونوں نے اپنی سائیکلوں کے ہنڈل امین آباد کی طرف موڑ دیئے۔ دانش محل لکھنؤ میں علاوہ ایک کتابوں کی دوکان کے بڑے بڑے ادبا کی ایک بیٹھک یا کلب کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں صبح اور شام دونوں وقت لکھنؤ کے بیشتر ادیب آکر علمی در ادبی گفتگو کرتے ہیں اور چونکہ حکیم اسرار احمد صاحب پروپرائٹر دانش محل اور اس کے منیجر مسٹر نسیم احمد کو اردو ادب سے بہت زیادہ لگاؤ ہے، اور وہ ہر ادیب سے غیر معمولی اخلاق سے پیش آتے ہیں اس لئے دانش محل ادبا اور شعراء کا ایک اچھا خاصہ مرکز

ہوگیا ہے۔ ہاں تو ہم دونوں امین آباد دانش محل پہونچے۔ وہاں افسر صاحب میرٹھی اور ڈاکٹر اعظم کریوی (جو حُسنِ اتفاق سے اسوقت لکھنؤ میں تھے) مل گئے۔ یہاں اسوقت ایک بحث چھڑی ہوئی تھی اور ایک ترقی پسند ادیب سے گفتگو ہو رہی تھی۔ موضوع آزاد شاعری اور ترقی پسندی تھا۔ میں نے صباح الدین کی ”ترقی پسند“ نظم مانگ کر سنائی۔ سُن کر ڈاکٹر صاحب اور افسر میرٹھی صاحب ہنسنے لگے۔ دو ایک دن بعد ہم لوگ پھر دانش محل میں جمع ہوئے اور صباح الدین نے دوسری نظم ”نٹنی“ سنائی (جو مجموعہ میں مخمور جالندھری کے رنگ کی طنزیہ نظموں کیساتھ درج ہے) ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی نے اس پر مزید نظموں کی فرمائش کی۔ صباح الدین بولے ”میں اپنی ”ترقی پسندی“ کے ثبوت میں یہ دو نظمیں کہہ چکا لیکن میں ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی مستقل طور سے ”ترقی پسند شاعر“ نہیں ہوں۔ فرقت صاحب شاعر ہیں گو ”رجعت پسند“ سہی پھر بھی میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ رجعت پسندی چھوڑ کر ترقی پسندانہ نظم کہنا شروع کریں اور آپ لوگوں کے قلوب اپنے ترقی پسند مواعظ حسنہ سے ”منور“ کیا کریں۔ اس فرمائش پر دوسرے روز میں نے دو نظمیں لکھیں اور ان کو دانش محل میں کئی ادبا کے سامنے پڑھا نیز میں نے سنجیدگی سے ترقی پسند شعراء کے کلام کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا۔ روزانہ دو تین ترقی پسند آزاد شاعرمالی نظمیں بھی کہنے لگا۔ میری ان نظموں کو میرے عزیز دوست سید اعظم حسین صاحب اعظم اڈیٹر روزنامہ سرفراز لکھنؤ نے بھی سنا اور اپنے اخبار میں جدید شاعری پر بحث کرتے ہوئے اصلاحی تحریک کے سلسلے میں میری پہلی نظم کو پیش کیا۔ بعد میں ان کی اور دوسرے دوستوں کی مسلسل فرمائش نے مجھے ان نظموں کا مجموعہ مرتب کرنے پر مجبور کر دیا۔ مجموعہ مرتب کرتے وقت مجھے یہ خیال بھی ہوا کہ ”ترقی پسند“ اور آزاد شاعری کے بارے میں اردو کے کچھ مشہور و ممتاز ادیبوں کی رائے بھی حاصل کرلوں۔ چنانچہ

ہیں ان حضرات سے خود ملا یا انھیں خط لکھے۔ میں ان کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری درخواست پر فوراً اپنے گرانمایہ خیالات قلم بند کر دیئے۔ ان کی یہ قیمتی اپیلیں اس مجموعے میں درج کی جا رہی ہیں۔ امید ہے کہ گم کردہ راہ نوجوان طبقہ ان سے صحیح رائے قائم کرنے میں مدد حاصل کرے گا۔

غرض یہ ہے اس مجموعہ کی "شان نزول" اور میں اس کے لئے ممنون ہوں ڈاکٹر اعظم کریوی سید اعظم حسین صاحب، افسر میرٹھی صاحب، حبیب احمد قدوائی صاحب نسیم احمد صاحب اور صباح الدین عمر کا جنھوں نے سب سے پہلے میری ہمت افزائی کی اور اس مجموعہ کو مرتب کرنے کی تحریک کی۔ میں مولانا سید اختر علی صاحب تلہری کا بھی خاص طور پر ممنون ہوں کہ موصوف نے بڑی سرگرمی سے میری قلمی امداد فرمائی۔ صباح الدین نے ترتیب دینے میں بھی میرا ہاتھ بٹایا اگر وہ کہتے ہیں کہ میرا شکریہ ادا نہ کرو۔

اسی کے ساتھ میں ڈاکٹر تاثیر، ن۔ م۔ راشد صاحب، فیض احمد فیض صاحب میراجی اور مخمور جالندھری صاحب کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے اپنی بعض نظموں سے مجھے اس حد تک "متاثر" کیا کہ میں اس رنگ میں اپنے خیالات کو پیش کر سکا۔

غلام احمد فرقت۔

مزاحیہ مضامین

"ترقی پسند" شاعر کی ڈائری کا ایک ورق

یکم جون۔ آج ۱۹۴۳ء کی منتخب نظمیں دیکھیں ان میں ایک نظم میری بھی شائع ہوئی ہے چوتھے صفحہ پر۔ آٹھ آنے ہوتے تو ایک کاپی ضرور خرید لیتا۔ درحقیقت یہ مجموعہ میرے ترقی پسند شاعر ہونے کی سند ہے مجھے ضرور خرید لینا چاہئے پہلی نظم میراجی کی ہے، دوسری ن م راشد کی۔ تیسری مخمور جالندھری کی اور چوتھی میری ہے۔ اس کے معنے یہ ہوئے کہ میں فیض احمد فیض۔ اور ڈاکٹر تاثیر سے بڑھ گیا۔ ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

واہ۔ ترقی پسند شاعر ہونا بھی کتنی بڑی سعادت ہے۔ آزاد شاعر ہونے سے پہلے میں کیا تھا؟ کچھ نہیں کس شمار و قطار میں تھا۔ لوگ مذاق اڑاتے تھے پھبتیاں کستے تھے یہ تھی میری عزت۔ پرانے ڈھنگ کی شاعری کمبخت بڑی ہی مشکل ہوتی ہے۔ عربی پڑھکر عروض پڑھئے بحروں کے نام یاد کیجئے پھر قافئے تلاش کیجئے۔ الفاظ ڈھونڈیئے اسکے بعد انھیں موزوں کیجئے تب کہیں جا کر ایک شعر ہو پھر اس کے بعد بھی یہ مصیبت کہ لوگوں کو پسند آئے یا نہ آئے۔ بھلا یہ بھی کوئی حماقت ہے۔ شاعری تو ایک تفریحی چیز ہے اتنے عرصہ اس حماقت میں مبتلا رہا۔ اگر شروع سے آزاد شاعری کرتا تو آج نہ جانے کہاں سے کہاں ہوتا۔ پھر اس ساری دماغ سوزی کے بدلے کیا؟ محض واہ واہ کوئی زیادہ مہربان ہوا چائے پلا دی۔ پان و سگریٹ سے تواضع کر دی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ بھلا اس جھنجھٹ میں کون پڑے کس کے پاس اتنا فضول وقت ہے جو

ضائع کرے۔ اور کس کو دماغ ہے جو ان تمام بندشوں کا اپنے کو پابند بنائے بجائے اللہ
ایسی شاعری اور ایسے شعر کہنے والے کو سات سلام۔ یہاں تو سستی شہرت کے ہمیشہ سے
طالب تھے اور یہیں منتخب نظموں میں آ گئے۔ مطلب حل ہو گیا۔ مراد پوری ہوئی۔ نہ دماغ
سوزی کرنا پڑی اور نہ قافیہ اور ردیف کی تلاش میں راتوں کی نیندیں حرام کرنا پڑیں
نہ آسمان و زمین ایک کرنا پڑے نہ دانتوں میں بار بار انگلی دبا کر سوچنے کی ضرورت
پیش آئی۔ نہ لکھ کر کاٹنا پڑا اور نہ کاٹ کر لکھنا پڑا۔ یہاں تو سیدھی سادھی سڑک مل گئی۔

یہ تو بس سیدھی سڑک ہی ایسی کچھ کھٹکا نہیں
کوئی شاعر آج تک اس راہ میں بھٹکا نہیں

مزے سے منہ اٹھائے چلے جا رہے ہیں۔ جو لکھ دیا شعر ہو گیا۔ جو کہہ دیا ادب۔ غرض
ایک مصیبت تھی ٹل گئی۔

رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گذشت

وہ ایڈیٹر جو آج مجھے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں ابھی تک میرے کلام کو مہمل سمجھ کر
ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے تھے مجھے کرسی دنیا شاق گذرتا تھا۔ آزاد شاعری نے
تو میری دنیا ہی بدل دی کتنی جلدی صف اول کے شعراء میں شمار ہونے لگا۔ آج مجھے
ایک چھڑی بھی خریدنا ہے۔ ٹوپی کے روپیہ جو رکھے ہیں۔ اب اس کی چھڑی خرید لونگا
اور اگر دام بچ گئے تو ایک سگریٹ کیس بھی لے لوں گا۔ ترقی پسند شعراء عموماً ٹوپی نہیں
دیا کرتے کتنے نادار ہوں مگر جیب میں سگریٹ کیس اور سگریٹ کیس میں سگریٹ خواہ
وہ بھری لے یا محبوب کیپٹن کا کوئی مال کیوں نہ ہو ضرور رکھتے ہیں۔ ٹوپی دقیانوسی غالب
جیسے شاعروں کا لباس تھا اسے ترقی پسندوں نے لباس سے خارج کر دیا اچھا کیا
سر جیسی چیز جس کو ہوا لگنے کی ضرورت ہے ایک کپڑے سے ڈھکنا کیا معنی؟ آزاد شاعری ک

میں بڑی خوبیاں ہیں اول تو طبیعت ہر وقت موزوں رہتی ہے۔ دوسرے چھوٹے بڑے مصرعے پر کوئی اعتراض نہیں تیسرے جس وقت قلم اٹھایا۔ کچھ نہ کچھ کہہ لیا۔ اب اسی نظم کو جو منتخب نظموں میں شائع ہوئی ہے دیکھ لیجئے۔ میں نے کتنی دیر میں کبھی دماغ پر کچھ بھی زور تو نہیں دینا پڑا۔ اسی روز آزاد شاعری شروع کی۔ خالی الذہن ہو کر چھوٹے بڑے بے ربط اور لایعنی فقرے ایسے الفاظ میں جو کانوں کو اچھے معلوم ہوئے لکھکر رسالہ میں بھیج دیئے خیال تھا کہ کون شائع کرے گا۔ فضول لفافہ برباد ہو رہا ہے مگر اُسے "ادب برائے زندگی" میں جگہ ملی۔ ایک رسالہ نے شائع کی کئی رسالوں نے فخریہ نقل کی اس روز سے میراجی ن۔م راشد اور دیگر ترقی پسند شعرا کی شاعری کا گر معلوم ہو گیا۔ چنانچہ اس تین ماہ کے عرصہ میں چوتھے نمبر پر ہوں۔ اگر اسی طرح کہتا رہا تو یو۔پی کا نمبر ۱ شمار ہونے لگوں گا۔ مگر ابھی میراجی اور ن۔م راشد والی بات نہیں پیدا کر سکا ہوں میرے قلم سے بیشتر با معنی فقرے نکل جاتے ہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ میراجی اور ن۔م راشد کو غالباً مجھ پر اسی سے فوقیت ہے۔ ان کے یہاں ایک فقرے کو دوسرے فقرے سے کوئی دور کا لگاؤ نہیں ہوتا۔ فیض احمد فیض اور ڈاکٹر تاثیر کو اسی چیز نے مارا۔ وہ زیادہ تر دقیانوسی شعر کہنے لگتے ہیں جس سے انکے کلام میں غیر ترقی پسندی کی بو آنے لگتی ہے میراجی اور ن۔م راشد کو نیچا دکھانے کے لئے ان دونوں کے کلام کا کافی مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ مخمور جالندھری کی مقبولیت کا گر میں جان گیا۔ اگر میں بھی عورت کے اعضاء رئیسہ کی تعریف ایسے الفاظ میں کرنے لگوں جو کانوں کو اچھے معلوم ہوں اور بے ربط فقروں میں ان الفاظ کو اس طرح پیش کروں کہ چیز نظروں میں کھپ جائے تو مخمور سے بڑھ سکتا ہوں۔ لیجئے خود بخود ایک مصرعہ دماغ میں آیا جا رہا ہے اچھا ڈائری ترک کر دوں اور اس مصرعہ کو لکھ لوں کہیں دماغ سے اتر نہ جائے بالکل مخمور کے رنگ میں ہے "کیا تری ساری کا آنچل

اور ہٹ سکتا نہیں"۔ لیجیے مصرعہ لکھتے ہی جذبات کا ایک سیلاب امنڈا آرہا ہے۔ ایسے میں کیا کروں ٹھہرو ٹھہرو۔ اللہ مجھے دوات میں روشنائی تو ڈال لینے دو۔ اچھا نہ ڈالوں گا۔ نظم مکمل کر لوں۔

پہلا مصرعہ۔ کیا تری ساری کا آنچل اور ہٹ سکتا نہیں
دوسرا ،، ۔ اور ترے سینہ کا وہ رنگیں ابھار
تیسرا ،، ۔ سامنے میرے نکھر سکتا نہیں
چوتھا ،، ۔ دے رہا ہے دیر سے جو
پانچواں ،، ۔ شوخیوں کی دعوتیں
چھٹا ،، ۔ اک ذرا اپنی نگاہِ گرم سے
ساتواں ،، ۔ بلب آسا نور سے ٹکڑوں کو تم
آٹھواں ،، ۔ اس طرح جھنجلا کے جنبش دو ذرا
نواں ،، ۔ جس طرح ہوں سیب پتوں میں چھپے
دسواں ،، ۔ اور ہوا کا تیز جھونکا زور سے
گیارھواں ،، ۔ آکے ڈالی کے قریب
بارھواں ،، ۔ زور سے دیوے ہلا
تیرھواں ،، ۔ اور مجھ سے یوں بگڑ کر تم کھنچو
چودھواں ،، ۔ جس طرح نیچے جھکا کر کوئی ڈال
پندرھواں ،، ۔ دفعتاً ہاتھوں سے اپنے چھوڑ دیں۔

لیجیے نظم مکمل ہو گئی۔

ترقی پسند خواتین کا ایک مشاعرہ

ترقی پسند شعراء جو اس مشاعرہ میں اپنا کلام پڑھیں گی

(۱) مس نیرا بانی	(۴) این۔ ایم۔ واحدہ
(۲) ڈاکٹر مس دلگیر بانو	(۵) مس ظفر بانو
(۳) مس فیض بانو	(۶) مس میخوار جالندھری

مشاعرہ ایک پنڈال میں ہو رہا ہے، سامعین میں کافی تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ عورتیں اور لڑکیاں شریک ہیں شعراء میں ہندوستان کی چھ چوٹی کی مذکورۂ بالا ترقی پسند شاعرہ شریک ہیں۔ ڈائس پر میز کے گرد سات کوچ ڈال دیئے گئے ہیں جو ان ترقی پسند خواتین کے لئے مخصوص ہیں۔

شامیانہ میں سُرخ کپڑے پر سُنہرے کاغذ کے کٹے ہوئے انگریزی حرفوں میں لینن اور سٹیلن کے اقوال جگہ جگہ لگے ہیں میز پر سگمنڈ فرائیڈ اور عذرا پاونڈ کے چھوٹے چھوٹے مجسمے رکھے ہیں۔ ڈائس سے اتر کر نیچے شامیانے میں چاندنی کا فرش ہے جس پر عورتوں کی کثرت سے کہیں تل رکھنے کی جگہ نہیں بعض عورتیں اپنے بچوں کو بھی لائی ہیں جن میں دو ایک رو بھی رہے ہیں۔ مشاعرہ کا وقت آگیا۔ شاید براڈ کاسٹ بھی ہونے والا ہے کیونکہ پنڈال کے باہر ایک طرف آل انڈیا ریڈیو والے بھی ٹہلتے دکھائی پڑ رہے ہیں۔ لیجئے آٹھ بج گئے۔ چھ "ترقی پسند" خواتین پنڈال میں ڈائس کے قریب ایک راستہ سے داخل ہوئیں۔

خواتین شعراء کی وضع قطع بھی ملاحظہ فرماتے چلئے۔ رنگ برنگی فراکیں۔ بال ترشے ہوئے۔

لبوں پر لپ اسٹک کی گہری پالش۔ منھ پر پاؤڈر۔ رخساروں پر غازہ لمبی اور بھدی انگلیوں پر بڑے بڑے ناخون جن پر کیوٹکس کی صیقل۔

جلسہ کی سکریٹری ڈاکٹر مفید جہاں سفید سلک کی ساری پہنے قریب کی کرسی پر بیٹھی ہیں۔ ڈائس پر خواتین کے قدم رکھتے ہی ڈاکٹر مفید جہاں اور مس حسین آف لکھنؤ یونیورسٹی استقبال کے لئے بڑھیں۔ سکریٹری نے خوش آمدید میں آہستہ سے تالیاں بجائیں جس کے بعد سارا پنڈال دوسری خواتین کی تالیوں کی آواز سے گونج گیا پہلے ڈاکٹر مفید جہاں نے مختصر الفاظ میں خواتین شعراء کا سامعین سے نام بنام تعارف کراتے ہوئے اور ان کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"بہنو" آج ہم اپنے ملک کی ان چھ مایہ ناز ترقی پسند خواتین سے آپ کا تعارف کراتے ہیں جنھوں نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے ہمارے شہر اور ہمارے مشاعرہ کو زینت بخشی ہے۔ ہمارا ادب اور ہمارا سماج آپ ہی کی اصلاحوں کا مرہون منت ہے۔

گیٹ سے ایک آواز سواری اتروا لیجئے۔

سکریٹری مشاعرہ (انگریزی میں what is this) یہ کیا ہے؟

عورتوں میں اس پر کھسر پھسر شروع ہو جاتی ہے۔

سکریٹری "ہاں تو میں آپ سے عرض کر رہی تھی کہ ہماری شاعری میں ہماری ان مہمان خواتین کے کلام نے ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ سماج میں ایک تازہ روح پھونک دی ہے اور ہمارے سامنے ایسے جدید رجحانات پیش کئے ہیں جن پر بھرپور غور کر کے عمل کرنے کی ضرورت ہے جنسیات کی گہرائیوں کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد ان لوگوں نے ہمارے سامنے زندگی کے ایسے مفید اور کارآمد مسائل پیش کئے ہیں جن پر چل کر ہم مردوں کے دوش بدوش زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کر سکتے ہیں پھر اپنے لطیف جذبات اور خیالات جس اچھوتے انداز میں پیش کئے ہیں وہ حقیقتاً ہمارے

ادب کی جان ہے۔

ایک آواز۔ ارے کمبخت ہٹ کب سے چوس رہا ہے۔ ساری جان نچوڑے لیتا ہے (اس کے بعد ایک شیر خوار بچہ کے رونے کی آواز سے ایک بے لطفی سی پیدا ہو جاتی ہے)

ڈائس سے کئی آوازیں "بچے کو چپ کراؤ۔ پنڈال کے باہر لے جاؤ۔ بچہ والیوں کو کس نے آنے دیا۔؟

ایک دھیمی سی آواز جس نے تم ساﻧﮉنیوں کو آنے دیا۔

بچے والی عورت۔ اے واہ اچھی زیادتی ہے۔ نگوڑا ایسا مشاعرہ چولھے بھاڑ میں گیا جس میں بچے والیوں کو ممانعت ہو۔ بچہ جب قابو میں ہو۔ تب ہی تو چپ کراؤں (بچہ گود میں مچل جاتا ہے) ارے چپ چپ چپ۔ بچہ کی ننگی پیٹھ پر کئی تابڑ توڑ ہاتھ پڑنے کی آواز سنائی پڑتی ہے۔

کئی آوازیں ایک ساتھ "اے تم بچے کو یہاں لائی ہی کیوں؟"

دوسری آواز۔ ایسی ماں پر حضرت بی بی کی جھاڑو۔ جو کمبخت شیر خوار کو ایسی بے دردی سے مارے کہ غیروں کے دل کو چوٹ لگے۔

تیسری آواز۔ اچھا کیا۔ جب بچہ نہ مانے تو یہی کرے۔ نگوڑے مردوئے پیدا کر دا کے چھوڑ دیں۔ اور خود الگ ہو جائیں۔ مائیں بدنصیبیں دنیا کی کسی دلچسپی میں شریک نہ ہو سکیں۔ نگوڑی اولاد جان کا جنجال۔ غرض ہر طرف سے چاؤں چاؤں شروع ہو جاتی ہے۔

ڈائس سے (ایک آواز) آپ لوگ چاؤں چاؤں بند کریں اور جو خواتین اپنے ہمراہ بچے لائی ہوں براہِ کرم وہ یا تو اپنے بچوں کو گھر بھجوا دیں یا براہ عنایت ان کو لے کر پنڈال کے باہر چلی جائیں۔ تاکہ دوسری خواتین کے سننے میں حرج نہ

واقع ہو ٹکٹ کی پشت پر پہلے ہی سے لکھ دیا گیا تھا کہ بچوں کو لانے کی ممانعت ہے۔ اس اعلان کے بعد کئی عورتیں بچہ دبائے گیٹ کی طرف جھنجھناتی ہوئی جاتی دکھائی دیں۔

"واہ بھئی واہ۔ کیا زبردستی ہے۔ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کرتی ہے بچہ ایک کا رو دیا الزام سب بچوں پر پھر سب بچے والیوں کو پنڈال چھوڑنے کا نادر شاہی حکم۔ پنڈال جیسے انھی نگوڑیوں ہی کا تو ہے۔

(قریب کی ایک عورت جو بے بچہ کے تھی) ——— ٹکٹ کی پشت پر پہلے سے پڑھ نہیں لیا۔ (چپکے سے) مری جاتی ہیں مشاعرہ سننے کے لئے۔

(دوسری عورت ترش ہو کر) واہ بہن واہ۔ تم بھی انھی کی ایسی گانے لگیں صاحب ٹکٹ بھی لیں اور جھڑکیاں بھی سنیں۔ ایک آدھ بچہ بھی نہ لانے پائیں مجھے تو ان نگوڑیوں پر ہنسی آتی ہے جو ڈائس پر بیٹھی غرا رہی ہیں کوئی چڑیا کا بچہ پیدا کیا ہوتا تو اس کی قدر جانتیں مردوں کے کولہے سے کولہا جوڑے بیٹھنا جانیں بچوں کی ماں کیا جانیں نگوڑی بانجھیں ہیں بانجھیں۔

سکریٹری۔ خاموش خاموش اب مشاعرہ شروع ہوتا ہے۔

سب سے پہلے ہمارے ملک کی مایۂ ناز شاعرہ نیر آپائی جو باہر سے تشریف لائی ہیں، آپ کو اپنا کلام سنائیں گی، مگر قبل اس کے کہ ہماری بہن اپنا کلام سنائیں میں آپ بہنوں سے بتا دینا چاہتی ہوں کہ آپ پنجاب کے مشہور ترقی پسند شاعر میراجی کے کلام سے متاثر ہیں۔ چنانچہ اسی رنگ میں آپ کہتی ہیں۔ حال میں جو آپ نے تازہ نظم "بیٹھک" کہی ہے وہ آپ کے سامنے پیش کرتی ہیں۔

نیر آپائی۔ عرض کرتی ہوں۔

جوش چھایا ہوا جوانی کا
میرے رخسار کے غزالوں پر

بادۂ آتشیں کے یہ ساغر
میری دوشیزگی کے شاہد ہیں
اور مری مست مست نظروں پر
صدہا نوجوانیاں صدقے
دھیمے دھیمے سنبھل سنبھل کے بڑھو
اس جوانی کے دھندلکے میں کہیں
دل جلے ہونٹ پا نہ لیں مجکو
اور وہ کپ کاتشنہ و بے تاب
نہ کہیں میرے کھینچ لے رخسار
اور پھر روشنی میں آنے پر
اس طرح بھاگ جائے نظروں سے
جیسے بدنفس مولوی کا ضمیر
اپنی ڈاڑھی کی آڑ میں چھپ کر
چپکے چپکے گناہ کر ڈالے
اور کسی پر عیاں نہ ہو پائے
جوش چھایا ہوا جوانی کا

تمام عورتیں دنگ ہو کر رہ جاتی ہیں
ایک آواز۔ یہ شعر آپ نے نثر میں کہے ہیں یا نظم میں؟
ڈائس سے کئی آوازیں۔ خاموش خاموش۔
سکریٹری۔ اب آپ کے سامنے ڈاکٹر مس دلگیر جہاں صاحبہ اپنی نظم پیش کریں گی جس کا عنوان ہے۔ دوشیزوں کی قربانی"

ڈاکٹر مس دلگیر جہاں صاحبہ۔

ڈاکٹر مس دلگیر جہاں۔ (سکریٹری صاحبہ سے) براہ کرم پنکھے کا رخ ذرا ادھر موڑ دیجئے۔ گرمی بہت پڑ رہی ہے (یہ کہتے ہوئے فراک کے اُوپری بٹن کھول کر مجمع سے) عرض کرتی ہوں۔

کیوں ابھاروگے انھیں آہ یہ مٹ جائیں گے۔

اتنا ہی اونچا انھیں رہنے دو

یہ مسافر ہیں چلے جائیں گے۔

ہیں جوانی کے نقیب

احترام ان کا کرو

روٹھ جانے پہ یہ واپس نہ کبھی آئیں گے

کیوں ابھاروگے انھیں آہ پچک جائیں گے

عمر میں آہ فقط ایک دفعہ

قبل پکنے ہی کے آنکھوں کو بھلے لگتے ہیں

ان کو ہاتھوں سے نہ چھو

بار بار ہاتھ لگانے سے یہ ڈھل جائیں گے

اور پچک جائیں گے۔

کیوں ابھاروگے انھیں آہ یہ مٹ جائیں گے؟

ایک آواز۔ اس نظم کا عنوان ذرا پھر سے فرما دیجئے۔

سکریٹری۔ اس کا عنوان ہے "سیبوں کی قربانی"! شامیانہ کے باہر سے

ایک مردانی آواز۔ یہ عنوان تو کچھ زیادہ مناسب نہیں ہے۔

اس پر تمام عورتوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو جاتی ہیں۔

ایک عورت۔ اے کمبخت مردانہ تک آوازیں جا رہی ہیں۔ دیکھو تو کسی نگوڑے نے کیسی چوٹ کی۔

دوسری عورت۔ اے جب سیبوں نگوڑوں کی تعریفیں اپنے آپ کرو گی تو مردوئے کہاں کے گئے گزرے ہوئے جو داد نہ دیں گے۔ اے پہلے ان غیرت والیوں سے کہو۔ جو ترقی پسند بنکر آئی ہیں نگوڑی فراک کے بٹن کھول کر سیبوں کی تعریف۔

سکریٹری۔ خاموش خاموش اب آپ کے سامنے مس فیض بانو اپنی نظم سنائیں گی۔

مس فیض بانو۔ اس نظم کا عنوان ہے "خوشبوئیں" ملاحظہ ہو۔

رسیلے تبسم کی نمکین خوشبو
مرے دل میں پیہم چلی آرہی ہے
رسیلے تبسم کی نمکین خوشبو
کہیں اور کھینچے لئے جا رہی ہے!
وطن سے بہت دور لئے جا رہی ہے
جوان اب جنوں ہے
بہاریں ترے باغ میں سو رہی ہیں!
پسند اب مجھے ہے تیرا قد موزوں
نگاہوں کی تیلی میں ہے سخت اینٹھن
ہرن کی ہے اک کھال دوشِ حسیں پر؟
رسیلے تبسم کی نمکین خوشبو
اندھیرے مکاں میں لئے جا رہی ہے
سماج اپنے بندھن کو خود توڑتا ہے۔

ہزاروں سے رشتے مرے جوڑتا ہے
حسین اور تنومند مردوں کا افسوں
مرے دل کو بہلا رہا ہے
یہ میری فراک اور اس میں ہے لرزش
یہ غازہ ـــــ لپ اسٹک
یہ چودہ صدی کی دوشیزہ جو اب بھی جا رہی ہے
کسی کی بغل میں چھپی جا رہی ہے
نگاہوں میں سب کے کھبی جا رہی ہے
رسیلے تبسم کی نمکین خوشبو

نظم کے ختم پر پھر عورتوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو جاتی ہیں اور بڑے پائینچے والی "قدامت پرست" عورتیں ڈائس کی طرف دیکھ دیکھ کر دانت پیس رہی ہیں مگر اسکول اور کالج کی لڑکیاں ہر ہر مصرع کی داد پورے جوش و خروش کے ساتھ دے رہی ہیں اور ہر نظم کے ختم ہونے پر واہ۔ واہ ـــــ سبحان اللہ (Good Excellent) کی آوازیں ان۔ اے کالج۔ اور ال، بی گرلس اسکول کی لڑکیوں کی صفوں سے آ رہی ہیں۔

سکریٹری۔ اب مس این۔ ایم۔ واحدہ آپ کے سامنے اپنا کلام پیش کریں گی۔ آپ لوگ خاموشی کے ساتھ سنئے اور سنجیدگی سے داد دیجئے آپ حضرت ن م راشد کے کلام سے متاثر ہو کر نظمیں لکھتی ہیں اور پڑھتی بھی تقریباً اسی انداز میں ہیں۔ اس نظم کا عنوان ہے "اندیشہ"

این۔ ایم۔ واحدہ۔ عرض کرتی ہیں۔

آ، مری جان کبھی شب کو سہری کے قریب

محملِ خواب پہ جذبات مرے لوٹتے ہیں
لاکھ چہرہ مرا بے نور سہی
چشم و ابرو میں ہیں لنگور سہی
تیری رس دار جوانی سے بہت دور سہی
پھر بھی میں رات کے سناٹے میں ہو آتی ہوں
جاگتے میں نہ سہی خواب کی دنیا میں سہی
تجھ سے جب کھیلتی ہوں دیر تلک کھیلتی ہوں
آ مری جان کبھی شب کو مسہری کے قریب
میرے مینار پہ آ
اپنے رہوار پہ آ
تیری برسوں کی تمنا کی ہوں میں حرفِ خموش
رات بھر یوں ہی پڑی رہتی ہوں
کھول دے دستِ جنوں سازسے جمپر کے بٹن
سیم گوں ہاتھوں سے ہاں لمس فقط ایک ہی لمس
اپنی بے کیف جوانی کی قسم
عید بقر عید تو آ جا مرے کاشانہ میں
منتظر ہوں کہ مجھے چھیڑ کے دیکھے تو کوئی
کیسی کیسی ہوں کھیلتی ہوں
دیوتا دیکھ محبت کے چھپے بیٹھے ہیں
دعوتیں دیتے ہیں اٹھ اٹھ کے تری نظروں کو
خیر کیا یوں ہی گذر جائے گی

اور جوانی یہ بڑھاپے میں بدل جائے گی
آ، مری جان کبھی شب کو مسہری کے قریب

باہر سے ایک آواز۔ بہت خوب آج خاکسار حاضر ہو گا۔

عورتوں میں سے ایک۔ (سکریٹری صاحبہ سے) میں دست بستہ گذارش کروں گی کہ آپ شامیانہ کے قریب سے مردوں کو ہٹوا دیں۔ کیونکہ برابر باہر سے فقرے بازیاں ہو رہی ہیں۔

قریب سے ایک عورت۔ (چپکے سے) لے بڑی زبردستی ہے رشب کو مسہری کے قریب ان کو آنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ پھر اگر وہ دعوت قبول کریں تو ان پہ دانت پیسے جائیں۔ لے پہلے دعوت دینے والی کو کہا ہوتا جو بڑی ترقی پسند کی بچی بنی ہیں۔ اس کے بعد مردوں کو کہا ہوتا۔ مردوں نگوڑ ماروں کی ذات تو بے حیا ہوتی ہی ہے۔

سکریٹری۔ اچھا آپ گھبرائیں نہیں۔ مرد ہٹوا دئے جائیں گے۔ مگر آپ لوگ خاموش رہیں۔

مس حسین باہر جا کر واپس آتی ہیں اور اعلان کرتی ہیں کہ اب آپ بالکل اطمینان سے مشاعرہ سنیں سب مردوں کو ہٹا دیا گیا ہے۔

ایک عورت۔ (دوسری عورت سے مخاطب ہو کر) لے تم کیا ہٹاؤ گی تمہارا تو بس نہیں کہ ان کو اور بغل میں بٹھا لو۔

سکریٹری۔ اچھا اب آپ لوگ خاموش رہیں مس ظفر بانو اپنا کلام آپ کے سامنے پیش کریں گی۔

آپ کا رنگ بہت کچھ میراجی سے ملتا جلتا ہے بلکہ اکثر اشعار اپنی معنویت کے اعتبار سے میراجی سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔

مس ظفر بانو۔ اس نظم کا عنوان ہے "یاد" عرض کیا ہے۔

دیر سے لیٹی ہوں آغوشِ چمن کے دلِ رنگیں کے قریب
ایک سایہ کی طرح جو کہ ہے تنزیب کے مانند سفید
ہے وہی میرا رقیب
مجھکو لگتا ہے عجیب
اک قلمدان کے کاندھوں پہ ہیں دو شیشے کی رنگین دواتیں بیٹھی
جن کے اندر رہے ہرے رنگ کی دبلی سی سیاہی لیٹی
جو محبت میں گھلی جاتی ہے
اور اک ننھی سی نب
جس کی باریک لکھائی کا گلہ ہے سب کو
جس پہ چلتے ہیں مرے سوز کے گھبرائے سے حرف
اور تکرار میں لڑتے ہی چلے جاتے ہیں
ایک بے خوابی کا خواب
کیا یہاں کوئی نہ تھا
ہے چھپائے ہوئے سینہ میں حیا کے موتی
گھٹن کے لہروں نے سمندر سے نکالا جو حسیں چہرہ کو
ایک تلخابہ کسی بادۂ بے رنگ کا اس پر ٹوٹا
اور کھڑکی اس نے لگا دی تو تھا دریا اُس پار
تشنگی کے گزرتے ہوئے سناٹے میں
رات کو گھبراتی ہے
آہ بے کیف سحری کی نوا اثر

"رات بھر یہ ہی لیلیٰ ٹپ رہتی ہے یوں"
تیرگی میں ہوں ستارے جس طرح پر رس بھرے
اور کبھی بھولا ہوا انجم اگر آئے تو شعلہ سا اٹھے
جیسے سُلفے سے دھواں
یا وزن میں تان کے لپٹی ہوئی
جذب کر لیتا ہے جب اس کو خلا کا دامن
یا دکر اٹھتی ہوں تنہائی میں
تیرے آنسو جو ہیں شعلے شکر کے
تو کہ بھرے ہاتھ کے کاندھوں پہ سوار
بھول کر تیرگی روح کو میں آ پہونچا
دوش پر پھول لئے رات کی بے کیفی سے
آہ ساری کو مری مت کھینچو
(درد دل بھی کیا کوئی معشوق ہے)
اس کے وہ نغمۂ رنگیں بکھر جائیں گے
جس میں ہیں سیکڑوں آنکھوں کے چھلکتے ہوئے زندہ موتی
(یاں کل کے لئے بناتے جائیں)
کچھ حکایات عجیب
میرے روزن کے قریب
(یادداشتیں مجھیں دلاتے جائیں)

دور سے ایک مردانی آواز آتی ہے:—
"چلے جائیے اب دونوں وقت ملتے ہیں"

عورتوں میں پھر کانا پھوسی ہونے لگتی ہے

ایک عورت۔ نگوڑوں کو بکنے دو بکتے بکتے آپ ہی تھک جائیں گے۔

دوسری عورت۔ لے تجھاڑ و پھرے ان ترقی پسند نگوڑیوں پر جو بات بات پر روزن روزن لگائے ہوئے ہیں۔

لے اسکول میں کیا یہی سکھایا جاتا ہے۔ واہ کیا ترقی پسندی ہے۔ اے ایسی ہی ہیں تو کسی کے ساتھ نکل بھاگیں روکتا کون ہے۔

سکریٹری صاحبہ۔ اب آپ کے سامنے مس مخمور بانو صاحبہ حضرت مخمور جالندھری کے مخصوص رنگ میں اپنا رنگین کلام پیش کریں گی۔ امید ہے کہ آپ اس سے محظوظ ہوں گی۔

مس مخمور بانو۔ عرض کرتی ہوں۔ اس نظم کا عنوان ہے "بھوک"۔

بھوک کا شاہکار
پیٹ پر سوار ہے
ہر ایک چیز ہے گراں
گراں۔ گراں۔ بہت گراں
اسی خیال و فکر میں
جہان ہے رواں دواں
دواں۔ رواں
رواں۔ دواں
ہے انقلاب ہر طرف
اِدھر بھی ہے اُدھر بھی ہے
مگر ابھی تلک نہیں

خبر نہیں کدھر یہ ہے
ادھر ہیں پردہ داریاں
اُدھر ہیں پردہ داریاں
ستم ستم
غضب غضب
فضول ہیں اصول سب
یہ سب اصول توڑ دو
ہمیں ہمیں یہ چھوڑ دو
یہ کوئی عدل عدل ہے
کہ اک طرف تو مرد کو
ملیں ہزاروں عورتیں
ادھر ہمارے قلب پر سماج کا ہو کنٹرول
اور کنٹرول ریٹ پر
بہت ملے تو ایک مرد
ہے یہ بھی کوئی دل لگی
کہ یاں تو آگ ہے لگی
ہزار ارنیاں ادھر
اُدھر سے لن ترانیاں
سماج کیا ہے جھول ہے
ٹھٹھول ہے ٹھٹھول ہے
لگا دو بڑھ کے اس میں آگ

ہر ایک چیز ہے گراں
بھوک کا شاہکار

ایک خاتون جو کسی بڑے گھر کی شریف خاندان معلوم ہوتی ہیں "معاف کیجئے یہ بھوک آپ کو مبارک رہے۔ یہی آپ لوگوں کی تہذیب ہے۔ یہ آپ ترقی پسندی کا درس دینے آئی ہیں۔ یا ہماری لڑکیوں کے اخلاق و آداب تباہ کرنے تشریف لائی ہیں سبحان اللہ سبحان اللہ"

سکریٹری۔ آپ خاموش رہیں۔ آپ کو کوئی حق نہیں کہ اس طرح مشاعرہ تباہ کریں۔

بہت سی آوازیں نہیں ہم ایسی ترقی نہیں چاہتے نہیں چاہتے نہیں چاہتے بہت سی آوازیں۔ ان نگوڑی فرنگن زدوں کو نکالو یہ سب ہم لوگوں کا اخلاق تباہ کرنے آئی ہیں۔ ایک ہنگامہ ایک شور مچنے لگتا ہے بہت سی عورتیں ٹوٹ کر حملہ کر دیتی ہیں۔ اسی ہنگامہ میں کئی یونیورسٹی کے لڑکے اندر گھس آتے ہیں اور ساتوں "شاعراؤں" کو اپنی اپنی گود میں لے کر عورتوں کو چیرتے پھاڑتے پٹتے پٹاتے بھاگ نکلتے ہیں!!

آزاد شاعری

بعض ترقی پسند شعراء کے ادب نرالے ہوتے ہیں ایسے "ادب برائے زندگی" والے شعر تو آپ نے بارہا سُنے اور پڑھے ہی ہوں گے مگر جب جنسیات سے متاثر ہو کر یہ حضرات شعر کہتے ہیں تو ان میں ایک خاص "کیف اور ندرت" ہوتی ہے۔ سب سے پہلے جناب ن م راشد کی اُس نظم کے دو ٹکڑوں سے لطف اندوز ہو جئے جس کا عنوان ہے "انتقام" ارشاد ہوتا ہے۔

اُس کا چہرہ اُس کے خد و خال یاد آتے ہیں
اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم
میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جس سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام
وہ برہنہ جسم اب تک یاد ہے

شاعر فرائڈ سے متاثر ہے۔ لاشعور میں جو واقعات اور احساسات پناہ لیتے ہیں وہ برابر نکلنے کی راہ تلاش کیا کرتے ہیں۔ شاعر جب یہ نظم لکھنے بیٹھا تو شاید اُسے اپنے عنفوانِ شباب کا کوئی واقعہ یاد آ گیا اور یہ واقعہ اس کے لاشعور سے نکل کر اس کی زبان قلم تک پہونچ کر نظم ہو گیا۔

نظم کے مصرعوں کے جوڑنے سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ شاعر اپنے مکان کے دروازے پر کھڑا ہر حسن رہگزر سے پر مسمریزم کی مشق کر رہا ہے، ایک اجنبی عورت ادھر سے گذر رہی ہے یہ ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام لینے والے

جوش سے دیوانہ ہوکر اُسے چھاپ بیٹھتا ہے۔ عورت کا جسم شاعر کو بہت لطیف
اور گداز معلوم ہوتا ہے اس لئے اس کے خدوخال پر نظر ڈالے بغیر وہ اس کے
جسم سے انتقام لینے لگتا ہے۔ اور چونکہ اس کا برہنہ جسم اس کو بہت مرغوب ہے
اس لئے اب تک زبان پر اسی کے چٹخارے ہیں اور وہ برہنہ جسم اسے اب تک یاد ہے۔
اسی شاعر کی ایک دوسری نظم "خودکشی" جو آپ اپنی نظیر ہے وہ بھی
بڑی دلچسپ اور "بلند پایہ" ہے پہلے مصرع کے بعد دوسرے اور تیسرے مصرع
میں ارشاد ہوتا ہے۔

شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوک زباں سے ناتواں

یہ تو گویا عصر و مغرب کے درمیان شاعر کا روزمرہ کا معمول تھا کہ عورت
کو ننگا کرنا اور اس کا تمام جسم نوک زبان سے چاٹ کر ناتواں بنانا۔ اب دوسرے
بند میں رات کی مصروفیتیں ملاحظہ ہوں۔

ایک عشوہ ساز و ہرزہ کار محبوبہ کے پاس
اُس کے تختِ خواب کے نیچے مگر
آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو
تازہ درخشاں لہو،
بوئے مے میں بوئے خوں الجھی ہوئی

عشوہ ساز اور ہرزہ کار محبوبہ کے پاس نئے مطلب یہ کہ اس کے حریم ناز
میں اس کے تختِ خواب ناز کے نیچے جہاں شاید کسی میلے چیتھڑے میں اس کا تازہ اور
درخشاں لہو تھا شاعر پہونچ جاتا ہے بہرحال محبوب کی بغل میں نہ سہی اُسکے تخت کے نیچے سہی

عاشق کو جو سہ بھر زمین مل ہی گئی وہ بھی مہینہ کی خاص خاص تاریخوں میں ورنہ
ہزاروں ناکام و نامراد عاشق تو اس سعادت سے بھی محروم رہ جاتے ہیں کیونکہ
محبوبہ کی گلی کے لاگو کتے ان کی جھلک پاتے ہی ان بد نصیبوں کو گھر تک رپٹا
مارتے ہیں اور عاشق حسرت دید میں ساری زندگی گذار دیتا ہے "ترقی پسند شاعر"
نے کم از کم اتنی ترقی تو کی کہ محبوب کے تازہ اور درخشاں لہو کی بو سونگھتے سونگھتے
اس کے تخت کے نیچے پہونچکر دبک رہا۔ غالباً یہی وہ ہمت مردانہ ہے جو ترقی پسند
شاعر اور شعراء متقدمین میں امتیاز پیدا کرتی ہے۔ بہر حال اس اعتبار سے
شاعر اور شاعر کی نظم دونوں بھرپور کامیاب ہیں اور وہ مستحق مبارکباد ہیں۔

اب آئیے اسی جتھے کے ایک دوسرے حکمت استاد حضرت مخمور جالندھری
کے کلام بلاغت نظام کے کچھ ادبی جواہر ریزوں کی زیارت کریں جنھوں نے جنسیات
سے متاثر ہو کر اپنے کلیجہ کے بڑے بڑے ٹکڑے نکال کر آپکے سامنے رکھ دیئے ہیں
ایک عورت کو کپڑے بدلتے دیکھکر آپ فرماتے ہیں۔

مونگیا رنگ کی انگیا میں گرہ کس کے نہ دے.
کیا نمائش نہیں منظور تجھے جوبن کی
راہرووں سے نہیں تو چاہتی کیا داد نگاہ
سمجھا سمجھا میں تری فطرت چالاک کے داؤ
تیری خواہش ہی تری سب سے بڑی خواہش ہے
دیکھنے والوں کو دوشیزہ نظر آئے تو

شروع مصرعوں میں تو خیر احکام امتناعی ہیں اُن کو چھوڑئیے اس کے
بعد دوشیزہ کے بعض داؤں پیچ اور ارادوں کی روشنی میں دوسرے بند پر
نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ شاعر کن گہرائیوں میں پہونچ گیا اور کیسی کیسی دشواریاں

محسوس کرنے لگا ملاحظہ ہو۔

چمٹا جاتا ہے ترے جسم سے یوں تیرا قمیض
ڈر ہے شانہ نہ بٹن توڑ کے عریاں ہو جائے
نیفہ سرکا سے نہ بل ریشمی شلوار میں ڈال
ڈر رہا ہوں میں کہیں یہ تیرا مطلب تو نہیں
کہ مجھے منزل مقصد پہ پہونچنے کے لئے
اتنے پر پیچ مراحل سے گزرنا ہوگا

یہ بند چونکہ "ادب برائے زندگی" کی جیتی جاگتی تصویر ہے اس لئے اس کا مطلب صرف دانت میں انگلی دبا کر سوچئے اور دل ہی دل میں مزہ لے لیجئے اور شاعر کو اسکی بلندیٔ تخیل کی داد دیجئے اور دعا کیجئے کہ اسکی مشکل آسان ہو اور ساتھ خیریت کے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو حقیقت یہ ہے کہ وہ ریشمی شلوار پر بل ڈالدینے سے بہت سہما ہوا ہے اور اس سے اس کی راہ میں بہت سے الجھاوے پیدا ہوگئے ہیں یہ واقعہ ہے کہ شعرا متقدمین کو یہ چیزیں کہاں نصیب۔ ایسی دشوار گذار منزلوں کی تلاش اور ایسے "پرکیف" مقصد کی تکمیل کے لئے ثابت قدمی شرط ہے ایسے کاموں کے لئے تو مخمور جالندھری اور موجودہ "ترقی پسند" شعرا جیسے دل و دماغ رکھنے والے انسانوں کی ضرورت ہے جن کی ادبی دنیا میں ریشمی شلواروں کو اس طرح کس کس کر باندھا جاتا ہے کہ مردوں کے دلوں کو چوٹ لگتی ہے۔

آپ کی ایک نظم "لذت گناہ" بھی ہے جس میں نظم کے شروع ہوتے ہی آپ نے اپنے اغراض و مقاصد بیان کر دئیے ہیں فرماتے ہیں۔

میں شرافت کا گلا گھونٹ کے آج آیا ہوں
بے حیائی دلِ بے باک میں بھر لایا ہوں۔

ظاہر ہے کہ جب اتنا بڑا کارنامہ فرما کر آئے ہیں اور دلِ بے باک کو بے حیائیوں سے بھر لیا ہے تو پھر جو نہ کر بیٹھیں تھوڑا ہے مثل مشہور ہے ننگا خدا سے چنگا خیر اس کے بعد کی کارگذاریاں ملاحظہ ہوں۔ فرماتے ہیں۔

آج آیا ہوں خدا سے بھی بغاوت کر کے
ننگ و ناموس کا سامانِ ہلاکت کر کے
میری تنقید پہ ابرو کی کمانوں کو نہ کھینچ
غیظ میں کھول کے جوبن کے اٹھانوں کو نہ کھینچ
اپنے بچکے ہوئے سینہ سے لگا لے مجھکو
اے گنہگار بنا لے مجھکو

آپنے معشوق کو ابرو کی کمان اور تیر مژگاں کی باڑھ پر تو عاشقوں کو رکھتے سنا ہوگا مگر اب ہمارے ترقی پسندوں نے اپنے پٹے کٹے معشوقوں کو ایک نئے آلۂ حرب سے مسلح کیا ہے جس کا چوتھے مصرع میں ذکر ہے۔ ہاں اس عصر کا ایک اور ترقی پسند شاعر منطق انھونوی ہے جس نے اسی اچھوتے آلۂ حرب کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔ ع

سینے پر دو بم کے گولے قاتل نہ تھا؟

اس نظم میں جو الوداعی پیغام دیا گیا ہے وہ بھی بڑا کیف آور ہے۔

اچھا رخصت کوئی اور اب مرے بعد آئے گا
تیری کچلی ہوئی لاش اور کچل جائے گا

آپ نے ذوق کا شعر سنا تھا۔

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا جو خود ہی مر رہا ہو اسکو گر مارا تو کیا مارا

مگر "ترقی پسندوں" کا باوا آدم نرالا ہے وہ لاش کچلنے کے بعد اور لوگوں کو لاش کچلنے کی دعوت دیتے ہیں بات یہ ہے کہ ترقی پسند یابیّت کے قائل نہیں وہ زندگی چاہتے

ہیں لاش کچلنے میں ان کو ایک فوجی شان نظر آتی ہے جو دشمن کے سپاہیوں کو روندتی ٹھکراتی، اور کچلتی علاقوں پر علاقے فتح کرتی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ لہذا کچلی ہوئی عورت کو ان کا جتھا یکے بادیگرے کچلتا رہتا ہے اور یہی ان کے یہاں زندگی کی تعریف ہے۔

انہی شاعر کی ایک تیسری نظم "شکستِ حجاب" ہے جسمیں ایک عورت ایک مرد سے کہتی ہے خیال تو فرمائیے سوائے کسی "ترقی پسند عورت" کے کیا کوئی عورت ان الفاظ کو زبان پر لانے کی جرأت کر سکتی ہے۔ اور انکو پڑھکر ہماری آپکی بچیوں کے اخلاق پر کیا اثر پڑیگا۔

ذرا گھنے گھنے بالوں سے کھیلنے دے مجھے
رسیلے ہونٹوں سے گالوں سے کھیلنے دے مجھے
الگ نہ ہو مری سانسوں کی آنچ سے ڈر کے
یہ گورا گورا بدن بھینچ دے جی بھر کے
جھکا نہ اپنی نگاہیں حیا سے اوپر دیکھ
ہر ایک چیز کو بے خوف ہو کے چھو کے دیکھ

ملاحظہ فرمایا آپ نے گھنے بالوں سے کھیل کا آغاز ہوا۔ پھر نئی نئی فرمائشیں ہوتی گئیں اور رفتہ رفتہ ہاتھ چولی سے دامن اور دامن سے نہ جانے کہاں کہاں پہونچ گیا دیکھئے نا۔ ہونٹوں سے گال اور گال سے بدن پر اترنے کے بعد جب مرد کی شرم و حیا سے گردن جھکنے لگی تو اُسنے اپنی تمام چیزیں کھول کر سامنے رکھدیں اور عام اعلان کر دیا کہ ہر چیز کو بے خوف اور بلا روک ٹوک چھو۔

چنانچہ آخر میں ارشاد ہوتا ہے۔

کھلے ہوئے ہیں کنول اپنے ہاتھ رکھ کے تو دیکھ
تمام رس بھرے میوے ہیں ان کو چکھ کے تو دیکھ

اب صرف ایک چیز کی کسر رہ گئی اور وہ یہ کہ اگر چکھنے کی دعوت دینے کے بعد

ایک مصرع اس مضمون کا اور بڑھا دیا جاتا کہ "اگر مزہ نہ ہو تو دام واپس" تو نظم مکمل ہو جاتی۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ نے کہا تھا ؎

بوسۂ بمن دادی دشنام دادہ
باز ستان گر نہ پسند دیدہ

مگر سعدیؒ نے درحقیقت ہمارے اس ترقی پسند شاعر کو منھ چڑھایا ہے۔ لفظ "باز" پر شیخ سعدیؒ کو ناز ہو سکتا ہے مگر یہاں تو ہر ہر لفظ موتیوں کا مالا ہے پورا شعر گڑبڑ جھالا ہے جس میں "ہر چیز کا دام چھ پیسہ" کی آوازیں سنائی پڑ رہی ہیں۔ اور ایک پکار یہی ہے کہ "مزہ نہ ہو تو دام واپس"۔

ایک اور شاعر احمد ندیم قاسمی ہیں عموماً اچھا کہتے ہیں مگر جب "ادب برائے زندگی" کہنے والوں کی زبان میں کچھ فرماتے ہیں تو یوں فرمانا شروع کر دیتے ہیں۔

چھپتی چھپتی جھکتی جھکتی مرے پاس آتی تھی
رستوں سے کتراتی جب کھیتوں میں چھپ جاتی تھی
اور جب گھبرا کے کہتی تھی ——— "کوئی دیکھ رہا ہے"
سامنے کی پگڈنڈی پر وہ کالا دھبہ کیسا ہے
میں ہنس ہنس کر کہتا تھا ——— پگلی یہ تو وہم ہے تیرا
کوئی اگر ہو بھی تو یہ رکھا ہے چاقو میرا
وہ میرے پہلو میں سمٹ کر چپکے سے یہ کہتی تھی
یہ وادی تجھ سے پہلے دوزخ سا بنی رہتی تھی
تجھ سا بانکا گبرو پایا ——— واہ ری قسمت میری
دیکھو گر ما کے جاتے ہی ——— مجھکو چھوڑ نہ جانا

یہ نظم ۴۲ء کی منتخب نظم ہے۔ شاعر صاحب غالباً اپنی طالب علمی کے زمانہ میں اپنی موسم گرما کی خوش فعلیوں کا ذکر فرماتے ہیں جب غالباً وہ دیہات میں اپنے علاقہ کی دیہاتی لڑکیوں پر اپنی جودت طبع صرف کرتے ہوں گے چنانچہ انھیں بدنصیب لڑکیوں میں سے کسی ایک لڑکی کے عشق و محبت کی داستان اس نظم میں مزے لے کر بیان ہو رہی ہے۔ واقعہ کچھ اس قسم کا معلوم ہوتا ہے۔

شاعر پر کوئی دیہاتی لڑکی عاشق ہے۔ یاد اللہ بڑھتی ہے چھپ چھپ کر کھیتوں کی مینڈھوں اور پگڈنڈیوں پر ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ ایک روز کسی کھیت میں کوئی غیر معمولی صورت پیش آجاتی ہے لڑکی گھبرا کر کہتی ہے "کوئی دیکھ رہا ہے" مگر یہ حضرت "پگلی" اور "بیوقوف" کہکر دلاسا دیتے ہیں اور جب اس کے بعد بھی وہ گھبراتی ہے تو اپنا کھلا ہوا چاقو جس کو حفظ ما تقدم کی غرض سے کار خاص کا آغاز کرتے وقت انھوں نے کھول کر بغل میں رکھ لیا ہے دکھا کر کہتے ہیں کہ مزاحمت کرنے والے کے لئے یہ چاقو کافی ہے۔ لڑکی دنیا و مافیہا کو بھول کر مست ہو جاتی ہے اور اسکے بعد شاعر کو "گبرو جوان" قسم کے الفاظ سے خطاب کرنے لگتی ہے اور اس وادی کو جنت بتاتی ہے جہاں یہ "کارنیک" انجام پا رہا ہے۔

مگر اس عریاں نظم سے قطع نظر احمد ندیم قاسمی ایک اچھے شاعر ہیں ان کی اس نظم سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ان "ترقی پسندوں" سے متاثر ہوتے جا رہے ہیں اور اُس سیلاب میں بہے جا رہے ہیں جو ان سب کو فنا کے گھاٹ اتارنے جا رہا ہے اگر ان کو ان کی اس قسم کی لغزشوں پر نہ ٹوکا گیا تو اردو ادب کا ایک خوشگو اور ہونہار شاعر جس سے ہم کو بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں گمراہیوں میں پڑ کے مجموعہ رجال الدہر ہی بن کر رہ جائے گا۔

اچھا اب چلتے چلاتے آخر میں میراجی کی نظم "حرامی" اور "سرسراہٹ" سے

دو بند بھی سُنتے چلئے اور اُن کی بلندیٔ فکر کی داد دیجئے۔ میراجی اپنی نظم حرامی میں حرام کار لڑکی کی تعریف کرکے دنیا کے حرامیوں کی سرپرستی فرماتے ہیں اور اپنی نظم کا آغاز یوں کرتے ہیں۔

قدرت کے پرانے بھیدوں کا جو بھید چھپائے چھپ نہ سکا
اُس بھید کی تو رکھوالی ہے۔
اپنے جیون کے سہارے کو اس جگ میں اپنا کر نہ سکی
یہ کم ہے کوئی دن آئے گا وہ نقش بنانے والی ہے
جو پہلے پھول ہے کیاری کا پھر پھلواری ہے مالی کی

ظاہر ہے کہ حلالیوں کے بعد حرامیوں کا طبقہ کسی کی سرپرستی سے کیوں محروم رہ جاتا ایک طبقہ آخر اس کو سراہنے والا پیدا ہی ہو گیا۔ آپ ہی کی ایک دوسری نظم ہے "سرسراہٹ" جس کا پہلا مصرع ہے۔

یہاں ——— ان سلوٹوں پر ہاتھ رکھ دوں؟

"یہاں" اور "ان سلوٹوں" کا مفہوم تو آپ نظم کے عنوان ہی سے سمجھ گئے ہوں گے۔ ان سلوٹوں پر ہاتھ رکھنے کی اجازت کی ایک ہی رہی۔ اے حضرت آپ ہاتھ نہیں اس پہ پیر رکھ دیں۔ آپ اپنی صحت کے ذمہ دار ہیں ہمیں کسی سے دریافت کرنے کی کیا ضرورت "سرسراہٹ" کے بعد کے کچھ مصرعے اور ملاحظہ فرمائیے اور سوچئے تو اس کا انجام کیا ہوگا اگر شاعر غیر شادی شدہ ہو۔

یہ لہریں ہیں بہی جاتی ہیں اور مجھ کو بہاتی ہیں
یہ موجِ بادہ ہیں ساغر کی، خوابیدہ فضا دل میں
اچانک جاگ اٹھتی ہیں
حقیقت کے جہاں سے کوئی اس دنیا میں در آئے

تو اُس کے ہونٹ متبسم ہوں ——— شاید قہقہہ اٹھکر

اس کے بعد کے مصرعے بہت بڑے بڑے ہیں جن کا کاغذ متحمل نہیں ہو سکتا اس لئے اتنے ہی مصرعوں پر قناعت کیجئے اور ان "ترقی پسندوں" کی شاعری کا اندازہ کیجئے کہ یہ ادب برائے زندگی ہے یا برائے موت یقین جانئے اس "سرسراہٹ" کے بعد اگر فرائڈ کے فلسفہ پر عمل درآمد کیا گیا اور اس سرسراہٹ کو اپنے ہاتھوں مٹانے کی کوشش کی گئی تب تو ظاہر ہے یہ فعل خودکشی کے مترادف ہوگا اور اگر دوسروں سے اس "سرسراہٹ" میں مدد لی گئی تو قابل دخل اندازی پولیس ہوگا اور ساری آزاد پسندی دھری رہجائیگی کیونکہ یہ ہے برطانوی راج۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے!

از مسٹر شوکت تھانوی

لوگ کہتے ہیں کہ میر سا شاعر پھر نہ پیدا ہوا۔ غالب پر کوئی غالب نہ آسکا، اب کون سمجھائے ان حضرات کو کہ جناب والا میر نے ریلوے اور موٹروں پر بیٹھ کر شعر نہیں کہے ہیں۔ غالب کسی دفتر میں کلرک کیا کسی رسالہ میں ایڈیٹر نہیں تھے وہ شاعر تھے اور محض شاعر، گھروں میں لیٹ کر شعر کہتے تھے۔ راتیں اپنی تھیں دن اپنے تھے، وقت اپنا تھا۔ فرصتیں اپنی تھیں۔ گاڑی اپنی تھی اور بیل اپنے تھے۔ کہاں وہ فرصتوں میں ڈھلے ہوئے اشعار کہاں یہ شعر کہ بائیسکل پر بیٹھے گھڑی دیکھتے دفتر کی طرف جا رہے ہیں۔ نظریں ٹریفک پولیس کے اشاروں پر۔ کان لگے ہیں موٹروں کے ہارن پر۔ دل دھڑک رہا ہے اس خیال سے کہ موٹر کی جھپیٹ میں نہ آجائیں یا سائیکل کی لپیٹ میں کوئی راہ گیر نہ آجائے اور زبان کی نوک پر مصرع طرح موجود ہے شام کے مشاعرے کا۔ دفتر میں پہونچے تو سامنے فائلوں کا ڈھیر، اور گرد اہل غرض حضرات کا ہجوم اور سب کا الگ الگ مقصد مصرعے دماغ میں آنا چاہتے ہیں مگر یہ منظر دیکھکر بھڑک جاتے ہیں بمشکل تمام جو مصرعے پھنس گئے ان کو بلاٹنگ پیپر پر لکھ لیا۔ دن بھر اسی طرح مصرعے پھانسے شام کو سب مصرعے جمع کرکے دو سے تقسیم کر دیئے۔ حاصل تقسیم ہوئی اشعار کی تعداد، اور یہی اشعار جاکر مشاعرے میں سنا دیئے۔ اب بتائیے کہ یہ اشعار کیونکر میر اور غالب کا جواب ہو سکتے ہیں۔ میر اور غالب کو انہی حالات میں مبتلا کرکے کچھ کہلوائیے تو پتہ چلے کہ وہ خود بھی اپنے معیار پر اترتے ہیں یا نہیں مگر یہ بھی سچ ہے کہ ہر زمانہ اپنی

ضروریات کو خود سمجھتا ہے اور خود ساتھ لاتا ہے فرصتیں تھیں تو طلسم ہوشربا لکھنے اور پڑھنے کا ذوق لایا۔ فرصتیں محدود ہوئیں تو یہ ذوق ناول میں محدود ہو گیا فرصت اور محدود ہوئی تو ناول افسانہ بن گیا۔ فرصت اور مختصر ہوئی تو افسانہ بھی مختصر ہو گیا۔ اسی شاعری نے زمانہ کے ساتھ چولے بدلے۔ فرصتیں مثنویاں کہلاتی تھیں مصروفیتیں غزلیں کہلوانے لگیں مصروفیت اور بڑھی تو غزلیں ہی ختم آزاد شاعری سہی جس وقت جتنی فرصت ملے اتنا بڑا مصرع کہہ لیجئے۔ یہ نہیں کہ سب مصرعے برابر کے ہوں بعد میں سب کو یکجا کر لیجئے ایک نظم ہو جائے گی۔ مثلاً آپ کو پانچ منٹ کی فرصت ہے تو آپ پانچ منٹ والا مصرع کہہ لیجئے۔ ع

"ہائے آغاز محبت کی وہ پہلی دھڑکن"

پھر کسی وقت ایک منٹ کی فرصت والا مصرع کہہ لیا۔ ع

"جو ترے سینہ میں تھی"

اسی طرح کبھی تین منٹ کی فرصت ملی کبھی ڈھائی منٹ کی اور کبھی پورے چار منٹ کی اسی مناسبت سے مصرعے ہوتے چلے گئے اور آخر میں جا کر اچھی خاصی نظم کچھ اس طرح کی تیار ہو گی۔

ہائے آغاز محبت کی وہ پہلی دھڑکن
جو ترے سینہ میں تھی
وہ دھڑکتا ہوا دل
کچھ مچلتے ہوئے ارمان بھی تھے مہر بلب
یعنی خاموش
اور آنکھوں کے دریچوں میں حیا بیٹھی تھی
سیر کرنے کے لئے

گنبدِ عرش پہ تھے چاند ستارے لرزاں
خطا سرطان کی قسم
میں نے دیکھا ہے کہ خود کانپ رہی تھی تو بھی
ہائے آغازِ محبت کی وہ پہلی دھڑکن

اس نظم سے یہ بات ہر ایک کو معلوم ہو جائے گی کہ شاعر کوئی بیکار آدمی نہیں ہے۔ اس کو شاعری کے علاوہ دنیا میں اور کام بھی ہیں اور اُس کے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے کہ ہر مصرع کے لئے برابر کا وقت مہیا کرتا پھرے۔ مطلب یہ کہ نظم مختلف اوقات میں مختلف قسم کے مصرعوں سے بھی مرتب ہو سکتی ہے فی الحال اس قسم کی نظمیں کہنے کے لئے وقت مل رہا ہے لیکن جب اتنا وقت بھی نہ ملے گا۔ تو آج کل جو عنوان ہوا کرتا ہے۔ وہی نظم کا درجہ حاصل کرے گا مشاعرے میں اعلان ہوگا کہ اب زید صاحب، بکر کے انکی تازہ نظم سنئے زید صاحب بکر دی ڈائس پر آکر گائیں گے "اے بہار"۔ مشاعرہ تالیوں کی گونج سے اڑ جائے گا اور زید صاحب بکر دی سلام کرتے ہوئے اپنی جگہ پر آجایا کرینگے۔

(ماخوذ از کتاب لاہور)

ا-خ-غالب کے نام

از جناب نادم سیتاپوری

مزنگ ۔ لاہور

۷ر نومبر......

مائی ڈیر غالب! مناسبات! معاف کرنا میں تم کو جواب دیر سے لکھ رہا ہوں! بمبئی چلا گیا تھا۔ مجھے وہاں سے اپنی ایک نظم "فٹ پاتھ" براڈکاسٹ کرنی تھی!...... اور ترقی پسند شعراء کی کانفرنس میں شریک بھی ہونا......! غالباً کانفرنس کی کارروائی تم اخبارات میں دیکھ چکے ہو گے تمھاری "نظم" "غزل" پہونچی "اصلاح" تمھاری خواہش ہے کہ میں اصلاح کر دوں اس نظم پر......! جو تمھارے خیال میں "نظم" ہے اور میرے نزدیک...... ہم وزن الفاظ کا ایک ادق اور مبہم گھروندا......!...... لال بجھکڑ کی ایک پہیلی......! عقل و قیاس سے بہت دور کا ایک ذہنی وہم......! نہایت موٹے موٹے الفاظ کے پنجرے میں گھٹتا ہوا ایک مقید پرند...... "شاعری" جیسی...... آزاد چیز کے لئے یہ قید و بند......! یہ پابندیاں......! یہ رکاوٹیں...... بتاؤ...... سوچو...... غور کرو! کہاں تک مناسب ہے یا ہو سکتا ہے "شعر"...... ! تم عروض و قافیہ میں جکڑے ہوئے الفاظ...... ! ردیف و قافیہ میں سسکتے ہوئے خیالات! وزن اور بحر کی تاریکیوں میں گھٹتے ہوئے جذبات......! مقطع و مطلع میں الجھی ہوئی دل کی دھڑکنیں...... کو شاید تم شعر سمجھتے ہو! معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شکسپیر...... بائرن...... شیلے...... ملٹن...... ہومر......

اور ورڈز ورتھ ...... ایسے لافانی شاعروں کے نیچرل رومانس کے مطالعہ کا تمھیں اتفاق نہیں ہوا ...... ورنہ تم خود محسوس کر لیتے کہ جو "نظم" تم نے میرے پاس اصلاح کے لئے بھیجی ہے وہ تمھیں نہ بھیجنی چاہئے تھی .... مجھے!

"شعر" ...... در حقیقت نام ہے کائنات کی اُن برہنہ حقیقتوں کا ...... جن پر سماج اور سوسائٹیوں کی پابندیوں کا کوئی اثر نہ ہو۔ دنیا کی عریاں ترین حقیقتیں! دل کی چھپی ہوئی دھڑکنیں ...... پریم کی دہکتی ہوئی چنگاریاں، ہجر و فراق کی غم افروز لذتیں۔ وصل و وصال کی پر کیف مسرتیں! حقیقتاً یہ "شعر" ہیں ...... لیکن ...... اگر ان کی سچائیوں کو چھپا دیا جائے! ان کی برہنگی پر نقاب ڈال دی جائے ...... اور سیدھے سادھے الفاظ میں ان کو غیر مبہم طور پر نہ ادا کیا جائے ...... تو کیا یہ "شعر" کی تعریف سے الگ نہیں ہو جاتے۔

"شاعری" کوئی اصطلاحی چیز نہیں! بزرگوں کا چھوڑا ہوا ورثہ نہیں! غلامانہ قید و بند سے دور ...... قدامت اور جہالت سے منزلوں فاصلے پر ......! کائنات کے اڑتے ہوئے ذرے! سورج کی پھیلی ہوئی کرنیں ...... بادِ صبا کے خوشگوار ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے ...... جس آزادی ...... روح پرور آزادی کے لئے تڑپ اٹھتے ہیں ...... روح کی ...... خیالات کی ...... جذبات کی ... یہی سچی اور عریاں حقیقی "شاعر" ہیں۔

"موزونیت" کا مفہوم یہ نہیں! جو تم سمجھے ہو! اصل میں خیالات کی بے تکان بیساختگی کا نام ہے موزونیت! نہ کہ "دیٹوں" پر سٹ کئے ہوئے فقرے! جن کو "مصرعہ" کہتے ہو تم ....؟

ویشیائی شاعری دنیا میں جتنی ناکام رہی اور ہے اس کا سبب یہی ہے جو میں نے لکھا ہے!

ان کے الجھے ہوئے خیالات ......! جکڑے ہوئے جذبات ... پھڑپھڑاتی ہوئی آہیں ...... سسکیاں لے لے کر ختم ہو گئیں اور ختم ہو جانا چاہتی ہیں۔!

آزادی دنیا کا ایک سب سے بڑا حق سب سے جائز مطالبہ .... اور زندگی کا ایک کیف آور رومان! اس کے دروازے بند کر دیئے جائیں ایک "شاعر" پر! جس کی روح جس کا جسم جس کے خیالات جس کے جذبات! بالکل اس طرح آزاد ہیں جیسے جنگل کے خوبصورت پرند ...... ندی کے شور مچاتے ہوئے آبشار ...... کھلے ہوئے میدانوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ......!

میرے پیارے ......! تمھارے خیالات کی میں قدر کرنا چاہتا ہوں ...... مگر ایسی نظموں سے نہیں!

بیشک تم میں ایک اچھے ترقی پسند شاعر بننے کے جراثیم موجود ہیں اگر تم ان کو ٹھکانے سے کام میں لاؤ ......! معاف کرنا ... میرے پاس وقت نہیں ہے ورنہ میں تمھاری بھیجی ہوئی پوری "نظم" "غزل" ٹھیک کر کے بھیج دیتا ..... مگر کیا کروں ...... اس مہینے میں ہندوستان کے تمام ریڈیو اسٹیشنوں سے میرا پروگرام ہے! اور ترقی پسند شاعری پر جو فلم بن رہی ہے اس کو بھی مجھے "فلمانا" ہے! اس کے علاوہ کئی جگہ ترقی پسند شعراء کی کانفرنس بھی!

ان وجوہ سے فی الحال بالکل مجبور ہوں۔ صرف تمھارے ایک "ٹکڑے" پر جو تمھاری اصطلاح میں "شعر" ہے اصلاح کر رہا ہوں۔

تمھارا "ٹکڑا" ہے!

نقش فریادی ہے کسکی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

یہ سارا "ٹکڑے کا ٹکڑا" میرے خیال میں بدل دینے والا ہے اس لئے

قلمزد کر رہا ہوں اب اس طرح پر پڑھا جا سکتا ہے۔

ایران کی ایک المناک صبح میں ....!

جب ...... وہ اپنے طلائی تخت پر بیٹھا ہوا تھا........!

اور ...... اُس کے خوشنما تاج کے چمکتے ہوئے ہیروں پر سورج کی ہلکی ہلکی کرنیں پڑ رہی تھیں!

مودب کھڑی ہوئی نازک اندام خواصیں شاخوں کی طرح جھوم جھوم کر مرچھل ہلا رہی تھیں!

درباری امرا کھڑے تھے!

وہ ...... آیا۔

اُس کے ماتھے پر مصیبتوں کے آبشار مچل رہے تھے!

وہ "فریادیوں" جیسا کاغذی لباس پہنے ہوئے تھا۔

وہ ...... زمین پر جھک گیا!

ادب کے ساتھ!

اُس کی آنکھیں نمناک ...... اور دل ٹائم پیس کی طرح ٹک ٹک ٹک کر رہا تھا۔

بال بکھرے ہوئے تھے!

بادشاہ نے اُس کی طرف دیکھا نگاہ بھر کر!

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا.......

کچھ نہ کہہ سکا...... مگر......!

اُس کی داہنی آنکھ سے.... کونین کی گولی جیسا ایک آنسو زمین پر آ رہا! وہ فریادی تھا۔

اب اس شعر کی لذت کا اندازہ کرو۔ تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ اب یہ شعر کتنا بلند ہو گیا! اسکی لطافتیں کتنی بڑھ گئیں.... اسکی شعریت میں کیا حُسن پیدا ہو گئے!

اُمید ہے کہ خیریت سے ہو گے.... اچھا.... اب خدا حافظ۔ تمھارا

م۔ غ۔ شاجی

غالب کے ایک شعر پر "پانچ ترقی پسند" شاعروں کی اصلاحیں

دورِ حاضرہ کے ترقی پسند شعراء، شعرائے متقدمین سے یکسر مختلف ہوتے ہیں، ان کے رنگ ڈھنگ جدا۔ ان کے اُسلوب نرالے۔ ان کا طرزِ بیان انوکھا۔ ان سب کے استاد "میراجی" ایک علیحدہ رنگ کے مالک ہیں۔ ن۔م۔ راشد کا دوسرا رنگ ہے ڈاکٹر فیض احمد فیض کچھ کہتے ہیں۔ ڈاکٹر تاثیر کچھ اور۔ مخمور جالندھری تو گویا "آرٹ ہی آرٹ" سمجھتے ہیں۔ غرض

ہر کس بخیال خویش خبطے دارد

ہم اس نشست میں مرزا غالب کے دیوان سے ایک شعر لے کر اپنے ان "ترقی پسند" شعراء کے سامنے پیش کر کے ان سے اصلاح دلواتے ہیں اور ان اصلاحوں کی ایک ایک نقل مرزا مرحوم کو جنت میں ارسال کر دی جائے گی تاکہ جنت میں ان کے لئے سند رہے اور بروقت ضرورت کام آ سکے۔

مرزا غالب کا یہ شعر۔

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

"میراجی" کی خدمت میں اگر بغرض اصلاح پیش کیا جائے تو بڑی ناک بھویں چڑھانے کے بعد اس کو اس شکل میں تبدیل کر دیں گے۔

چار سگڑے سے کہار
ٹھوکریں ہر ہر قدم کھاتے ہوئے

آستانِ عشق کی دہلیز پر
لیجیے پینس کو لے کر آ گئے
اور آہوں کے دھویں اڑنے لگے
آسماں پر میرے نالے اس طرح پہ سر ہوئے
جیسے چھٹتے ہیں انار
ہاں ہاں یہی ویسی انار
جیسے کوئی نقرئی آواز یں
پتلی پتلی اور چھریری ڈال پر
اُس کے بیچو بیچ میں لٹکا ہوا
دوش پر اپنے انگوچھوں کی سریلی راگنی گاتے ہوئے
جا رہے ہیں تیز رو
چار تگڑے سے کہار
آہ کوچے سے مرے
اور میری آرزو کی سرحدوں سے دور دور
کہہ رہا ہوں روک دو
لیکن بلا کے ڈھیٹ ہیں
کہنے پہ بھی رکتے نہیں
دوش پر لادے ہوئے
کندھوں کے بالکل وسط میں
موٹی سی اک پینس کی لاش
جسمیں بیٹھی ہے خموشی سے نہایت منہنی

سینہ تانے لب پہ لپ اسٹک ملے
اور کیوٹیکس اُس کے ناخونوں میں ہے ایسی لگی
جیسے اک طوطے کی چونچ
ہاں ہاں کسی طوطے کسی چونچ
یا حسین چغتائی آرٹ
رہ گذر سے ایک گرگٹ کودتا اس راہ کو
دوش پر منزل بہ منزل ہے سوار
دونوں طرف
جب ازل سے اور ابد تک ایک ہو جاتے تھے وہ
جیسے اک دُراز نا راہو جبیں کی راہ میں ننگا کھڑا
تیرے کوچے کی ہوا کے دوش پر
بیٹھا ہوں میں
جس طرح پرگیت میں لرزی ہوئی اک تان ہو
اور اسکی راہ کے ذروں کے کندھوں پر سوار
سیکڑوں اندھی ہوا کی آندھیاں لپٹی ہوئی
اور تیرے کوچے سے جب بھاگا ہوا طوفانِ نوح
یوں جھجک کر رک رہے
جیسے آتے آتے منہ تک کوئی چھینک
رک رہے
اور پھر رہ جاؤں میں
منہ اور نتھنے کھول کر

انتظارِ جھینک میں
دوش پر ٹھے لئے ہیں گگرٹے گگرے رس بھرے
ٹھوکریں دہلیز پر ہر ہر قدم کھاتے ہوئے
تاک میں بیٹھا ہوا ہے فاختہ
سربسر اینٹھا ہوا بڑا ہوا
ٹھوکریں ہر ہر قدم کھاتے ہوئے
تیرے ٹھے گگرٹے گگرے نوجواں

(میراجی کے گیت میں ۱۲)

دہلیز پر
چار گگرے سے کہار

اسی شعر پر اگر "پیغمبرِ سخن" جناب ن۔م راشد اصلاح دیں تو غالباً شعر یوں سے یوں ہو جائے گا۔ ایک مرتبہ مرزا مرحوم کا شعر پھر دہرائیے ورنہ کہیں آپ سماج کی گہرائیوں میں گم نہ ہو جائیں۔

پینس میں گذرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

ن۔م راشد کے خیال میں شعر "بھرپور" اصلاح چاہتا ہے تاکہ پہلے مصرعہ اور دوسرے مصرعہ میں ......"ہم آہنگی" پیدا ہو سکے غالب مرحوم نے شاید یہ شعر "ایلیٹ" سے متاثر ہو کر کہا تھا مگر پھر بھی "ہنگامی اور اعصابی" شاعری کے "تلذذ" سے کوسوں دور ہے کیونکہ شعر میں کوئی "رجائی کیفیت" نہیں پیدا ہو سکی۔ اسی شعر کو اگر یوں کہا جائے تو شعر میں ترنم اور معنویت دونوں بیک وقت پیدا ہو جائیں۔ اصلاح کے بعد شعر کو یوں پڑھئے۔

واکئے بیٹھے ہیں سب
تیرے کوچہ کی گلی کے موڑ پر
خاک کے وہ نوجواں ذرّے جو ہیں
تیری نگاہِ مست پر مچلے ہوئے
اور کر دیتا تھا ہیں
صبح پو کے پھٹتے ہی
اپنی جھاڑو کی نوکیلی نوک سے
تاکہ گھر تو بیٹھ کر
مسکراتی اور اٹھلاتی ہوئی
اس حسیں پینڈے سے ہیں سپنیں کے سوار
چار کے کندھوں پہ میری راہ سے
گزرے اگر
اور نتھنے پھول جائیں، ان کہاروں کے اگر
ہنپنے لگیں جو اس طرح پر تیرے ہلکے بوجھ سے
جیسے اُمیدوں سے ہو اک نازنیں
اور ہولے ہولے جاتی ہو کہیں
اپنے عاشق کی نگاہ گرم سے چھپتی ہوئی
اور تھک جانے پہ بھی
روکے نہ وہ اپنے قدم
واکئے بیٹھے ہیں سب

اگر غالب کے اسی شعر پر کہیں حضرت محمور جالندھری کی اصلاح پڑ جائے تو شعر میں اچھی خاصی "ندرت اور تازگی" پیدا ہو جائے گی اور شعر کی ہر رگ و پے میں ایک برقی لہر دوڑ جائے گی اور بینیں اور بینیں والی دونوں کے پرزے چاک ہو جائیں گے۔ محمور صاحب کے خیال میں غالب کا خیال تو ذرا اچھا ہے مگر وہ قرینہ سے اس کو ادا نہیں کر پایا ہے۔ اگر اسی چیز کو وہ یوں لکھتے تو شعر میں "تکیک رجائیت نفسیاتی محسوسات اور جنسی آسودگی" پیدا ہو جاتی اور شعر میں معاملہ بندی اور شوخی بھرپور نظر آنے لگتی۔ ملاحظہ ہو۔

اس کی بینیں کی لچکتی ہوئی انگیا کے قریب
ایک کھڑکی ہے لگی
جس کا روزن ہے کہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے
اور وہ معصوم چھپائے ہوئے سینہ کا ابھار
جھانکتی جھانکتی ہم سب کا جلی جاتی ہے
حالِ بد۔ حالِ خراب
لیا مری جان تو گذرے گی مرے کوچہ سے
اور میں اپنے ستونِ غم ہستی کو لئے
چپکے چپکے ترے آغوش میں در آؤں گا
ان کہاروں کا لچکتا ہوا ـــــ معصوم سا گوشت
ہڑے ہوئے مجھے لے جائے گا نظروں سے مری
اور پھر چار گراں ڈیل جوانوں پہ سوار
تیرے مچلے ہوئے ارمان گذر جائیں گے
ہاں اچکتی ہوئی ٹانگوں میں لچکتی ہوئی کھال

مجھکو کوچہ میں نہ روکے ہے نہ روکے گی کبھی
اس کی سہمی کی لچکتی ہوئی انگیا کے قریب

اگر فیض احمد فیض غالب مرحوم کے اس شعر پر اصلاح دیں تو اصلاح تو ضرور مختصر ہوگی مگر شعر خاصہ "ترقی پسند" ہو جائے گا۔ اور اس میں موجودہ دور انقلاب کے دوش بدوش چلنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ اصلاح ملاحظہ ہو۔

اس کی گھبرائی ہوئی سہمی میں
انقلابات کا اک لوچ تو ہے
میرے کوچے سے گذر جانے کا
اس میں اک جوش تو ہے
اس کو اس راہ کے آغوش میں در آنے دو۔
اور مرے کوچۂ الفت سے گذر جانے دو۔
میرا جکڑا ہوا سوز
اُن کہاروں کی جواں ٹانگوں میں
ایک سیلاب کا دھارا ہے رواں
جو اُسے دوش پہ بٹھلائے ہوئے
میرے کوچے سے لئے جاتا ہے
اس کی گھبرائی ہوئی سہمی کو

اسی شعر پر اگر ڈاکٹر تاثیر اصلاح دیں تو زیادہ نہیں فی الحال شعر اتنا بڑا ہو جائے گا۔

دھیمی دھیمی طویل سی بینیں
مرے کوچہ میں کوئی کیوں روکے
اور مری برق پاش نظروں سے
کوئی ہر ہر قدم پہ کیوں ٹوکے
کوچۂ سوز و ساز سے میرے
اس کو جلدی کہار لے جائیں
ورنہ ڈر ہے کہیں مرے جذبات
لیٹ کر ستیہ گرہ نہ کریں
اور پھر لاٹھی چارج ہو جائے
اور محروم ہو کے دل میرا
اپنے مدھم سروں میں گانے لگے
دھیمی دھیمی طویل سی بینیں

نظمیں

دو لفظ

از مسٹر حبیب احمد قدوائی ایم اے

دفتر کی گھٹی ہوئی ساکن فضا میں بربطِ سخن چھیڑنا، ایک نئی حرکتی زندگی کا آغاز ہے۔ گو سرخ فیتہ گلے کا ہار رہے مگر فرقت آزاد شاعری کی فضائے بسیط میں محو پرواز ہو کر نوخیز ترقی پسند شاعروں کے دھیمے سُروں میں کچھ کہہ رہا ہے بسرت نہیں حیرت ہے۔ حیرت نہیں مسرت ہے۔

مدادا اسم بامسمیٰ ہے۔ وہ نہ صرف آزاد نظم کی سنگدلانہ ناہمواری پر ایک دلنواز تبسم ہے بلکہ جدید ادبی مادۂ فاسد کے حق میں علاج بالمثل کا بے مثل ادبی مثیل۔

مدادا کا آغاز فرقت کی سوچ بچار کی ہوئی بے ہنگام شاعری سے ہوتا ہے جس میں زندگی کے خس و خاشاک سے صرف بامعنی مگر تلخ حقیقتوں کو چن چن کر پیش کیا گیا ہے اسکی پشت پر وہی ذہنی وارفتگی اور نفسیاتی ابتہاجیت ہے ایک نئے تال سر کا احساس جاری و ساری ہے شورش تازہ کی سرمستیاں، جدت تخیل میں تحلیل ہو کر تیز و تند ہو گئی ہیں۔ بنابریں ان کیفیتوں اور منظروں کی تیز رنگ مصوری ملتی ہے جن سے نفاست پسند شاعری آنکھ چراتی ہے نظمیں نئی روایات کی حامل ہیں۔ موجودہ بھیڑ بھاڑ عجلت و انتشار کے زمانہ میں آراستہ پیراستہ حسن بیان اور سنوری ہوئی زبان کے چٹخارے لینے کی کسی کو فرصت کہاں چنانچہ ان نظموں میں فطری واقعاتی سادہ زبان کے ساتھ ان میں بے باکانہ طرز اظہار، قدیم روایتی علامات سے گریز اور مروجہ فن عروض سے دیدہ و دانستہ اعراض جسکے لئے راشد اور میراجی ہنگامی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

الفاظ کے خون ناحق سے کوئی نظم رنگین نہیں بلکہ اسکے برخلاف لطیف تصویریت اور تخلیقیت کی جلوہ ریزیاں قدم قدم پر آشکارا ہیں حقیقت کی شعاعوں میں حسین و جمیل رومانی نقوش اور زیادہ اجاگر ہو گئے ہیں۔ طلسمی تاثرات و مشاہدات کی ذکی الحسی عکاسی۔ پیچیدہ زندگی کے پیچیدہ تر مسائل کے حل کیلئے ایک حد تک ناگزیر ہے فرقت نے بہت ہی تیز دھڑکا دینے والی باتیں کہی ہیں اور اسی لئے ابہام اور اشاریت سے برائے نام سروکار رکھا ہے دفتری مصروفیت اجازت نہیں دیتی کہ کوئی سیر حاصل فنی تجزیہ کیا جائے بہرحال وہ نظمیں نظم معرا کی پہنائیوں و گہرائیوں پستیوں و بلندیوں کی آئینہ دار ہیں۔

آزاد نظم نیا شعری تجربہ ہے زندہ دلانِ پنجاب اس خودکاشتہ پودہ (آزاد نظم) کو چمن نظم میں نصب کرنیکے درپے ہیں لیکن کیا واقعی اس پودے میں اتنی جان اور سکت ہے کہ آزاد ہو کر جنس سکے برگ و بار پیدا کر سکے اس سوال کا شافی و کافی جواب ان حضرات کے قلم سے ملیگا جنکی نگاہ سخن شناس کبھی خطا نہیں کرتی۔

ان دو لفظ کیساتھ مدادائے سخن پیش کرنیکی جرأت کی جا رہی ہے۔ اگر ادبی مادۂ فاسد تحلیل ہو جائے تو سمجھا جائے گا کہ لمحات فرصت ضائع نہیں ہوئے۔

(از ادبِ لطیف لاہور)

سادہ سوال

ایک ——— ؟
بے کار
حقیر اور بچارا
تنہا
وجہ پریشانیٔ خود!

ایک اور اک ——— ؟
دو
جمع کا ایک سادہ سوال
رونقِ بزمِ ہستی!

ایک ضرب ایک ——— ؟
دو، اور اک ——— تین
کبھی چار
کبھی پانچ بھی ہو جاتے ہیں
اور کبھی اس سے بھی زائد
لیکن
پھر جو بٹتے ہیں
تو ہیں پانچ سے چار
اور کبھی تین سے دو
اور پھر اک
ایک اور اک دو کا وہی سادہ سوال
باعثِ ہنگامۂ دہر

ایک ضرب ایک ——— ؟
ہزاروں
لاکھوں
لاکھوں - کروڑوں - اربوں
ہر کوئی ایک ہے لاکھوں پہ گراں
اور کئی لاکھ؟
حقیر اور ناچیز
تیری عظمت کے ستون!

تو ہے ان سب سے الگ
اور علیحدہ
یکتا
میں ہوں بد دل
مایوس
ایک
بچارا
تنہا

تجھ کو آ جائے اگر جمع کا یہ سادہ سوال
تیری دنیا بھی حسین ہو جائے۔

عبد المجید بھٹی

ٹیڑھا سوال

ایک
ایک۔ دو
ایک۔ دو تین
ایک۔ دو تین۔ چار
ایک۔ دو تین۔ چار۔ پانچ
ایک۔ دو تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ
ایک۔ دو تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ۔ سات
ایک۔ دو تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ۔ سات۔ آٹھ
ایک۔ دو تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ۔ سات۔ آٹھ۔ نو
ایک۔ دو تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ۔ سات۔ آٹھ۔ نو۔ دس
ایک۔ دو تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ۔ سات۔ آٹھ۔ نو۔ دس۔ گیارہ
ایک۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ گیارہ۔ بارہ
ایک۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ بارہ۔ تیرہ
ایک۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ بارہ۔ تیرہ۔ چودہ
ایک۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ تیرہ۔ چودہ۔ پندرہ
ایک۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ پندرہ۔ سولہ
ایک۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ سولہ۔ سترہ
ایک۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ سترہ۔ اٹھارہ
ایک۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ اٹھارہ۔ انیس
ایک۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ انیس۔ بیس
ایک۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ بیس۔ اکیس
ایک۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ ،، ۔ اکیس۔ بائیس
ایک ____________________ ھ
چالیس کرور

ایک شاعر کا مطلب یہ ہے کہ ایک بچہ پیدا ہوا۔ دوسرے مطلب یہ کہ اسکی شادی کردی گئی اور ایک سے دو ہو گئے تیسرے مصرعہ میں اس بچہ کے یہاں بچہ پیدا ہوتے دکھایا گیا ہے اور اب وہ ایک دو تین ہو گئے، اس کے بعد چوتھے مصرعہ سے بائیسویں مصرعہ تک ہر سال ایک بچہ کا اضافہ ہوتا گیا اور بچوں کی تعداد بیس تک ہو چکی ہندوستانی عورت ایک یا ایک سے زیادہ تندرست مرد سے زیادہ سے زیادہ بیس بچے پیدا کرنے کا دم رکھتی ہے اور اس کے بعد جب اس کی قوت جواب دیتی ہے تو اس کی اولادیں ایک سے شروع کرتی ہیں اسی لئے نظم کے آخر میں پہلے مصرعہ کو پھر سے دہرایا گیا ہے آخر میں چالیس کردار اسی پیداوار کا نتیجہ ہیں یہ ہے ایک "ترقی پسند" شاعر کی تخئیل کی بلند پروازی جو آج تک کسی بڑے سے بڑے شاعر کو نصیب نہ ہو سکی میرے خیال میں جب "ترقی پسند شاعر" اور زیادہ سماج کی گہرائیوں میں پہونچے گا تو اُسے اسی قسم کی فلسفیانہ چیزیں ملیں گی اور اس کی شاعری مذکورہ بالا قسم کا نمونہ بن کر رہ جائے گی۔

“

ڈاکٹر

تاثیر

سے

متاثر ہو کر

بک گیا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ!

مـ

ڈاکٹر تاثیر

پنجاب کے ترقی پسند شعرا میں ڈاکٹر تاثیر بھی آپ اپنی نظیر ہیں فیض احمد فیض کی طرح آپ بھی ایک اچھے خوشگو شاعر ہیں۔ شاعری کے عام اصولوں کے پابند ہو کر آپ جب کوئی شعر کہتے ہیں تو بہت بلند ہوتا ہے مگر جب آزاد شاعری کرنے لگتے ہیں تو پڑھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے کہ یہ ڈاکٹر تاثیر ہی ہیں یا کوئی دوسرا۔ بہرحال ان کے آزاد شاعر ہونے کی وجہ ہماری سمجھ میں سوائے اس کے اور کوئی نہیں آتی کہ انھوں نے سگمنڈ فرائیڈ کو بہت پڑھا ہے اور اس کے فلسفہ سے نہیں بلکہ اس کے طریقۂ علاج سے بیحد متاثر ہو کر اور محض تھکان دور کرنے کے لئے کبھی کبھی وہ آزاد شاعری کر لیتے ہیں اور اس شاعری کو وہ شاعری کی غرض سے نہیں بلکہ بطور علاج کرتے ہیں۔ اسی لئے رسائل میں ان کا اس قسم کا کلام بہت کم نظر آتا ہے اور شائد اسی وجہ سے ابھی تک آپ کا آزاد شاعری کا کوئی دیوان مرتب نہ ہو سکا ورنہ اگر میراجی اور ن۔م راشد کی طرح آپ بھی خالص آزاد شاعر ہوتے تو نہ جانے آج آپ کے کتنے دیوان مرتب ہو چکے ہوتے۔ چونکہ سگمنڈ فرائڈ کا ذکر آگیا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے فلسفہ پر مختصراً روشنی ڈالی جائے تاکہ آپ کو آزاد شاعروں کے خیالات کا صحیح مخرج اور منبع معلوم ہو جائے جس کو میراجی اور ن۔م راشد نے اپنی شاعری کا مقصد بنا رکھا ہے اور جس کے سبب سے اُن کے دیوان کے دیوان مرتب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

" سگمنڈ فرائڈ سنہ ۱۸۵۶ء میں آسٹریا کے دارالسلطنت "ویانا" میں پیدا ہوا۔

اس کے والدین یہودی تھے، ڈاکٹری پڑھنے کے بعد ۱۸۸۵ء میں ڈاکٹر شاکیر کی شہرت سن کر وہ پیرس چلا گیا یہاں ڈاکٹر شاکیر نومیت کے ذریعہ ہسٹیریا اور اعصابی امراض کا علاج کرتے تھے وہ ڈاکٹر شاکیر کا شاگرد ہو گیا اور ان ہی سے نومیت کی بخوبی تعلیم حاصل کی پھر ایک نیا طریقۂ علاج تخلیق کیا، اس طریقۂ علاج کو تجزیۂ نفس یا باتونی علاج بھی کہتے ہیں اس میں مریض سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے کثیف سے کثیف اور اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات جو اس کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں انھیں بے کم و کاست زبان سے ادا کرے، اس طرح پر مریض جب اپنے اچھے بُرے خیالات کا اظہار کرتا ہے "تو بقول فرائیڈ اس کے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے اور محبوس ..... جذبات جو مرض کا اصل سبب ہوتے ہیں وہ دل سے نکل جاتے ہیں اور مریض کو صحت ہونے لگتی ہے ۔ اس کو آپ باتونی علاج کیا بلکہ ایک قسم کا دماغی جلاّب کہہ سکتے ہیں یہ واقعہ ہے کہ انسان کی بہت سی خواہشات ایسی ہوتی ہیں جن کو انسان سوسائٹی کے آداب و اخلاق کے پیش نظر ظاہر نہیں کر پاتا اور اور اُن کو دل ہی دل میں لئے گھٹا کرتا ہے فرائیڈ کے فلسفہ کی رو سے یہ خواہشات نفس نیم شعوری میں دب جاتی ہیں اور اظہار کی راہ ڈھونڈا کرتی ہیں"۔ لہٰذا آج کل کے مغرب پرست حضرات اور بالخصوص یونیورسٹی کے نوجوان طلباء جو مشرقی تہذیب و آداب سے نابلد ہوتے ہیں عربی، فارسی یا انگریزی میں ایم ، اے کر لینے کے معنے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ جملہ علوم و فنون کے ماہر ہو گئے، یوروپین سوسائٹی کو معیار تہذیب قرار دیتے ہیں اور مشرقی آداب و تہذیب اُن کے نزدیک رجعت پسندانہ چیزیں ہو کر رہ جاتی ہیں مغرب کی عریانی اور ہیجانی سے متاثر ہو کر اُن کو ادنیٰ سے ادنیٰ جذبات کے اظہار میں کبھی جھجک محسوس نہیں ہوتی، وہ اپنے اس قسم کے خیالات کو بلا کسی قطع و برید کے ظاہر کرنا سوسائٹی کے لازمات

میں داخل سمجھتے ہیں اس لئے زیادہ تر اسی طبقہ کے لوگ آزاد شاعر ہو جاتے ہیں اور اس قسم کے مہمل اور بے ربط خیالات پر عنوانات قائم کر کے جب وہ رسائل میں بھیجتے ہیں اور اپنے ناموں کے ساتھ ڈاکٹریٹ ایم اے اور بی اے کی ڈگری لکھدیتے ہیں تو بعض سادہ لوح اخبارات اور رسائل کے ایڈیٹران کی ڈگریوں سے مرعوب ہو کر اُن کے کلام کو نمایاں طور پر شائع کر دیتے ہیں اس طرح ان کی ہمت افزائی ہوتی ہے اور وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ بہت بڑے ادیب اور شاعر ہو گئے خواہ دوسرے وقت خود اپنے لکھے ہوئے کے معنے بتانے سے قاصر رہیں۔ اس قسم کے بے ربط فقروں اور جملوں کو ادا کرنے میں چونکہ دماغ پر کوئی زور دینے کی ضرورت نہیں پڑتی اس لئے معمولی معمولی استعداد والوں نے بھی اسی قسم کی شاعری شروع کر دی ہے۔ انگریزی ادب سے خواہ وہ اچھی طرح واقف ہوں یا نہ ہوں مگر اس قسم کے بے معنی فقرے لکھکر وہ انپر چند مخصوص عنوانات میں سے کوئی عنوان قائم کر دیتے ہیں اور نیچے فٹ نوٹ میں لکھدیتے ہیں کہ فلاں مغربی فلاسفر یا شاعر سے متاثر ہو کر نظم کہی گئی ہے پھر ان مہملیات پر تنقید کرنے والے بھی چونکہ اسی گروہ کے نوجوان "ترقی پسند" شاعر ہوتے ہیں اس لئے "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کے اصول پر عملدرآمد شروع ہو جاتا ہے بعض رسائل پر چونکہ ان لوگوں نے بڑی طرح قبضہ جما رکھا ہے اس لئے ان میں یہ لوگ بڑے بڑے قصیدے اپنے ساتھی شعراء کی شان میں چھپوایا کرتے ہیں۔ رہا اس قسم کے اشعار میں معنے پہنانے کا سوال سو وہ کوئی بڑی بات نہیں اس میں بھی وہ فرائیڈ کے فلسفۂ خواب سے مدد لے کر ان اشعار کے معنے نہیں بلکہ ان کی تعبیریں بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ بے ربط فقرے معنے اور مطلب کے محتاج نہیں ہوتے۔ فرائیڈ نے ایک کتاب خواب کی تعبیر پر سنہ ۱۹۰۰ء میں لکھی ہے جس میں اُس نے ایک ہزار خوابوں کی کامیاب

تعبیریں لکھدی ہیں "چنانچہ خواب میں مختلف چیزوں کے معنے وہ چند اشارات کے
ذریعہ متعین کرتا ہے مثلاً خواب میں مکان انسان کا جسم، والدین، بچے، بھائی بہن
ہر ایک کو عریاں صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ لوگوں نے خواب میں مکان کے سامنے
والے حصے پر چڑھتے اور اترتے ہوئے دیکھا اور اس کے ساتھ مسرت اور قوت
کے احساسات بھی پیدا ہوتے ہیں جب دیواریں ہموار ہوں تو گھر سے مطلب
آدمی ہوتا ہے جب اس میں روشندان یا سوراخ ہوں جو گرفت میں آسکیں تو
اس کا مطلب عورت سے ہوتا ہے۔ والدین خواب میں شہنشاہ، ملکہ، بادشاہ،
شہزادی، یا اور کسی عالی مرتبہ ہستی کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ بھائی اور
بہن چھوٹے حیوانات اور کیڑے مکوڑوں کی صورت میں پیش ہوتے ہیں،
پانی ہمیشہ پیدائش کو ظاہر کرتا ہے۔ سفر خواب میں موت کی طرف اشارہ ہوتا ہے،
خواب میں کمرہ عورت کو ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً فرائیڈ نے ایک خواب کی دلچسپ
تعبیر جو بیان کی وہ "ترقی پسند شعراء کے اشعار کے معنوں سے کم دلچسپ نہیں
"ایک شخص جو بورڈنگ میں رہتا تھا اس نے خواب دیکھا کہ وہ کسی ملازمہ سے
ملتا ہے اور پوچھتا ہے کہ تمھارا نمبر کیا ہے؟ اس ملازمہ نے جواب دیا کہ نمبر ۱۴
اب اس کی تعبیر یوں ہوئی حقیقت میں اس شخص کے ملازمہ سے ناجائز تعلقات
تھے اور کئی مرتبہ وہ اُسے اپنی خوابگاہ میں لایا تھا۔ ملازمہ کو ہر وقت یہ خدشہ
رہتا کہ کہیں اس کی مالکہ نہ دیکھ پائے اس لئے خواب کے ایک روز قبل اس نے
مشورہ دیا تھا کہ انھیں اور کسی خالی کمرہ میں ملنا چاہئے جس کمرہ کی طرف"
اس کا اشارہ تھا اس کا نمبر ۱۴ تھا۔ اس طرح کمرہ عورت کو ظاہر کرتا ہے"
"ترقی پسند شعراء بھی اپنے اشاروں کے معنے نکالنے میں اشاریت سے مدد
لیتے ہیں جو خصوصاً جنسیاتی خواہشات کو ظاہر کرتی ہے۔ بہر نوع ڈاکٹر تاثیر

جو یقیناً ایک خوشگو شاعر ہیں محض اختلاجی کیفیات دور کرنے کے لئے جب شاعری کرتے ہوں گے تو وہ اُن کی آزاد شاعری ہوتی ہوگی جس کے دو بند نمونے پیش کئے جاتے ہیں

دوراہے!

(از ڈاکٹر تاثیر)

ریل گاڑی پہ یہ گھمسان۔ الٰہی توبہ
نہ مروّت، نہ تکلّف، نہ تبسّم نہ ادا
یونہی ایک غیر شعوری سی خشونت کا خروش
بے ارادہ ہے تو کیا۔ غیر شعوری ہے تو کیا
یہ نئے دور کے احساسِ غلامی کا ظہور
انتقامانہ تحکّم کی نمود
خانہ جنگی ہی سہی
اس میں اظہارِ بغاوت بھی تو ہے
یونہی، یونہی، سہی
اک شائبہ دادِ شجاعت بھی تو ہے
___ (چاک تو کرتا ہوں میں اپنا گریباں ہی سہی)
بلبلاتی ہوئی مخلوق کی اس دلدل میں
سینہ تانے ہوئے کچھ لوگ بڑھے جاتے ہیں
خوب پھنکارتے پھن پھیلائے!
لوگ؟ وہ لوگ..... کالانعام نہیں
جن کو ٹھکرائے ہوئے جاتے ہیں
یہ لوگ بڑے صاحب لوگ!
یہ جو حکام ہمارے ہیں یہ حکام نہیں

جو ہمیں میں سے ہیں پر ہم میں نہیں
یہ جو بندوں کے ہیں آقا مگر آقا کے غلام
بے وفا ہوں تو ہوں بدنام نہیں
"تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا"
اپنی دنیا کی ہر اک راہ کشادہ ہے مگر
آج اک سنگ گراں حائل ہے
کہ اٹھائے نہ اٹھے اور ہلائے نہ ہلے
دوسرے درجے کے دروازہ میں
ان کے آقاؤں کا اک فرد۔ فرنگی گورا
بانہیں پھیلائے ہوئے راستہ روکے ہے کھڑا
"کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق"
سیٹیاں بجنے لگیں خدمت سرکار بجا لانا ہے
اور سرکار ہی خود سنگ رہ منزل ہے
زندگی آگئی دوراہے پر
دیر کیوں کرتے ہو بھاگو بھاگو
دوڑ کر تھرڈ کے ڈبے میں گھسو
اپنے ہم جنس غلاموں میں ملو
زندگی آگئی دوراہے پر

رس بھرے ہونٹ

(از ڈاکٹر تاثیرؔ)

رس بھرے ہونٹ
پھول سے ہلکے
جیسے بلور کی صراحی ہیں
بادۂ آتشیں نقش چھلکے
جیسے نرگس کی گول آنکھوں سے
ایک شبنم کا ارغواں قطرہ
شفق صبح سے درخشندہ
دھیرے دھیرے سنبھل سنبھل ڈھلکے
رس بھرے ہونٹ یوں لرزتے ہیں
یوں گزرتے ہیں جس طرح کوئی
رات دن کا تھکا ہوا راہی
یاوں چھلنی نگاہ متزلزل؟
وقت اِصحرائے بیکراں کہ جہاں
سنگِ منزل نما نہ آج نہ کل
دفعتًا دور۔ دور۔ آنکھ سے دور
شفق شام کی سیاہی میں
قلب کی آرزو نگاہی میں
فرش سے عرش تک جھلک اُٹھے
ایک دھوکا۔ سراب۔ منبع نور
رس بھرے ہونٹ دیکھکر تاثیرؔ
رات دن کے تھکے ہوئے راہی
یوں ترستے ہیں یوں لرزتے ہیں

چوراہے

(ڈاکٹر تاثیر کی نظم "دوراہے" سے متاثر ہو کر)

ایک بھونچال ہے یلغار خدا خیر کرے
جو مروّت سے تکلّف سے تبسّم سے بری
"بے ارادہ ہیں تو کیا غیر شعوری ہیں تو کیا"
ایک آواز کا سینہ کی حرارت میں نمود!
خارشِ جنگی کا ظہور
اس میں اک شائبۂ عقل و فراست بھی تو ہے
یوں نہیں یونہی سہی
جسم میں جوشِ ریاضت بھی تو ہے
ذرات بھر لیلی پڑی رہتی ہے یوں")
کلبلاتی ہوئی جب جاتی ہے افعی کی طرح
سینہ تانے ہوئے اور آنکھ سے برمائے ہوئے

خوب پھنکارتی پھن پھیلائے
لوگ ہیں وہ "لڑکی لوگ"...... جو مجھے دیکھ کے ہنس دیتی ہے
جن کو ٹھکرائے ہوئے جاتے ہیں
یہی تماشی۔ جو لیے پھرتے ہیں بازاروں میں
لڑکیاں..... غازہ ملے اور ہنسی سے بے کل
باچھیں اس طرح کہ "باچھوں چری" مینا کا گماں
یا سنیں تھیں کبھی، اب ہو گئیں وہ میمیں

یہ ہے محکومی کا عالم اسے عبرت سے نہ دیکھ؟
وہ ہیں آقاؤں کی آقا مگر اک خاص گھڑی
جبکہ طاری ہوں محبت کے نشہ میں مدہوش
(”اٹھئے اب دونوں وقت ملتے ہیں“)
پھانسی کا بانس بنا ڈالیں گے
ہر ”بھلے کام“ کا دروازہ کشادہ ہے وہاں
کوئی تخصیص نہیں آگ میں اور پانی میں
(”کر لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے“)

پشت کے دروازے سے
ایک شخص ہاتھ میں ڈنڈا لئے ہے سر پہ سوار
ڈھینڈا پھیرے ہوئے اور راہ روکے ہے کھڑا
(”اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے“)
سیٹیاں بجتے ہی۔ بڑھنے لگے تانگے والے
ان کے بنگلوں سے انھیں لیکے چلے حضرت گنج
دوسرے رستوں کو دکھاتے ہوئے دریا کی طرف
جلد یا تانگہ لئے گو دیں ان لاشوں کو

اور پھر............؟
لیجئے آگئی پہلی منزل
لڑکھڑاتی ہوئی تانگے سے وہ آخر اتریں
ایک بھونچال ہے یلغار خدا خیر کرے

دو مُوڑھا!

ایک لاری پہ ہے طوفان الٰہی توبہ
ایک پہ ایک لدا
کچھ تو بیں منہنی اور کچھ کا ہے بے ڈھب تن و توش
کوئی پس جائے تو کیا کوئی کچل جائے تو کیا
جنگ کے دور میں پیڑ دل نہ ہونے کا ظہور
اس کا گلہ ہے بے سود! ———
بیٹھ لیجائے وہ بھنگی ہی سہی
اس میں اک شان رعونت بھی تو ہے
دھیمی دھیمی ہی سہی
رینگ کر چلنے میں لاری کی شجاعت بھی تو ہے
("اس مصیبت میں نکل جائے اگر جان ہی سہی")
بلبلاتے ہوئے انسانوں کے اس چھتّے میں
آم ہیں ساتھ کسی کے جو سڑے جاتے ہیں
پوری لاری کو یہ بدبو سے ہیں سنڈاس بنائے
آم۔ وہ آم ...... جو سڑ جانے پہ اب آم نہیں
یہ آم ——— سڑے گھٹی آم
ان گلے آموں کو اب جن کے کوئی دام نہیں
ان سڑے آموں کا تیج بیچ میں مقام اعلیٰ ہے

ٹھاٹھ سے ایک جگہ رکھے تو ہیں
یہ گلے سڑں تو ہوں بیدام تو ہیں
"جینا مجھکو کبھی اتنا بھی تو دوبھر نہ ہوا تھا"
چھوٹی لاری کو بُری طرح یہ لادا ہے مگر
موت کی سمت ہر اک پیر و جواں مائل ہے
اور یوں فٹ ہے ہر اک شخص جگہ پر اپنی
"کہ اٹھائے نہ اٹھے اور ہلائے نہ ہلے"
اور سلاخوں کے اُدھر ایک بڑے حصے میں
دوسرے درجے کے دروازے میں
چند لٹھ باز دیہاتیوں میں واویلا ہے
ایک پہ ایک لدا سانس کو روکے بیٹھا
"دم گھٹا جاتا ہے سینہ بھی ہوا جاتا ہے شق"
عورتیں لڑنے لگیں حکم ڈرائیور کا بجا لانا ہے
ساتھ میں لائی ہیں بچے تو مچی ہے کلبل
آگئی آگئی دوموٹھ یہ عمر
"ادا مار ڈالے گی جانی تمھاری"
موت کے واسطے ہر سانس پہ تیار رہو
سب دیہاتیوں کے ہمراہ مرد
آگئی آگئی دوموٹھ یہ عمر

ستارے

لیٹے لیٹے تری الفت میں جگر لیٹ گیا
اور پھر اُٹھ نہ سکا
پیر میں چوٹ لگی آنکھ میں آنسو بھر آئے
جسم جب ہو گیا ٹھنڈا ناسور
سرد آہوں نے دھواں بن کے لگا دی اک آگ
برق رفتار پہاڑوں سے ہرن اڑ نکلے
چلتے چلتے کہیں رک جائے نہ اڑیل ٹٹو
اور اک دم سے نہ پھر ٹوٹ پڑیں
اس کے کوچے کے شکاری کتے
جو مری تاک میں ڈیوڑھی میں چھپے بیٹھے ہیں
اور جو میں دیکھتا ہوں، آڑ سے کھڑکی سے اُسے
گونج لیتے ہیں مری نظروں کو
اور میں خوف سے خستہ اور چور
اس طرح بھاگتا رہتا ہوں ترے سایہ سے
جیسے کتوں سے سیار
ریزگاری مجھے مل جائے تو لیکر کوئی چیز
اُس کے کوچے میں کھلا کر اُن کو
پہلے تو رام کروں

بعد کو رات کے سناٹے میں
چھپ رہوں اُس کے کنواڑوں کی بغل میں جاکر
اور جب رات میں دروازے کو وہ بند کرے
اُس کے قدموں پہ میں اس طرح گروں
جیسے ہانڈی سے اُبال
اور پھر چشمِ لجاجت سے کہوں
لپٹے لپٹے تری اُلفت میں جگر لیٹ گیا!!

رُخسار!!

(ڈاکٹر تاثیر کی نظم "رس بھرے ہونٹ" سے متاثر ہو کر)

تیرے غازہ ملے ہوئے رخسار
گرگریا کے پر سے بھی ہلکے
جیسے تسلے میں تاچینی کے
حورِ ناقص نفیس سا چھلکے
جیسے گرگٹ کی گول آنکھوں میں
خاک کا ایک نوجواں ذرّہ
شفقِ صبح وہ "ٹماٹر ناک"
جیسے پتلے پیاز کے چھلکے
تیرے رخسار یوں پھدکتے ہیں
یوں پھدکتے ہیں یوں اچھلتے ہیں
بند تھیلے میں جیسے ایک بٹیر
کھال میں جھرّیاں نگاہ پہ بل
ایک پتلا سا بیکراں نالہ
گندگی کا نہ جس کی، کوئی بدل
ایک بک . پاس . پاس - آنکھ کے پاس
صبحِ صادق کی کچھ سیاہی میں
ایک سوئی گلی کے نکڑ پر
اُن نگاہوں سے ہوگئی مڈبھیڑ

رات بھر ہم لحاف کے اندر
یوں پھدکتے ہیں یوں اچھلتے ہیں
بند تھیلے میں جیسے ایک بٹیر

غم

گھاس کی نیند پیڑ کی الجھن
دور بادِ صبا کبھی کر نہ سکی
سخت گرمی سے ہوش گُلفا ہیں
سخت سردی سے دل ہے آتش کریم
اور دنیا کی بے ثباتی پر
اس طرح میں جھکائے ہوں گردن
جس طرح جھیل پر کوئی بگلا
کسی مچھلی کی تاک میں گم سُم
سیج آسا تری نگاہوں پہ
نیل آسا جوانیاں صدقے
اُن گرہ باز چشمِ مست تری
اس طرح میرے دل کو لے بھاگی
جیسے باھمن کا بیل چھوٹے سے
ایک بنڈا اٹھا کے لے بھاگے

محبّت!

میری پتلی سیاہ سی بانہیں
یوں حمائل ہیں تیری گردن میں
سانپ جیسے کسی فرنگن کی
ٹانگ میں دوڑ کر لپٹ جائے
میٹھی میٹھی سی مسکراہٹ پہ
تو مری اس طرح پہ ہے نالاں
جیسے کوئی کوئین کو پیکر
منہ ہزاروں طرح سے اپنا بنائے
گوری گوری سفید سی ٹکھیں
تیری زلفوں میں یوں چمکتی ہیں
جیسے افشاں کسی کے بالوں میں
تیرے گھنگھرو سے رس بھری آواز
اس طرح یہ فضا میں رستی ہے
جیسے چھپی کے ٹوٹ جانے پر
تخمی آموں کا رس ٹپک جائے
تیرے ہجر و فراق میں ہر دم
اس طرح میں اداس رہتا ہوں
جیسے بچے یتیم خانے میں
غم سے چپ چپ اداس رہتے ہیں

چندا

جب مچلنے لگیں مرے جذبات
تجھکو تنہائی میں کہیں پاکر
کاش تو دیکھ لیں نگاہوں سے
میری گردن میں ہاتھ یوں ڈالے
جیسے مست اک کبوتری تر کی
چونچ میں چونچ ڈالدیتی ہو
تیری نظروں کے کارخانہ میں
اس طرح فتنے ڈھلتے رہتے ہیں
جیسے امریکی کارخانوں میں
جنگی ہتھیار بنتے رہتے ہیں
تیری ساری کی گوٹ میں کب سے
ایک کٹھل اداس بیٹھا ہے
جیسے بوڑی کی فکر میں کتا
کسی چکو سے کے پاس بیٹھا ہو

خُمار

ساٹھ پل
ایک سکنڈ۔ ساٹھ سکنڈ
ایک منٹ
اور پھر ساٹھ منٹ کا تو ہوا اک گھنٹہ
ایک
دو تین بجے
چار بجے
پانچ بجے
چھ سے سات اور اگر سات سے آٹھ ہو جائیں
ہاں مگر تو یہ جو پہونچا تو نکال ہی دیں گے
دس بجے سوئے تو پھر گیارہ دبارہ کے قریب
وہ نہ اٹھیں گے نہ اٹھیں گے نہ اٹھیں گے کبھی
ایک سے قبل تہاں خانہ سے
گھنٹوں گھنٹوں ہیں یونہی عمر گذر جائے گی

کتنی جلدی یہ گزر جاتے ہیں دن
آہ یہ دن
آئیے ان کو ذرا جوڑ تو لیں
ہاں تو منگل سے چلیں
جیسے منگل سے ہو بدھ

بدھ سے جمعرات و جمعہ
ختم ہو جائے سنیچر تو پھر اتوار آ کے
اب یہ دو شنبہ کو کیوں چھوڑ دوں یک و تنہا
لیجئے لیجئے پھر آ گیا بڈھوا منگل
نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڈھوا منگل
اور مری عمر کا ایک ہفتہ ہوا ختم آخر

ہاں اسی طرح مہینے بھی گزر جائیں گے
آئے گا پہلے نومبر
تو دسمبر ہی کے بعد
جنوری فروری اور مارچ بھی آ جائیں گے
پھر تو اپریل کے بعد آئیں گے مئی، جون و جولائی
ہے اگست، اور ستمبر کے قریب اکتوبر
لیجئے آنکھ جھپکتے میں ہوا سال تمام

آپ کے جسم کی ساخت اور غذا و افکار
دیکھ کر اُن کو نتیجہ یہ نکل آتا ہے
آپ کی عمر بہت تھوڑی ہے
حد سے حد آپ کو رہنا ہے یہاں ساٹھ برس
آئیے جوڑ کے دس دس کو بڑھیں ساٹھ کی سمت
سنئے اور غور سے سنئے یہ ہنسی کھیل نہیں
ایک سے دس ہوئے

اور دس میں ملا کر دس بیس
بیس سے تیس ہوئے
تیس سے چالیس و پچاس
لیجئے ساٹھ کی منزل آ ئی
چھوڑ ئیے عمر کی للٹر مسافر گاڑی
آ گیا آپ کا وہ اسٹیشن
جس جگہ تک کا ٹکٹ آپ نے لے رکھا تھا
دوست و احباب ملازم بھی کوئی ساتھ نہ تھا
آپ اسباب نہ لائے تھے نہ لیجائیں گے
ہاں تو بس چلئے ذرا
راستہ ایک زمین دوز مکان تک ہے گیا
نام ہے اس کا لحد

ہاں تو یہ عرض ہے کرنا مجھکو
دفن ہی مجھکو خدا کے لئے چل کر کر دو
پر ہے کپڑے کا سوال
کیسا کپڑا ہے گراں
میں سمجھ آ ہ نہ لینا یہی گاڑھا لینا
ورنہ بہتر تو ہے معیاری ہی کپڑا لے لو
جس کو سرکار نے ہے چالو کیا
اور بازار میں ہے آ بھی گیا
میرے کفنانے کو دفنانے کو

ہاں مگر سب سے کٹھن چیز رہی جاتی ہے
ریزگاری کا سوال
کیسا بیڈھب ہے سوال
روپیہ تم کو تڑانے میں اگر زحمت ہو
پھر تو رہنے دو کفن
گور میں مجھ کو یونہی تم رکھ دو
بس اسی طرح سے جس طرح پہ آیا تھا یہاں

پر مجھے گور میں تم ہاتھ سے اپنے رکھنا
میری میت کو مری آہ مری میت کو
اور اس جسم کو جو گھل کے محبت میں تری
بن گیا ہے محض ہڈی کی لڑی
تاکہ تم پر مرے بعد
بے وفائی کا نہ الزام آئے
اور اگر لوگ کہیں بھی تو زمانہ کو کہیں

اور آ آ کے لحد پہ میری
گائیں اور گا کے یہی شعر پڑھیں
سو گئی عمر مری موت کی کروٹ لے کر
اور کسی جاگنے والے سے جگایا نہ گیا
اور پھر خوب ہنسیں
"ساٹھ پل ایک سکنڈ، ایک سکنڈ ساٹھ منٹ"

ڈیوڑھی کے آگے

ایک یلغار ہے فتنوں پہ سوار
ایک آزار ہے سینہ کا اُبھار
ایک میلا ہے کہ لگتا ہی چلا جاتا ہے
ایک ریلا ہے کہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے
اِس میں راحت نہ سہی جوشِ عقیدت ہی سہی
دیکھتا دیکھتا کلیا سے نکل جائے گا

فائدہ ہو کہ نہ ہو
کپکپاتے ہوئے کس طرح نکل بھاگے ہیں
ٹیڑیاں جیسے پہاڑوں سے نکل بھاگتی ہیں
اس طرح مشق ہے نظروں کی مرے چہرہ پہ
جس طرح دھار کسی بمبے کی
کھول دینے پہ پڑے سنگِ گراں پر پیہم
نل کے نیچے جسے لا رکھا ہو
گنگا جمنی ترے رخساروں پہ
کرتے رہتے ہیں نظر سے صیقل
سیکڑوں پیر و جواں
سامنے آ آ کے مری ڈیوڑھی پہ
اس بری طرح جبینوں کو رگڑتے ہیں یہاں

جیسے بادام کو لے کر کوئی سل پر رگڑے
اور اس طرح محبت میں وہ سر دھنتے ہیں
جیسے چاندی کے ورق کوٹ رہا ہو کوئی
چڑیا تو جین میں ہی جاں
اک انار اور وہاں صد بیمار
اُن میں تقسیم مری کیسے ہو
میں تو مٹ جاؤں گی
پس جاؤں گی
گھس جاؤں گی
اِتنے عشاق میں اک جانِ حزیں
بندی بے عقل نہیں
ان نگوڑوں کو یونہی مرنے دو
آستانے پہ پڑا سڑنے دو
خود چلے جائیں گے جب دھوپ کی تیزی ہوگی
چیل چھوڑے گی جب انڈا تو پگھل جائے گی
ان کے ارمانوں کی پوٹلی جو چھپی ہے دل میں
ایک یلغار رہے فتنوں پہ سوار

فٹ نوٹ: مجموعہ جالندھری کے رنگ میں جو طنزیہ نظمیں ہیں ان میں سے بعض میں آگے اوپر نیچے کے مصرعوں میں تقاضا رہے گا مثلاً "بیتے زمانہ کی یاد" میں شلوار کے ساتھ ساری کا ذکر آ گیا مگر ایسا عمداً کیا گیا ہے ورنہ ساری کی جگہ دوپٹہ آسانی سے اسی بحر میں نظم ہو سکتا تھا مگر مجید صاحب کی نظم "تضاد" میں کوٹ پتلون اور سوٹ کے ساتھ گیا تو اور شکالی وغیرہ کا بھی ذکر ہے چنانچہ اسی رعایت سے یہاں "شلوار" کے ساتھ ساری کا ذکر کیا گیا ہے۔

ترنم

کھوئی کھوئی سی فضا میں فٹ فٹ
ہو نہ ہو یہ ہے بٹیر
کتنی اونچے پہ ہے سرگرم ستیز
نہیں معلوم کہاں جاتی ہے
اب چڑیا ریکھڑا ہی لیں گے

کاؤں۔ کاؤں کی پھر آوازِ حزیں آتی ہے
یہ ہے کوّے کی صدا
کل مری بچّی سے یہ چھین کے بسکٹ دن میں
کیسی پھرتی سے نکل بھاگا تھا

ٹن ٹناٹن ٹن ٹنن
یہ ہے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی
ریڈیو والوں کا ٹیلیفون ہے
چاہتے ہیں جو کوئی آزاد نظم
اور کھٹکھٹاتے ہیں مجھے
تاکہ میں اک بے تکی سی نظم فوراً جھاڑ دوں
اور اُسے جب ریڈیو جاکر پڑھوں

چیخ اٹھیں سب کے سب رجعت پسند
ریڈیو میں آہ یہ بھونچال کیسے آ گیا
اور جب آخر میں، ہوا اعلان میرے نام کا
تب وہ سمجھیں پڑھ رہا تھا مجھ سا شاعر ایک نظم
لاشعوری جس میں تھے جذبات سب
جیسے اک دیوار سبز
طوطیا جیسے ہیرا
یہ تو ہے آزاد نظم
جو برائے زندگی لائی گئی ہے کھینچکر
اس دیس میں

نوٹ:۔ مذکورہ بالا نظم بحروں کا اتار چڑھاؤ ملاحظہ ہو جو گمراہ ترقی پسندوں کے یہاں عام ہے۔

میراجی

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

میراجی

موجودہ ترقی پسند شعرا میں میراجی ایک خاص رنگ کے مالک ہیں۔ انکے کلام میں ایک جاذبیت اور کشش ہے جو دوسرے "ترقی پسند شعراء" کے یہاں مفقود ہے اور کسی کے یہاں اگر خال خال نظر بھی آتی ہے تو میراجی کو منہ چڑھاتی معلوم ہوتی ہے۔ ان کا کلام پڑھنے کے بعد انسان یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اگر اس جنم میں میراجی اتنے بڑے شاعر نہ ہوتے تو مجذوب ضرور ہوتے۔ بہر حال وہ "ترقی پسند شاعر" ہیں، ایک شاعر کا سب سے بڑا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر اس کے کسی شعر کی نثر کی جائے تو سوا ان الفاظ کے جن میں اس نے وہ شعر کہا ہے نثر میں دوسرے الفاظ نہ ملیں میراجی کے یہاں یہی چیز ہے جو ان کو "ترقی پسند شعراء" میں ایک ممتاز درجہ عطا کرتی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ میراجی کے کلام میں مجذوبیت کی جھلک نمایاں ہے اور پڑھنے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک مجذوب اپنی دُھن میں وہ باتیں کہہ رہا ہے جو عام انسانی عقل سے بالا اور برتر ہیں ان کا کلام پڑھ کر اُس دلچسپ واقعہ کی تصدیق بھی ہوتی ہے جو ہمارے ایک دوست نے میراجی کے بارے میں بیان کیا۔ ان کی شاعری کا پس منظر غالباً یہی ایک درخشاں واقعہ ہے، درخشاں ان معنوں میں کہ اسی ایک واقعہ نے میراجی کو میراجی بنا دیا۔ اور ان کا پورا کلام یکسر اسی ایک واقعہ سے متاثر نظر آتا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ میراجی اپنے محلہ کے اسکول میں پڑھتے تھے ایک روز جب وہ اسکول سے گھر واپس آرہے تھے تو راستہ میں ان کو ایک مجذوب دکھائی پڑا۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ اُس وقت میراجی کے علاوہ

گرد و پیش اور کوئی دوسرا شخص موجود نہ تھا جس کے منہ سے مندرجہ ذیل فقرے نکل رہے تھے۔

"خواب کی سیج پر گلابی چوڑیوں کی ٹُنک کھنکار تیرے نغموں کا ساز بجا رہی تھی چیخوں کے شعلوں میں مجھے تیری گلابی ساڑھی کا رسیلا دامن دکھائی دیا طبیعت کے اُبال نے تیرے مہندی بھرے ہاتھوں پر چراغ کی غمگین روشنی میں اسطرح مست نغمے گائے جیسے طوفان میں آسمان سے کوئی ستارہ ٹوٹ پڑے۔ ہولے ہولے بھاگنے والے شرمائے لجائے سائے شام کے جھٹپٹے کی آڑ میں دم لینے کو رک گئے ویران گذرگاہیں سامنے آ کر سنہرے دھندلکے میں دفن ہونے لگیں۔ کوا درخت کی آڑ میں ڈال پر اپنی نقرئی آوازیں کاؤں کاؤں کرنے لگا۔ مخمور دنیا کے سوئے ہوئے گرگٹ جاگ اٹھے۔ میں تیرے نہاں خانوں کے سامنے ویران محل کی چوکھٹ پر ہاتھ کے بل روندتے اور لرزتے نقش و نگار کی روشنی میں تیری ساونی لٹو نگی آڑ میں اسطرح چھپ گیا جیسے گھٹائیں بادلوں کی چھاتی میں بجلی کی چمک سے خون زدہ ہو کر لپیٹ جاتی ہیں۔ ڈال پر رنگ بدلتے ہوئے گرگٹ انھیں بیکس ایوانوں میں لیٹا دیکھ کر اس طرح جھجک گئے جیسے کوا چپ چاپ راہ تکتا ہوا دکھائی دے اور اس کی بھولی ہوئی یاد شرمائے ہوئے قلب کو گرمانے لگی اور شبنمی بوندوں کی پھواروں میں میری ابلتی ہوئی چشم نمناک یاد کے دامن میں بوسیدہ نظر آتے آتے اڑتے ہوئے طائر کی طرح جھولتی ٹہنی سے لپٹی ہوئی منظر بوسیدہ پر گر پڑی اور کچھ نئے نقوش اس طرح ابھر آئے جیسے گرگٹ کی پیٹھ پر کوئی غمگین مکھی بیٹھ کر ایک رات بسیرا لے لے یا کوئی اندھی آندھی کسی بوسیدہ منظر کا پیچھا کرتی دور تک نکل جائے۔ بچھڑے ہوئے احباب کی یاد اس کے دل میں اس طرح گدگدی کرنے لگی جس طرح رہ گزر پر سانپ رہی ہو۔ یا سوز محبت

کا جنازہ نکل رہا ہو۔ بھٹکا ہوا نور یاد کے دامن پہ اڑتے ہوئے سایہ کی طرح تھکا ماندہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے فردا کے خواب دیکھ رہا تھا۔ عزازیل کے کتو نکی نقرئی پھونک سے سارا منظر خاموش جاگ اٹھا۔ تارے ہوئے ذرے فضا میں پرواز کرنے لگے۔ آزردہ تارے چہک اٹھے دمکتا ہوا چاند کھلا گیا۔ کاسہ دریوزگری کو نیند آگئی۔ بچھڑا تخیل اونگھ گیا ساز کے پیچ و خم سربسجود ہو گئے نغمے کا نشہ حیات پر مچلنے لگے۔ سائے کانپ اٹھے، دکھ کے آنسو رو پڑے شبستان فرانس محو حیرت ہو گئی چنگیزی ہاتھ ہنس پڑے۔ فضا برہنہ ہو کر در زیست کو بار بار کھولتی ہوئی نکل بھاگی۔ کنڈلی باہیں اپنی چشم نمناک سے اشارے کرتی فضا کی ترنم خیز گونجوں میں اس طرح چھپنے لگیں جیسے محبت کی آنکھ میں خمخانۂ حیات کا بجھتا ہوا چراغ اپنی آخری روشنی دے کر گل ہو جائے۔ حیات کی بدحواس موجیں گھبرا کر ساحلِ زیست کے بوسے لینے لگیں۔

یہ تھا غالباً زندگی کا وہ درخشاں "حادثہ" جس نے میراجی کو شاعر بنا دیا۔

رخصت

ہاں بہت دور تھا لیکن اکثر
سوچتے سوچتے ہی راستہ کٹ جاتا تھا
شہر کے قرب و جوار
گویا ایک آنکھ جھپکنے میں نہاں ہوتے تھے
سامنے مجھکو نظر آتا تھا
ایک ویران محل
یونہی بے دھیانی میں چوکھٹ بھی نکل جاتی تھی
وہی چوکھٹ جسے لکھوں یا دُن
ہاتھ کے بل پہ ہمیشہ چھپ کر
روندتے روندتے اس حال پہ لے آئے تھے
ٹوٹے دروازے کے سب نقش و نگار
کچھ تو بوسیدہ تھے اور باقی مری آنکھوں کو
اتفاقاً ہی نظر آئے تھے

جیسے چلتے ہوئے ـــــــ رستے میں پھسل کر کوئی
بے چلے راہ سے کچھ دور نکل آتا ہے
میں بھی دروازے سے چوکھٹ سے گزر جاتا تھا
جیسے ساون میں کسی ڈال پہ کوئی گرگٹ
دیکھتے دیکھتے میں رنگ بدل جاتا ہے
ایسا ہی وقت میں اک لمحے میں

یونہی ایوان بھی لیٹا ہوا بیٹھا ہوا استادہ نظر آتا تھا
راہ تکتے ہوئے، چپ چاپ ــــ نگاہیں اُس کی
مجھکو بے رنگ جھروکوں نے نکلتی کوئی کرنوں کی طرح
بھولی یادوں سے ملا دیتی تھیں ــــ
بھولی یادیں جو پھیلتے ہوئے ملبوس کی مانند نئی باتوں کو لے آتی ہیں
کبھی للچاتی ہوئی اور کبھی شرماتے ہوئے قلب کو گرماتی ہوئی
آپ ہی آپ میں بہتے ہوئے دھارے کی طرح
اپنے پاؤں کو بڑھا لیتا تھا
آپ ہی آپ میں رستی ہوئی بوندوں کی طرح
سوچتے سوچتے رک جاتا تھا
آپ ہی آپ اُبلتی ہوئی چشم نمناک
یا دامن بوسیدہ سے
خشک ہونے کے لئے پل کو لپٹ جاتی تھی
آپ ہی آپ سے اڑتے ہوئے طائر کی طرح
بہتے بہتے کسی ٹہنی پہ بسیرہ کرکے
جھولتی ٹہنی سے لپٹی ہوئی پھیلی ہوئی بے جان زمین کے اوپر
اپنی ہستی کو گرا دیتا تھا
اور گرتے ہی نظر آتا تھا
ایک ویران محل
جس کی چوکھٹ کو مرے ہاتھوں کے ناخن ہردم
چھیلنے کے لئے بیتاب رہا کرتے ہیں

جیسے یوں چھیلنے سے منظر بوسیدہ پر
کچھ نئے نقش ابھر آئیں گے
اب سمجھتا ہوں کہ یوں بات نہیں بنتی ہے
آپ ہی آپ کوئی بات کبھی بن بھی سکی؟
آپ ہی آپ کلی کھلتی ہے
اس کی صورت ہی بگڑ جاتی ہے
آپ ہی آپ زمین ہلتی ہے
اس کی صورت ہی بگڑ جاتی ہے
آپ ہی آپ گھٹا چھاتی ہے
آسماں صاف نظر آتا ہی نہیں؟
آپ ہی آپ چلی آتی ہے آندھی اندھی
اور پھر منظر بوسیدہ ابھر آتا ہے
آپ ہی آپ کوئی بات کبھی بن بھی سکی
اب سمجھتا ہوں کہ یوں بات نہیں بنتی ہے
آپ ہی آپ سے شرمندہ ہوا کرتا ہوں

میراجی

بعد کی اڑان

چوم ہی لے گا، بڑا آیا کہیں کا، ــــ کوّا
اڑتے اڑتے بھلا دیکھو تو کہاں آ پہنچا
کلموا، کالا کلوٹا، کاجل ــــ
میں اگر مرد نہ ہوتا تو یہ کہتا تجھ سے

دوش پر بکھرے ہوئے ہیں گیسو
بندی دُمدار ستارہ ہی، مگر ساکن ہی
چلتے چلتے کوئی رک جائے اچانک جیسے
غسل خانہ میں نظر آیا تھا انگلی پہ مجھے سُرخ نشاں
وہی دمدار ستارے کی نمائش کا پتہ دیتا تھا
آپ ناپید ہوا ہے مگر اپنے پیچھے
کسی نقشِ کفِ پا کی صورت
رات کے راستے میں چھوڑ گیا ہے وہ کہانی جس کو
سُننے والا یہ کہے گا مجھ سے
گیت میں ایسی لرزتی ہوئی اک تان کی حاجت ہی نہ تھی

ایسی ہی ایک لرزتی ہوئی تان آئی تھی
جب پھسلتے ہوئے ملبوس لرزتے ہوئے جا پہنچے تھے

فرش پر ایک مسہری کے کٹہرے پہ ہوا آویزاں
"چھوڑ دو، رہنے دو، اس کو تو یہیں رہنے دو"
نیم وا آنکھوں کو پھر بند کیا تھا اس نے
ہاتھ بھی آنکھوں سے پردوں پہ رکھے تھے یک دم
اور اب ایک ہی پل میں یہ اگر کھل جائیں
یہی آنکھیں جو مجھے دیکھ نہیں سکتی تھیں
دیکھے دیکھیں مجھے ——— ہاتھ کہاں رکھیں گی؟
وہیں رکھیں گی ——— وہی ایک نشان منزل
جس جگہ آ کے ازل اور ابد ایک ہوئے تھے دونوں
ایک ہی لمحہ بنے تھے مل کر
اسی لمحے میں یہ بندی مجھے دمدار ستارہ سا نظر آئی تھی
رات کے راستے میں چھوڑ گئی تھی وہ کہانی جس کو
سننے والا یہ کہے گا مجھ سے
گیت میں ایسی لرزتی ہوئی اک تان کی حاجت ہی نہ تھی
اب لرزتے ہوئے ملبوس نظر آتے نہیں ہیں لیکن
ان کی آنکھوں کو ضرورت بھی نہیں
وہ تو اک رات کے طوفان کا اعجاز تھا، طوفان مٹا
کیسا طوفان تھا! ——— اندھا طوفان
جس کے تھمنے پہ مجھے نوح کی یاد آئی ہے
اور پھر نوح نے بیٹوں سے کہا
کھول دو پنجرا اسے چھوڑ دو، ——— اس فاختہ کو

جاکے خشکی کا پتہ لے آئے
چند ہی لمحوں میں وہ فاختہ لوٹ آئی، مگر ناکامی
اس کی قسمت میں لکھی تھی
اور پھر کوّے کو چھوڑا یہی خشکی کا پتہ لائے گا
اڑتے اڑتے پھیلاؤ دیکھو تو کہاں آ پہونچا
چھم ہی لے گا بڑا آیا کہیں کا کوّا
کلموا، کالا کلوٹا کاجل

میرا جی

افتادہ

(میراجی کی نظم "افتاد" سے متاثر ہوکر)

سیکڑوں دانوں کو چہرہ میں لگائے ہوئے افتادہ ہے تخریب کا اک کوہِ نحیف
اپنی بندیا کے قریب
مجھ کو لگتا ہے عجیب
اک بگولہ کا دھواں دھار جواں ہے گویا
میرے کانوں میں بہت دور سے ریں ریں کی صدا آتی ہے
سائیکل یہ تو نہیں ؟
چُوں چُوں کرتی ہی چلی جاتی ہے، بیداری و فریاد کا ہے نقش دراز
اس میں اک روگ ہے جو روگ کہ مٹتا ہی نہیں، لاکھ دکھلایا اِسے لوگوں کو
میری ٹانگوں میں ہے رخشندہ حزیں گیت کی لے افتادہ
ایک ہی عکسِ دراز
خواب اور خون میں لتھڑا ہوا استادہ ہے پھرتے ہوئے ایوانوں میں
ساحلِ زیست کا عکس
اور کاندھے پہ جنازوں کے رواں کوسوں تک
اِسمیں ہستی کی گذرگاہ کا ایک سُرخ نشاں ہے مضمر
پائیڈل ٹوٹ چکے ہیں جس کے
اور مڈگارڈ سے آواز حزیں آنے دو
خود سے یہ ہو کے درست آپ ہی چل نکلے گا
اِس کو کیچڑ میں ذرا دیر پڑا رہنے دو

اور پھر گھانس میں اک برق کے مانند اسے دوڑا کر
ٹیوب بدلوں گا تو پھٹ جائے گا
شب کے سناٹے میں آوازِ مہیب آئی جو اِن کانوں میں
میں یہ سمجھا کوئی پنچر ہوگا
وہ تھا برسٹ
کتنا بڑا
اُس کی وسعت کا نہ اندازہ شبستانِ چمن نے بھی کیا
کلموا، کالا کلوٹا سا برسٹ
اب اگر پھر کبھی اس طرح یہ چلتے میں ہوا
لیکے ڈبیا میں سلوشن کی تجھے جوڑ ہی ڈالوں گا وہیں
پھر نہ کہنا کہ مرا منہ ہوا بند اور ہوا صحرا کی
بھر گئے کانوں میں جس سے کہ زکام اور سردی
بام پر چپکے کھڑے دیکھ رہے ہیں منظر
اور میں اپنے پسینہ میں نہایا ہوا افتادہ پڑا
ایک دہلیز کے شانوں پہ سوار
جیسے تعمیر کا اک نقشِ عجیب
ڈوبتے ڈوبتے بہہ نکلے گا
اس کا بہنا ہی بُرا
خیر نکل جائے گا
اپنی مرجھائی ہوئی کھال کے خمخانہ سے

بات کی اُڑان

(میراجی کی نظم "بعد کی اُڑان" سے متاثر ہو کر)

مجھ کو پکڑے ہی لئے جاتا ہے کاشانۂ ہستی کے قریب اک گھر میں
اجنبی چور سا بھٹکا ہوا اک نقشِ حزیں
اور اک سوئے ہوئے خواب کی روٹھی ہوئی تعبیر کے پاس
اڑتے اڑتے تیرے گہوارے میں رک جائے گا
جس پہ بیٹھی ہوئی اک فاختۂ غمگین اُداس
یا کہ گزرے ہوئے رنگین فسانوں کی کتاب
جس میں بھولا سا تبسم ہی نہاں خوف سے انگاروں کے
اور عزازیل کے کتوں پہ کھڑا ہنستا ہے
جھٹپٹے وقت کے سایوں کی طرح
کوہ کا راز جیسے موت کے سناٹے ہیں
اک طربناک ہنسی ڈھونڈ رہی جس کو
تیرے کوچے کے زمیں دوز مکانوں کی بغل میں اک پھول
خشک و نمناک سا پھول
روٹھنا جن کو ازل سے ہو ابد تک ترے سوئے ہوئے رخساروں پہ
اور اس سوز میں ڈھل جائے گا وہ دھرتیاں
اور اڑتے ہوئے بادل کی جلو میں سرِ راہ
ڈوبتے رہتے ہیں

مژگاں سکے چراغ
اور جھلک اپنی دکھا کر وہ بدل دیں گے امنگوں کی حسیں لہروں کو
تیز سرشار سے سائے تری چتون کے قریب
بڑھ نہ جائے کہیں میخوار کی آنکھوں میں دھواں
اک لرزتی ہوئی دیوار کے سایہ کے تلے
اس کو جبرئیل کی پرواز میں ڈھونڈ
ڈوبنے لگتے ہیں آشفتہ شفق میں وہ جنوں خیز جوانی کے نشاں آٹھ پہر
جو ابھرتے ہوئے بگلوں کی قطاروں کی طرح
شام کو جاتے ہیں مغرب کے سلگتے ہوئے. دھندلے سے دھوئیں کی زد میں
اپنے انجام سے ہیں بے پروا
اور اگر کوئی شکاری نے بغل سے اک تیر
کر دیا اپنے تو گر جائیں گے تالاب کی گھبرائی ہوئی موجوں میں
اور آنکھوں میں گزرگاہ کے وہ نقش ابھر آئیں گے
جن کو سینہ میں لئے جاتا تھا سیلاب ادھر
جس طرف سے یہ ادھر اڑ کے چلے جاتے تھے
اور یہی گاتے تھے
مجھکو پکڑے ہی لئے جاتا ہے کاشانۂ ہستی کے قریب اک گھر میں

روح کا بوجھ!

زندگی ایک بیل کے مانند
روح جس پر سوار ہے ہر دم
بے اصولی ہے جس کی گھٹی میں
چاکری جس کے دابتی ہے پاؤں
دھانی دھانی مسرتوں کا چراغ
جھومتا جھومتا سلگتا ہے
جو رجس کی ذہانتوں پہ ہنسیں
کھال موٹی سی نور کی پیٹی
اور حلقہ بگوش دست دراز
کان اس طرح سے اینٹھے گا
جیسے پیسے کی گوشمالی پر
دھار پانی کی ایک بہہ نکلے
اور پھر چاندنی کی سرخ نظر
جسم کی زندگی بڑھائے ہوئے
اور محکومیوں کے انگارے
اس طرح مجھ پہ ہنستے رہتے ہیں
جیسے احساس کشمکش کا تناؤ
اور نادان پھول سی دیوار

بعض ٹیڑھی رگوں پہ جسکی نہاد
میرے جذبات کو کچلتی ہیں
شفق گرم کے دھندلکے میں
ایک نفرت بدوش عیّاری
ایک خلوت نواز تہہ خانہ
ایک تلخی زدہ سا سنّاٹا
عزم جس کا جھکا ہوا غم سے
جیسے ہو ایک ڈیڑھ خما حقّہ
اپنے کندھوں پہ اک چلم لادے
جیسے گرگٹ کی پارسائی پر
چھپکلی کی اداس اداس نظر
جسکی غمناک چیخ سے ڈر کر
چھپ رہوں ڈھیر میں جوانی کے
جسطرح ڈر کے شیر خوار کوئی
ماں کی چھاتی کو بھینچ لیتا ہے
اور نوخیز ولولوں کی پھوار
میرے سینہ کے جرم پر رقصاں
دل میں اک رند میکدہ بردوش
پی کے مئے زندگی پہ ہنستا ہو؟
زندگی ایک بیل کے مانند

ناکارہ

(میراجی کی نظم "حرامی" سے متاثر ہو کر)

ترے جذبات کے کندھوں پہ ہے رکھی ہوئی اک برف کی سل
جسکی ناکردہ گناہی کا پتہ بھی نہ لگائے سے لگا
اسی ٹھنڈک سے تو رگ رگ تری ناکارہ ہے
جیسے مفلوج لگا ہوں میں محبت کا خمار
ایک بے رونق مشین
صنفِ نازک کے لئے تو ہے نکمّا پھر بھی
تالیاں ٹھوک کے اٹھ بیٹھ کے پا جاتا ہے
کچھ نہ کچھ اپنے ہی کھانے بھر کا
ایک بد گوش —— کمینہ بد گوش
نسلِ معصوم سے چمگادڑ سے
عمر کے ساتھ لٹک آیا ہے
کیسا بے کیف، کلوٹا کالا
کھیلتا، بولتا، ہنستا بھی نہیں
جیسے دالان کا ٹوٹا چھجّا
ایک بے کیف وجود
جیسے گرگٹ کی صدا صحرا میں
لاکھ کوئی اسے جذبات سے تو جبت کرے
پر نہیں تجھ میں سکت

رستہ اب کوئی نکلنے کا نہیں!
کیسی پرکیف ہے خلقت تیری
جیسے شبنم کی تڑپ صحرا میں
جیسے معصوم کلی کی چٹکن
تجھ میں شاہی کے جراثیم سبھی ہیں
چند مخصوص مقامات پہ شاہی تجھے مل سکتی ہے
تیری دوکان وہاں خوب ہی چل سکتی ہے!
قدر داں سیکڑوں مل جائیں گے
سیکڑوں دل ترے دامن پہ مچل جائیں گے
چل اسی دیس میں چل
ہے اگر ساز شکستہ تو کوئی حرج نہیں
وہ تو اک دوسری موسیقی کے دلدادہ ہیں
مارنے مرنے پہ آمادہ ہیں
اس طرح تیری محبت میں وہ جھک جائیں گے
جیسے سگنل کسی اسٹیشن پہ
خیر مقدم کے لئے ریل کے جھک جاتا ہے
تیرے بیٹھے ہیں ہرے
اور ہے آواز میں لوچ
جیسے چیتے کی کمر
تالیاں ٹھونک کے اور باندھ کے نیلی ساری
دادِ نامردگی اس طرح سے لے دنیا سے

جیسے آنلی کوملی سےسلی ہیں
تجھکو مفقود جوانی کی قسم
ترے احسان سے دنیا نہ اٹھائیگی نظر
اک نئی راہ محبت کی دکھائی تونے
دی ہے عورت کو بہت سخت جھکائی تونے
تیرے جذبات کے کندھوں پہ ہے رکھی ہوئی اک برف کی سِل
جسکی ناکردہ گناہی کا پتہ بھی نہ لگائے سے لگا

بیداد

میں تو اک فوج سے ملنے کے لئے آیا ہوں
کم سے کم دس دفعہ کنڈی تو ہلائی ہوگی
کوئی منگلائی مگر آئی نہیں
کیا یہاں کوئی نہیں؟ ——— کوئی نہیں، کوئی نہیں ———؟
اور اکبار ہلالوں کنڈی
چھوڑ دوں سُونی فضاؤں میں میں کھانسی کی صدا؟
رات بھر کھانس کے جس نے تھا کیا فرش غلیظ
ناک منھ جیسے بسورے تھے بہت مہتر نے
فرش کو جھاڑتے وقت
صبح کے سایوں کے سناٹے میں
سوچتا ہوں کہ ٹھہر جاؤں ذرا
کوئی بہکی ہوئی بھڑ
سر کوچہ سے اگر جست کرے
اور دیوار کے چھجوں کو ہنسی آجائے
اور کچھ دیر گذر جائے گی انگڑائی کی گھبرائی ہوئی نظروں میں
میرے ادراک کی پاپوش مچل جائے گی
مگر افسوس تری چشم نظر کے سنتے
مجھکو رہنا ئیں گے اُس کوچہ میں
"راہ تکنا ہی مقدر میں لکھا ہے شائد"

اُسکی دہلیز کے سینے میں ہے کیا رمز نہاں
ایک سویا ہوا رمز
ابھی کھولوں گا تو سب میرے لپٹ جائیں گے
اور میں اُسکی نگاہِ غلط انداز کی بانہوں کے تلے
یوں دبک جاؤں گا ہلتی سی شعاؤں کے نہاں خانوں میں
سُونی دہلیز کو کرتے ہوئے پار
تیری پاپوش سے کمبخت ہمیشہ کے لئے
الوداع الوداع کرتا ہوا معدوم ——— عدم
بند ہوتا ہوا کھلتا ہوا اٹاپے کا حصار
ہاں اسی منظرِ غمناک کی راحت ابتو
میری ہستی کی نگاہوں کے گوداموں میں جھلکتی ہو مدام
داشتہ ہو جائے درزیست کہیں
اور میری، کسی ستم ساز جواں کابک کو
میری پروازِ طربناک نہ دھوکا دیدے
اور سب کھڑکیاں اکدم کھلجائیں
جن سے اڑ جائیں بٹیر
یہی کھیلا کو مرے ماضیٔ خفتہ کے جھروکے میں کبھی تھا
مگر اُس ٹوٹی ہوئی ڈال کے آغوشِ لحد میں لیٹا
جھانکتا جھانکتا دنیا کو چلا جاؤں گا
ایک اہسن کی گرہ ——— ناچتی۔ کودتی اور بل کھاتی
اور سمٹی سی چلی جاتی ہے مرکز کی طرف

گرم بستر پہ تڑپتا ہوا دل بیٹھ گیا
وا ہوا اُس کا جو روزن تو مرے دل نے کہا
پڑ گیا نازنیں دہلیز کا پاؤں
لیٹا تھا اُسپہ مرا حُسنِ طربناک کا معصوم خیال
وا جو دروازہ ہوا کالا سا پھن پھیلائے
اُسکے نتھنوں کے شبستانوں سے تھراتی ہوئی
خوب گرمائی ہوئی ایک فتادہ سی لپک
جس میں پوشیدہ تھا، لرزیدہ تھا اُس مست نظر کا اک داؤ؟
مگر اُس کو جو ٹٹولا تو تھا کوئلہ کالا
اور پھر گونجتی - جھلاتی ہوئی ٹانگ کی آہوں پہ سوار
بند دروازے کا سناٹا، تیرے سامنے کیوں آیا ہے
کچھ عرقناک جبینوں سے لرزتی ہوئی گستاخ نظر
اس کے ماتھے پہ تڑپتی ہوئی بھر نکلی ہے
چت ہوئے جاتے ہیں تحریک کے داؤ؟
پھن کو پھیلائے ہوئے جھومتے لہراتے ہوئے
آنکھ میں دھول پڑی ہے مگر اس منظرِ بدمست کی سمت
اور بوسیدہ ہوا اینٹھی ہے
پھولتے پھولتے پھیل جاتے ہیں
گرم بستر پہ پڑی، بیسوا امید دل سے ہے خشک ہے گردنِ دہلیز حمائل ہو کر
جو کبھی آ جاتے اُسے کام سے کام
اونگھتے اونگھتے بستر پہ پلٹ پڑتے ہیں

اور پھر تیرگی، ہوش کا نادان دماغ
رس بھری مست جوانی کی تمناؤں کا راز
جسم کی کھال تلک کھینچ کے کھا جاتی ہے
اور بوسیدہ فتادہ تختے
چوستے چوستے بڑھتے چلے آتے ہیں
میرے پیروں کی طرف
اپنی رگ رگ میں سموئے ہوئے تقدیر کے پیچ
گویا وحشت کے فسوں ساز جواں
میں بھی اب چیخ کے چلّا کے تڑپ جاؤں گا
بند ہوتے ہوئے کھلتے ہوئے آغوش کے ساحل کے قریب
میں تو اک فوج سے ملنے کو چلا آیا ہوں

چُلبلاہٹ

(میراجی کی نظم "سرسراہٹ" سے متاثر ہو کر)

یہاں ـــــ کی جنبشوں پہ ہاتھ رکھ دوں؟
یہ مچھلی کی طرح دریا کی تہہ میں مجھکو لیجا کر بہا دینگی
وہاں اک موج کے آغوش میں لیٹا ہے دریاؤں کا سنّاٹا
اچانک جاگ اٹھے گا
تو اس کے ہونٹھ لرزاں ہو کے شاید قہقہہ ماریں
میری تخئیل کی سونی گلی کی موڑ پہ جا کر
مرے دل کی نگاہوں کی کمر کو تھام لے بڑھ کر
مگر میں سوچتا ہوں یہ، کہ موجوں کی اُداسی میں، بہے جاتے ہیں دریا کے وہ سنّاٹے جنھیں لہریں
نگاہِ گرم کی رپٹا رہی ہیں ایک مدّت سے۔
پکڑتا ہے عقاب اُن کو تو وہ کیسی جھکائی دے کے انکو بھاگ جاتی ہیں
بڑھا کر رکھ نہ دوں کیوں ہاتھ اُنپر، کہ جنپر زندگی کا ساز نغمہ موت کا گا دے
جھٹک کر ہاتھ میں یوں کھینچ لوں، جیسے عروسِ نو اکیلے میں کہیں پہ ہاتھ رکھدے اور جھجک جائے،
مگر اسطرح رکھنے پر لگیں گے قہقہے ہر سو
بتاؤ تو بھلا دنیا یہ کیسی بھولی بھالی ہے
مگر شب کی بدیسی روشنی میں ان کو گر پا لوں
تو میرا کام بن جائے، مری دنیا بدل جائے، سنبھل جائے، مچل جائے، کسی خلوتِ گمنام میں جا کر
مگر اسکی کمینی ملگجی دہلیز مجھکو مار ڈالیگی، اگر سُن پائے گی میری نگاہِ گرم کے بچن،

مگر چلتے چلاتے انکی آغوشِ تمنا میں ٹھہر کر اور تھم تھم کر اُنہیں پر اپنا ہاتھ تو رکھ لوں
جہاں جذبات کی معصومیاں کچھ گنگناتی ہیں
جہاں پرستیاں بے کیفیوں کے گیت گاتی ہیں
ہنساتی ہیں، رلاتی ہیں، رلاتی ہیں، ہنساتی ہیں،
مگر پھر دل میں آتا ہے نکل جاؤں شبستاں سے
بگڑتا اور لڑتا زندگی کی نوحہ خوانی سے
مگر وہ تلملائیں گے، ہنسینگے اور ہنسائیں گے، رُتائیں گے، منائیں گے، اٹھائینگے بٹھائینگے
مگر پھر سوچتا ہوں پوچھ کر اُن سے
وہاں کی جنبشوں پر ہاتھ رکھ لوں؟

مظلومی

(میراجی کی نظم "محرومی" سے متاثر ہو کر)

نوٹ: - اس نظم میں جہاں پہ ایک بریکٹ ختم ہو اس کو ایک مصرع سمجھئے۔

میں کہتا ہوں تم سے، اگر صبح کو بھول کر بھی، کبھی سائیکل کی دوکاں کی طرف سے نکلنا،
تو زنجیر کو جھٹ واہی لینا، اگر ہو گیا ہو تو اس پہ تعجب نہیں ہے نہ ہو گا)
ہمیشہ اسی رنگ میں چل رہی ہے، مقابل میں سب کی جواں سائیکلوں کے)
اترتے ہوئے اور چڑھتے ہوئے، مچلتے ہوئے اور لچکتے ہوئے، پھدکتا چلا جا رہا ہوں)
اِدھر آؤ یہ تیلیاں، تم نے دیکھی نہیں ہیں، کہ جو زنگ سارے بدن پر لگائے ہوئے ہیں)
جہاں سیٹ تھی اب وہاں اک خلا ہے، مگر اسمیں اب لا کے چمڑا ابھرا ہے، کہ جس کو
نہیں اب کوئی دیکھ سکتا)
ٹٹولو نہ اس کو ـــــ جہاں پر لگی تھی کبھی ایک گھنٹی، ہر آواز جسکی چھپائے
ہوئے تھی غضبناک طوفان)
اسی کھڑکھڑاہٹ کے پیچھے سے، آہستہ بیٹھا ہوا، اور ڈرتا ہوا، چور سا میں چلا جا رہا تھا
بڑے زور سے کہہ رہا تھا ـــــ "ہم آئے ـــــ ہم آئے")
مگر آنکھ جھپکی تو دیکھا یہ میں نے، کہ میں لڑ گیا ہوں کسی سائیکل سے)
ہجوم اک قرینے سے گھیرے کھڑا تھا)
میں کہتا تھا دل میں ـــــ چلو بھاگ نکلیں سپاہی مگر ہاتھ پکڑے ہوئے تھا
پسینے پسینے ہوا جا رہا تھا)
پسینہ کو آخر ترس آ گیا، میرے گھر پہ گیا اور وہاں جا کے بھائی کو لایا، جہاں میں کھڑا کپکپاتا تھا)

تمھیں اس کا احساس کا ہے کو ہو گا، یہ ذمہ ہے میرا
شروع سے سلوک ایسا اِن سائیکلوں سے، رہا ہے پولیس کا، کہ جنمیں بریک ہوں نہ ہو کوئی گھنٹی
جو لڑ جائے جھونکے سے ٹکرا کے کوئی، تو اس کو پتہ بھی نہ ہو گا)
میں کہتا ہوں تم سے اگر صبح کو بھول کر بھی کبھی سائکل کی دوکاں کی طرف سے نکلنا،
تو پنچر کو جڑوا ہی لینا، اگر ہو گیا ہو تو اس پر تعجب نہیں ہو نہ ہو گا)
ہمیشہ اِسی رنگ میں چل رہی ہے، مقابل ہیں سب کی جواں سائیکلوں کے)
یہ چالان کروا لی رہتی ہے میرا، اور کہتی ہے مجھ سے، ـــــ کہ جاؤ اگر تم اسی طرح
رکھو گے مجھکو، تو ہر لمحہ چالان ہو گا تمھارا، جو گزرو گے تم دوش پر بیٹھکر، تو پاؤ گے
اپنے کو اُس دم اکیلا)
بلا لیمپ کے دائیں بائیں، تمھیں کچھ دکھائی نہ دیگا، سڑک کی سیاہی، تمھاری حماقت
پہ ہنستی رہے گی،)
مگر ڈھال پر رفتہ رفتہ، میرے دونوں پہیوں کی گردش کے مانند، تمھیں دور کی بات
معلوم ہونے لگے گی)
دھندلکے میں میرے فری ویل کی ـــــ آنکھ کھل جائے گی)
ایک تانگہ چلا جا رہا تھا)
مگر اس سڑک کی سطح پر، کوئی بھولا بھٹکا بھی تانگہ نہ ہو گا)
اور اک دم شکستہ، فتادہ، میرا ہینڈل ٹوٹ کر، تم کو فرشِ حزیں پر، لڑھکتا ہوا
بھاگ جائے گا پہیہ، کہو یہ تمنا تو میری نہیں ہی)
بس اب اپنی غمناک ٹانگوں سے، پیڈل پہ مت زور دینا)
میں اب جانتی ہوں، کہ میری وجہ سے، تمھارے ہوئے ہیں اندھیرے اُجالے میں چالان،)
میں اب مانتا ہوں کہ جسم حزیں پر، ہزاروں ہیں گرنے کی چوٹیں، کہ جنکی اذیت اکثر

میں رُو رُو دیا ہوں (
بلا لیمپ کے دائیں، بائیں، تمھیں کچھ دکھائی نہ دیگا سڑک پہ، سیاہی تمھاری حماقت
پہ ہنستی رہے گی (
میں اب جانتا ہوں، کہ مینے پولیس چوکیوں میں، سویرے سے تا شام، معصوم حالت
میں دیکھا ہے اپنے کو لیکن، وہاں کا مزہ ایسا منہ کو لگتا تھا، کہ ہر بار ہمراہ ہو پڑے
گیا ہوں، (
وہاں جھڑکیوں، گُھرکیوں کے علاوہ، بہت کچھ مجھے گھر سے دنیا پڑا ہے (
جیسے سو چکر اب، مسہری کے معصوم باندھوں کے اوپر، مجھے خواب آتا نہیں ہے (
——— میں کانوں سے بیداریوں میں ابھی تک، سنا کرتا ہوں گونج ان جھڑکیوں کی
——— سفید اور دہانی گلابی وہ ڈانٹیں، جسے سُن کے کہنا ہوا اب تلک
بھاگتا ہوں، کہ آہٹ سپاہی کی یہ تو نہیں ہے (
مجھے گوشہ گوشہ سے گھر کے پولیس کی، انہی جھڑکیوں کی صدا آرہی ہی (
میں کہتا ہوں تم سے اگر صبح کو بھول کر بھی، کبھی سائیکل کی دکان کی طرف سے نکلنا،
تو پنچر کو جڑوا ہی لینا اگر ہو گیا ہو تو اس پہ تعجب نہیں ہے نہ ہو گا (

کل رات کو!

ان سے انٹرویو مرا ہو ہی گیا
اور پورا ہو گیا
اک اندھیری رات میں
اک درخشاں سوچ میں
سوچ کیسا؟
وہ کہ جس سے پھول جائیں پھیپھڑے شیروں کی بھی
بکروں کی بھی
بھیڑوں کی بھی
سوچتا ہوں ـــــ اب کہ میں
جاؤں کہاں؟
نرسوں کے پاس؟
دائی کے پاس؟
کیا کریں گی دائیاں
اچھا اگر بالفرض وہ
بیٹے دائیوں کے ہو گیا
نام پھر رکھے گا کون؟
آپ یا ہیں
یا کہ ہم سب ایک ساتھ

کیونکہ ہوگا سب کا وہ
نخلِ محبت کا ثمر
کچھ آپ کا۔ کچھ آپ کا۔ کچھ آپ کا
نام بھی گر رکھ لیا
پھر ہوگا کیا؟
میں تو تسبیح اللہ کا قائل نہیں
اور کسی ملّا کا بھی قائل نہیں
کون ملّا؟
زندگی کا جسکے مقصد کچھ نہیں
اور مقصد ہے تو یہ
دن رات ذکر و فکر میں
اوقات کو ضائع کریں
اور مفت کی کھایا کریں
اور دیں اذانوں پر اذاں
جس وقت ہم مشغول ہوں
سب اپنے کارِ خاص میں
کار کیا؟
وہ کہ جس سے دانت میں انگلی دبا لے مولوی
ہاں مولوی
وہ مولوی
جسکی پشتوں میں کوئی

س کیف سے واقف نہیں
اچھا تو پھر میں کیا کروں
کس کو اسے میں سونپ دوں
گھر اپنے اس کو بھیج دوں؟
اچھا تو پھر اب بھیج دوں
اور فکر تو اپنی کروں
آئی، ٹی کالج چلوں
یا گھر میں چل کر پڑ رہوں
اور سو رہوں —— ہاں سو رہوں

بس سو رہوں۔

ایک پہیلی

گرد[1] آلود فضا، کھوئی ہوئی سوئی ہوئی
جھونپڑا[2]، گردشِ افلاک سے سہما سہما
ایک دوشیزہ[3] جو ہے عقل و فراست میں رچی
کر کے سب شادی کا ساماں[4] اُس کی

سو رہے موت کے آغوش میں اُس کے ماں باپ
[illegible] اور [illegible] خدا لڑکی کی کہیں سے اب تک
بات چیت آئی نہیں
زندگی موت بنی جاتی ہے
اُسکے مرجانے پہ سب غیروں کا ہو جائے گا
اُسکے سامان کی فہرست بنا دوں ورنہ
غیر لیجائیں گے، پہچان نہ پائے گا کوئی
ایک سنجیدہ و فہمیدہ دیگ
گدبدی اور ذہین اک لٹیا
شوخ چنچل سی حسیں دو لگنیں

لہ دنیا کے پریشان کن حالات
۲ہ ہندوستان
۳ہ گاندھی جی
۴ہ ہندوستانی لیڈر

بادفا ایک بڑی سی کفگیر
دسپنا ایک نہایت سرکش
مسکراتی ہوئی کچھ تشتریاں
پاندان[5] ایک نہایت منہ پھٹ
جسمیں فٹ جاہل و نادان ڈبیاں
مذہبی اور مسلماں اک سٹ[6]
کیتلی[7] جسکی لڑاکو، خود دار
پیالیاں جسکی کئی جاہ پسند
اک شکردان بڑا صاحب ہوش
خاصدان ایک غریب اور مسکیں
چند مخلص مگر ہٹی کاٹے[8]
اٹھ کے اب خلوت خاموش میں جا بیٹھے ہیں
ایک دیوبندی وضع کا لوٹا
ایک بجنور کا مفلس ہیرا
ایک باغی سا گرانڈیل گلاس
زندہ دل ایک کڑھائی کالی
اک قلمدان نہایت بے باک

---

[5] عطا اللہ شاہ بخاری۔
[6] مسلم لیگ۔
[7] مسٹر جناح۔
[8] مولانا ظفر الملک جیسے لیڈر۔ بقیہ لیڈروں کو پہچانتے کون ہیں۔

یارباش ایک پلنگ
مرتبان ایک نہایت جھکّی
اک کمیونسٹ سلفچی چالاک
اور کچھ رنگ برنگی کپڑے
یہ اثاثہ ہے جسے آہ، لئے بیٹھی ہے
کس قدر ڈھیٹ ہے کیسی دیوانی
ایک ناکتخدا لڑکی کی کہیں سے اب تک
بات چیت آئی نہیں
گرد آلود فضا، کھوئی ہوئی، سوئی ہوئی

رفعت

(میراجی کی نظم "رخصت" سے متاثر ہو کر)

روشنی میں بھی سوجھائی نہیں دیتا اکثر
سوچتے سوچتے پُھننگی میں لٹک جاتا تھا
اور مجھے تھی پکار
کشتی باندھ کے مرگھٹ کو رواں ہوتے تھے
سامنے کچھ نہ نظر آتا تھا
دل کا ویران کھنڈر
بے دھیانی میں چھپر کھٹ بھی نکل جاتی تھی
بھیڑ کے دوش پہ ریلے پہ سوار
کچھ تو غمگین تھے اور باقی مرے ہاتھوں کو
رات دن بوسے دیا کرتے تھے
گھیرتے گھیرتے اُس جال میں لے آئے تھے
روٹھے دروازے کی آنکھوں کے خمار
کچھ تو بد قوق تھے اور باقی مری ٹانگوں میں
مثل افعی کے لپٹ جاتے تھے
جیسے اک آم کے چھلکے پہ پھسل کر کوئی پیر
توڑ کر عمر کے بندھن کو ٹہل جاتا ہے
میں بھی تب ہوش کی منزل سے گذر جاتا تھا
اور اس کی نگہ ناز کا کوئی گرگٹ

میری تخیّل کے کندھوں پہ مچل جاتا تھا
ایک ہی وقت میں برگد کے کسی ٹہنے میں
یونہی طوفان بھی، ہنستا ہوا، روتا ہوا مبہوت نظر آتا تھا
دانت کھولے ہوئے، خاموش سی بانہیں اُس کی
مجھکو تہہ خانہ کے روزن سے گراتی ہوئی لہروں کی طرح
غم کے ڈانڈوں سے ملا دیتی تھیں
بھولی باتیں جو لڑھکتی ہوئی تخیّل کے مانند نئی یادوں کو لے آتی تھیں،
کبھی بل کھاتی ہوئی اور کبھی اٹھلاتی ہوئی، قلب برماتی ہوئی
خواب ہی خواب میں بہتے ہوئے منظر کی طرح
اپنے پنجوں کو ٹکا لیتا تھا
خواب ہی خواب میں رستی ہوئی آہوں کی طرح
کھنچے کھنچے آخر کو سُلگ جاتا تھا
آپ ہی آپ غزالوں کی مچلتی ہوئی چشمِ نمناک
یا کسی ساحلِ رقصندہ سے
وقتِ رخصت کسی گرداب کی ٹانگوں سے لپٹ جاتی تھی
آپ ہی آپ وہ چلتے ہوئے ٹائر کی طرح
ڈرتے ڈرتے کسی کھانچے کا سہارا لیکر
گھومتی ریت سے لپٹی ہوئی جلتی ہوئی برگشتہ جبیں کے اُوپر
نیند کو اپنی سُلا دیتا تھا
اور چلتے ہی نظر آتا تھا
دل کا ویران کھنڈر

اب سمجھتا ہوں کہ وہ یوں نہیں یوں چلتی ہے
لیجئے غین ہوا جاتا ہوں
جسکی دہلیز مرے ہونٹوں کی بانہیں ہر دم
بھینچنے کے لئے بیتاب رہا کرتی تھیں
جیسے بے خوابی میں اک خواب گراں دیدہ پہ
تیرے پنگھٹ کے قریب
اب سمجھتا ہوں کہ کیوں ہاتھ مرے لگ نہ سکی
آپ ہی آپ بنی ہو تو کہوں بن نہ سکی
آپ ہی آپ گھڑی چلتی ہے
اسکی رفتار بھلی لگتی ہے
آپ ہی آپ وہ گھبراتی ہے
اس کا چہرہ نظر آتا ہی نہیں
پھر وہ بذات ادھر آتا ہے
آپ ہی آپ گھڑی چل بھی سکی

ن۔م

راشد

سے

متاثر ہو کر

یہ وہ جتا ہے کہ جس کا نہیں اُلٹا سیدھا

ن ۔م ۔راشد

میراجی کے بعد پنجاب کے دوسرے ترقی پسند اور پیغمبر سخن جناب ن ۔م ۔راشد ہیں ۔آپ نام ہی سے ترقی پسند ہیں جہانتک کلام میں معنی آفرینی کا تعلق ہے آپ میراجی سے کافی متاثر نظر آتے ہیں ۔پنجاب کے بیشتر ترقی پسند شعراء کے "ملکوتی کلام" پر آپ کا اور میراجی کا مقدمہ ضرور رہتا ہے آپ کے مجموعہ پر سرسری نظر ڈالتے ہی انسان "سماج کی گہرائیوں" تک پہونچ جاتا ہے ۔ اور اسکی تہہ میں اسکو "ادب لطیف زندگی" نظر آنے لگتا ہے ۔

"کشّاف" (حبیب احمد قدوائی صاحب) نے "سمک یلداقی" کے متعلق اپنے جن تاثرات کا اظہار کیا تھا، وہ لفظ بہ لفظ بلکہ اُس سے زیادہ جناب ن ۔م ۔راشد پر صادق آتے ہیں ۔چنانچہ اگر آپ ن ۔م کا مطالعہ کرینگے تو "کشّاف" کے الفاظ میں "آپ فنکار کے دُھندلے نقوش اور اُبھری قلم کاریوں کے صنّاعانہ امتزاج تک پہونچ جائینگے آپ کے ہر مصرعہ اور ہر بند میں ایک "نابغیت" (genius) پائی جاتی ہے پوری شاعری برنائی حیات کا خواب بیداری ہے ۔ ابہام کے پردۂ رنگیں میں حقیقت ڈرامائی انداز میں جلوہ گر ہے ۔بنابریں مدرسانہ تنقید سے بالاتر ہے ۔آپکا کلام ماحول کی بےکیفی اور پستی سے ریش ریش ہے ۔کل کلام معنویت سے دست وگریباں نظر آتا ہے" ن ۔م "فرسودہ خیالات وتقلیدی تشبیہات کو فطری پرخلوص اظہار کی قربان گاہ پر چڑھا دیتا ہے ۔اسکی نظموں میں تخلیقی فن کاری کے مثالی نمونے ہیں ۔اسمیں زندگی کی بھرپور تلخی اپنی جھلک دکھا رہی ہے جمالیات حقیقت سے یک دست ہے ۔واقعیت کی کھردری سطح پر رومانی نقوش مرتسم ہیں ۔ اور "جنس" کا ساز جسکے تاروں کی صدائیں

زنگ لگا ہے بجھا ہوا معلوم ہوتا ہے نظم سرتاپا آزاد ہے۔ ردیف و قافیہ کی تنگ دامنی پرخندہ زن، اشاریت و ایمائیت کی قابل قدر تخلیق اُس ذہنی کشاکش کی نشاندھی کرتی ہے جسمیں نئی پود گرفتار ہے۔ ایک کاردان شخصیت کا پتہ دیتی ہے۔ اور عذرا پاؤنڈ اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی نظموں سے حیرت انگیز مماثلت رکھتی ہے اسکو روائتی داد کی حاجت نہیں کیونکہ یہ انتہائے شوق کی ایک مرتعش سی آواز ہے۔

گُناہ

ن م راشد کی ایک نظم "گُناہ" ملاحظہ ہو

آج پھر آ ہی گیا
آج پھر روح پہ وہ چھا ہی گیا
دی مرے گھر پہ شکست آکے مجھے ....
ہوش آیا تو میں دہلیز پہ افتادہ تھا
خاک آلودہ و افسردہ و غمگین و نزار
پارہ پارہ تھے مرے روح کے تار ....
آج وہ آ ہی گیا

روزنِ در سے لرزتے ہوئے دیکھا میں نے
خوّرم و شاد سرِ راہ اُسے جاتے ہوئے
سالہا سال سے مسدود تھا یا راستہ مرا
اپنے ہی بادہ سے لبریز تھا پیمانہ مرا
اسکے لوٹ آنے کا امکان نہ تھا

اس سے ملنے کا بھی ارمان نہ تھا
پھر بھی وہ آ ہی گیا
کون جانے کہ وہ شیطان نہ تھا
بے بسی میرے خداوند کی تھی

یہ ہے "گناہ" جس واقعہ سے متاثر ہو کر پنجاب کے اس ہونہار ترقی پسند شاعر کے دماغ میں یہ "لطیف خیالات" پیدا ہوئے وہ واقعہ بھی سنتے جائیے پھر اُن محاکات کی داد دیجئے جو ہمارے ترقی پسند ادیب نے بے کم و کاست آپکے سامنے پیش کر دئے ہیں، میرا خیال ہے کہ یہ نظم مندرجۂ ذیل واقعہ سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔

کوئی نواب اغن صاحب ایک چھوٹے سے دو منزلہ مکان میں رہتے تھے پوتڑوں کے رئیس تھے۔ ان کے یہاں ایک ملازم فتح محمد نامی تھا نحیف الجثہ مگر دل پھینک، یہ حضرت محلہ کی ہر جوان لڑکی پر بازار جاتے مسمریزم کی مشق کرتے چلتے انھی لڑکیوں میں ایک لڑکی جو کافی قوی ہیکل اور جوان تھی اسیر آپکی توجہ اس قدر بڑھی کہ آپ نے نظری گستاخیوں کے علاوہ جنسی گستاخی بھی کرنا چاہی جسمیں غالباً کوئی زیادہ کامیابی کی صورت نہیں پیدا ہو سکی مگر لڑکی کی بدنامی کافی ہو گئی اُدھر فتح محمد صاحب کو دھڑکا لگا رہا کہ نہ جانے کون آ کر پیٹ دے اور فریقین میں کئی سال تک بول چال اور میل جول ترک رہا اور دونوں ایک دوسرے سے متنفر رہنے لگے لڑکی اس بدنامی کے تلخ گھونٹ کو پی تو گئی لیکن دل میں بات لگی رہی۔

ایک دن جب نواب اغن صاحب کے یہاں کے لوگ کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے لڑکی نواب صاحب کے مکان پہونچی اور اُسنے فتح محمد ملازم کو پکڑ کر

ایسی مرمت کی کہ یہ حضرت بیہوش ہو کر گھر کی دہلیز پر گر پڑے، کپڑے کیچڑ میں لت پت چہرہ افسردہ غمگین و نزار۔ روح پارہ پارہ مگر ہوش آنے پر ایسا معلوم ہوا کہ وہ عورت جوتا تانے سر پر سوار کھڑی ہے بھاگ کر کوٹھے پر آئے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا کہ کھڑی ہے یا چلی گئی بارے یہ دیکھکر بارگاہ ایزدی میں سر بسجود ہو گئے کہ وہ خرّم و شاد سرِ راہ فاتحانہ انداز میں چلی جارہی ہے۔ پچھلے واقعات آنکھوں میں پھر گئے مگر پھر دل نے کہا کہ اتنے سال سے یارانہ ترک ہونے کے بعد وہ کیسے پلٹ پڑی جبکہ اس کے لوٹ آنے اور انتقام لینے کا کوئی امکان باقی نہ تھا اور دیمیں بھی اس واقعہ کے بعد کبھی اس سے ملنے کی خواہش نہیں پیدا ہوئی آخر وہ پھر کیسے آئی کمبخت کیسی شیطان ہے ...... مجھ سے تگڑی نہ ہوئی تو بتا دیتا دوسرے یہ کہ خداوند نعمت نواب اغن صاحب بھی گھر پر موجود نہ تھے جن سے مدد ملتی۔ خیر گذشتہ را صلوٰۃ آئندہ را احتیاط۔

شرابی

(از ن۔ م۔ راشد)

آج پھر جی بھر کے پی آیا ہوں میں
دیکھتے ہی تیری آنکھیں شعلہ ساماں ہو گئیں!
شکر کر اے جاں کہ میں
ہوں درِ افرنگ کا ادنے غلام
صدرِ اعظم یعنی دریوزہ گرِ اعظم نہیں،
ورنہ اک جامِ شرابِ ارغواں
کیا بجھا سکتا تھا میرے سینۂ سوزاں کی آگ؟
غم سے مر جاتی نہ تو
آج پی آتا جو میں
جامِ رنگیں کے بجائے
بے کسوں اور ناتوانوں کا لہو؟
شکر کر اے جاں کہ میں
اور بہتر عیش کے قابل نہیں!

انتقام

(از ن۔ م۔ راشد)

اُس کا چہرہ، اُس کے خد و خال یاد آتے ہیں
اک شبستاں یاد ہے
اک برہنہ جسم آتشداں کے پاس،
فرش پر قالین، قالینوں پہ سیج
دھات اور پتھر کے بُت
گوشۂ دیوار میں ہنستے ہوئے!
اور آتشداں میں انگاروں کا شور
اُن بتوں کی بے حسی پر خشمگیں!
اُجلی اُجلی اونچی دیواروں پر عکس
اُن فرنگی حاکموں کی یادگار
جن کی تلواروں نے رکھا تھا یہاں
سنگِ بنیادِ فرنگ!
اُس کا چہرہ، اُس کے خد و خال یاد آتے ہیں
اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم
میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جس سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام
وہ برہنہ جسم اب تک یاد ہے

دھندلکوں میں کبھی سنّاٹوں میں!

(ن م راشد کی نظم "بیکراں رات کے سنّاٹے میں" سے متاثر ہو کر)

تیرے پہلو میں مری جان کبھی
دھندلکوں میں کبھی سنّاٹوں میں
جوشِ وحشت میں اُبھرتے ہوئے اعضا کے نقوش
اک گراں بار سی لذت میں نہائے ارماں
اور پھر تیری مچلتی ہوئی دلدل کے قریب
میرے ویرانے کا اک نقش چھپا جاتا ہے
ٹھنڈ کے گرم زمستاں کا سفید اک گرگٹ
خوف سے لذتِ موہوم کے افسوں پہ سوار
اک بلندی پہ کھڑا ہنستا ہے
تیرے پرتو کی قسم
بیکراں دن کے دہکتے ہوئے سنّاٹے میں
تیرے پہلو میں مری جان کبھی
آرزوؤں کا پہاڑ
چپکے چپکے کسی حبشی کی طرح رینگتا ہے
ایک لمحے کے لئے دل میں اُجاگر ہو کر
میرے بھٹکے چڑھے ارمان اُبھر آتے ہیں
بلکہ ہنگاموں کے ساحل کی کوئی دوشیزہ

جب درِ زیست سے گھبرا کے بلاتی ہے مجھے
اور سُلاتی ہے مجھے
ایک مدت سے جسے خوابِ نظر کی فطرت
روحِ نرگس کو سبکبار کئے بیٹھی ہے
بے سبب میرا گرہ گیر گریباں کھینچے
ارضِ مشرق کی طرف مجھکو لئے جاتی ہے
میرے بستر کے قریب
دھندلکوں میں کبھی سنّاٹوں میں

ناتمام

(ن م راشد کی نظم "انتقام" سے متاثر ہو کر)

اس کا گھر، اور اسکی رہ گذر یاد آتے ہیں
اک زنانہ جسم ابتک یاد ہے
اور پیٹی کوٹ میں لپٹا بدن
لان پر سبزہ تھا اور سبزہ پہ لان
تھی سہی جاڑوں کی رُت
دیدۂ شلوار پہ ہنستے ہوئے!
اسطبل میں دل کے ارمانوں کا شور
اور کنواری لڑکیوں کی بے حسی پہ خشگیں
جسم کے پوشیدہ گلیاروں میں گُم
اک پرانی عاشقی کی یادگار
تالیوں کے ٹھوکنے پر جنگلے ہنستا ہے جہاں
جنس میں مردوں کے ننگ
اس کا گھر، اور اسکی رہگذار یاد آتے ہیں
ایک پیٹی کوٹ میں لپٹا بدن
اک زنانہ کا بدن
جس کو میں سمجھا تھا کچھ نکلا وہ کچھ
میرے ہونٹوں نے لیا تب رات بھر
جس سے اپنی تشنگی کی بے بسی کا انتقام
وہ زنانہ جسم ابتک یاد ہے!

کبابی

(ن۔م راشد کی نظم "شرابی" سے متاثر ہو کر)

آج میں پتّوں کو چاٹ آیا ہوں
دیکھکر سیخیں مجھے شعلہ بداماں ہو گئیں!
چاٹ کر دوکان کے پتّے تمام
تُسکر کرلے خاکروب
اس حماقت پر کوئی نادم ہو میں نادم نہیں،
ورنہ اک سیخ کبابِ ناتواں
کیا بجھا سکتی تھی میرے پیٹ کی دوزخ کی آگ!
صبح سڑ جاتی نہ وہ
رات کھا جاتا جو میں
سیخ نرگس کی بجائے
ایک سوئی پھیلی والوں کی رہو؟
تُسکر کرلے خاکروب
چاٹ کر دوکان کے پتّے تمام
ایک لقمہ بھی ہضم کرنے کے میں قابل نہیں!

سنترہ کی موت

حسین زندگی کی ایک دھندلی رہگذار میں
کھڑی ہوئی ہیں مستیاں، لباس کے فریب میں
اور ہوسے ہوئے جا رہی ہیں چاندنی کے دوش پر
نگاہِ چشم مست پر غبارِ زندگی کا زنگ
ہے جلترنگ
اُدھر سے آہنی سروں میں آ رہی ہے، بے بسی کی گرم گرم سی ہوا
اسی سڑک کی موڑ پر ہے ایک سنترہ پڑا
مگر کسی کی ٹھوکروں کی زد سے ہے پچک گیا
مسافرِ حیات تھا
اٹھا لو اس غریب کو ——— غریب ہے، غریب ہے، چھوٹا ہوا، لٹا ہوا
غبارِ زندگی سے دور ہے پڑا
غموں سے چور چور ہے
کسی کی جنبشِ نظر نے اِس کو ایسا کر دیا
اِسے نگاہ گرم کے تغافلوں سے ہے گلہ
پڑے پڑے وہ سن رہا ہے زندگی کے قہقہے
اُسی سڑک کی موڑ پر
وہ ہاتھ جس نے توڑ کر گرا یا اس کو باغ سے
بدل دی اُس کی کائنات
اُفق کی ملگجی شفق کا آج رنگ زرد ہے

ہے چشمِ مست غمزدہ میں موتیوں کی چادریں
ہیں اشکِ غم کی چادریں
اور اسکی نرم بھاک میں ہیں رس بھری شکایتیں
کچل کے رکھ دیا جنھیں کسی خرامِ مست نے
اٹھا لو اس غریب کو ——— غریب ہے، غریب ہے
کسی کی ٹھوکروں سے ہے پچک گیا
وہ اُس کے نالہائے غم اِک فضا کے دوش پر
ہوں جیسے غم کی بدلیاں
حسین زندگی کی ایک دھندلی رہگذار میں
کھڑی ہوئی ہیں سِتیاں لباس کے فریب میں

حسن ہے بے بال و پر

پھیل کر بیکراں ہو جائے گی
ایک دن تم دیکھ لینا
اُس تخیل کی ہوس
جو شام کو اُس کے حریم خاص میں
جھانکے ہے اُسکے حسن کو
اور ہو جائے گا افشاں رازِ عشق

ہاں، رازِ عشق
جسکو چھاتی سے لگائے گھومتا رہتا ہوں میں
اِس طرف سے اُس طرف
جیسے بندریا اپنے بچے کو دبائے
باغ میں ڈالی بڈالی

ہر طرف
پھر اگر رسوائیاں
ہوتی رہیں گی اس طرح
تو دیکھ لینا ایک دن
آرزوؤں کے ددوڑے
پھوٹ آئیں گے مرے کُل جسم پر
اُسوقت اک کھجلی زدہ

کتے کی صورت میں مجھے
وہ سر جھکائے دُم دبائے
ہر طرف چھپتا ہوا
بھاگتا، رکتا ہوا
سڑکوں پہ مجھکو پائینگے
اُس وقت حالت پر مری
ٹسوے اگر اُس نے بہائے
اور چشم مست کو
رو رو کے اندھا کر لیا
اور پھر مجھ سے کہا
بیکس کا لکھا میں ہوں
تو یاد رکھئے، حشر تک
ایسا کبھی ممکن نہیں
میں بھی نشتر غمزوں سے تب
ان کو بہت رلواؤں گا
لرزاؤں گا، دہلاؤں گا
جلواؤں گا، خونِ جگر پلواؤں گا
اُس وقت پچھتائیں گے وہ
اور مجھ سے فرمائیں گے وہ
اچھا خدا کا واسطہ
مجھ سے ہوئی بیشک خطا

اور آج سے میں ہوں تری
منکوحہ بیوی کی جگہ
اسوقت دنیا کو یقیں
اس بات پر آجائے گا
ہے عشق میں بیحد اثر
اور حُسن ہے بے بال و پر
پھیل کر یہ بیکراں ہو جائیگی

جوانی

چاٹ کر دیوارِ شب
چشمِ آہو کے اشارے دیکھ کر
اس طرح دوڑے گی میرے خوں بھرے مژگاں کی آہ
جیل کے ڈر سے کوئی چوہا سڑک پر جس طرح
اِس طرف سے اُس طرف بھاگا کرے
اور سحر چڑھ آئے گا آنکھوں میں تیرے یوں ابھار
جس طرح رمضاں میں ہو پیٹ ملا کا بھرا
پر احتیاطاً سحر کو
اونگھتے ہیں دودھ پی کر سو رہے
اور دن میں اسطرح بے چین ہو
جیسے پہلی بار ہو دوشیزہ کوئی حاملہ
اور شب کو درد زہ میں مبتلا ہونے کے بعد
کہہ نہ سکتی ہو کسی سے حالِ دل
کروٹیں لیتی رہے
اِس طرف سے اُس طرف
چاٹ کر دیوارِ شب

زُلف!

چاندنی میں نوحہ خواں ہو جائے گا
اجنبی عورت کا وہ ٹھنڈا پیار
جو مجھے دیتی ہے اکثر رات کو
درس آزادی کے خواب
اور خیابانِ چمن کے لالہ زار
دست غارتگر کی جیسے انگلیاں
زندگی کی خوابگاہوں کے قریب
آہ رومانی ادا کی تازگی
دیو آسا مشتعل قندیل میں
وہ سسکتی سی تمناؤں کے راگ
خوف سے لرزاں نظر آنے لگے
جیسے کوّے کی نزعی کیفیت
یا کسی کے نقرئی بالوں میں گھنگھے کا ورم
اس طرح معلوم ہوتا ہے مجھے
فیل پا کا مرض جیسے آنکھ میں
چاندنی میں نوحہ خواں ہو جائے گا

اندھیرا

استخوانِ زندگی کے بند دروازوں کے پاس
آکے جوڑی اور بخار
رفتہ رفتہ جسم کی کنڈی مرے
اسطرح پر کھٹ کھٹاتا ہے کہ میں
دینے لگتا ہوں دہائی موت کو
اور اپنے سر پہ سارا گھر اٹھا لیتا ہوں یوں
جیسے اک مدقوق عورت پیٹ سے
اوّل اوّل دردِ زہ میں مبتلا ہونے کے بعد
پھاڑ دے سارے محلہ کا سکوں
اپنی چیخوں کی نوکیلی نوک سے
اور پھر کچھ دیر خاموشی کے بعد
کپکپی کے دوش پر اچھی طرح چڑھنے کے بعد
اسطرح دیتا ہوں دانتوں سے صدائے کٹ کٹاک
جس طرح ٹیلیگرافر کی نوکیلی انگلیاں
کرتی ہیں اسٹیشنوں پر کٹاکٹ و کٹکٹاک
اور دیتی رہتی ہیں پیہم خبر
اسٹیشنوں پر اس طرف کیسے اُس طرف
سواری گاڑی چھوڑ دی

تیرے نغمے!

تیرے نغموں کی صدا کان میں اکثر آئی
جھٹپٹے وقت کے سہمے ہوئے سناٹے میں
اسطرح جیسے کسی ریڈیو اسٹیشن پہ
کسی بہکے سے ترقی زدہ شاعر کی صدا
ایک جذبات میں ڈوبا ہوا نغمہ گا دے
اور اُس گائے ہوئے نغمے سے
کوئی آثارِ قدیمہ کا پُرانا شاعر
اسطرح کان میں اُنگلی دے لے
جیسے لیمنٹ کی بوتل میں لگا دے کوئی ڈاٹ
ہاں تری اس بھری انگڑائی میں اکثر بس نے
تیرے بدمست اشاروں کو چھپا دیکھا ہے
جسطرح کوئی ترقی زدہ شاعر کا کلام
اپنے الفاظ کے معنوں میں چھپا رہتا ہے
اور اس ڈر میں ترنم کے نہاں خانوں سے
باہر آتے ہوئے گھبراتا ہے
کہ کہیں کوئی پُرانا شاعر
اعتراضات کا گندہ پانی
ڈال کر اُس کو نہ تر کر ڈالے
اور اُس شعر کی پوشاک کے گُل بوٹوں سے
کسی بچھڑے ہوئے مطلب کی نہ بُو آجائے

کہار

شام سے زیست کے کندھوں پہ لٹکتا ہوا داغ
ایک خیالات کے دریا میں رواں
خوابِ خرگوش بنا جاتا ہے زنداں کی طرف
آگ ٹوٹے ہوئے کاشانوں میں لگتی ہی چلی جاتی ہے
اور دیوار پگھلتی ہی چلی جاتی ہے
جس طرح اک سگِ مدقوق کسی نالی میں
جان دیتا ہوا دریا کی طرف بہ نکلے
اور ہو جائے خموش
شام سے زیست کے کندھوں پہ لٹکتا ہوا داغ

فیض احمد

فیضؔ

سے

متاثر ہو کر

چند ہی روز کی ہے مشق فقط چند ہی روز

فیض احمد فیض

ہمارے دوستوں میں ایک صاحب ہیں انگریزی میں فرسٹ کلاس ایم اے بے حد ذہین اور سمجھدار بات چیت میں شائستہ اور معقول، ایک مرتبہ کئی سال کے بعد ملاقات ہوئی تو اتفاق سے ایک روزنامہ کے دفتر میں جسمیں اُس زمانہ میں ہم کام کرتے تھے۔ بڑی محبّت اور خلوص سے ملے۔ برابر کی کرسی پر بیٹھکر باتیں کرنے لگے مزاج پرسی کے بعد ہم نے پوچھا کہ یہ قطع کیا بنا رکھی ہے؟ کہاں انگریزی بال ور کہاں یہ صفاچٹ ٹینس لان بلکہ کھوٹیاں تک نکلی ہوئی، بولے استرا پھروا دیا ہم نے کہا بیمار ہو گئے تھے؟ بولے نہیں یہ حجّام صاحب کی عنایت ہے اور اس کے ذمّہ دار وہی کمبخت ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد دیکھا کہ پیر میں جو وارنش کا پمپ ہے اسپر دو کلائی کی نئی گھڑیاں بندھی ہیں، ہمنے کہا خیریت یہ کیا؟ بولے اسکا سلسلہ بھی سر سے ہے۔ ہم نے کہا یعنی؟ بولے کہ ایک روز بال بنوانے کیلئے حجّام کو بلوایا۔ آیا تو بڑے فیشن سے۔ بولا کیسے بال بنیں گے؟ میں نے کہا یہی انگریزی۔ فوراً اپنے سر کی ٹوپی اتار کر بولا ایسے بنا دوں، کچھ نہ پوچھئے آگ ہی تو لگ گئی کہا گھوٹ دے۔ چنانچہ اُس روز سے آج تک سر گھٹواتا ہوں۔ ہم نے کہا اور یہ گھڑیوں کا کیا معاملہ ہے بولے چلتے وقت میں نے کہا کہ کوئی تین کا وقت ہوگا، اُسپر اپنی کلائی کی گھڑی دیکھکر بدتمیز بولا کہ آپ کی گھڑی سُست ہے اسمیں ساڑھے تین بجے ہیں اُس روز سے میں نے بجائے ہاتھ کے جوتے پر گھڑی باندھنا شروع کر دی۔

معلوم ہوتا ہے کہ فیض احمد فیض کی آزاد شاعری کی ایسی ہی کوئی وجہ ہوگی اور کسی بنئے بقّال سے یارانِ طریقت نے انکے برابر کسی مشاعرہ میں کوئی نظم پڑھوا دی

ہوگی جب سے انھوں نے اس شاعری کو ترک کرکے آزاد شاعری شروع کردی ہوگی۔ ورنہ فیض خوشگو شاعر ہیں اور اچھے شعر کہتے ہیں آزاد شاعر ہونے پر آپ لیڈر کی تصویریں کھینچنے لگتے ہیں ۔۔۔ نظم کا عنوان ہے "لیڈر" ملاحظہ ہو۔

سالہا سال سے بے آسرا جکڑے ہوئے ہات
رات کے سخت و سیہ سینہ میں پیوست رہے
جسطرح تنکا سمندر میں ہو سرگرم ستیز
جسطرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے
اور اب رات کے سنگین و سیہ سینہ میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جابجا نور نے اک جال سا بُن رکھا ہے
دور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے
تیرا سرمایہ، تری آس یہی ہات تو ہیں
اور کچھ ہے بھی ترے پاس؟ یہی ہات تو ہیں
تجھکو منظور نہیں غلبۂ ظلمت لیکن
تجھکو منظور ہے یہ ہات قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کمین گہ میں دھڑکتا ہوا دن
رات کی آہنی میت کے تلے دب جائے

اب اس نظم کا تخلیقی پس منظر ملاحظہ ہو جو غالباً یہ ہوگا۔

رات کو شاعر نے ایک بھیانک خواب دیکھا۔ پہلے اُسے زنجیروں میں بندھے ہوئے دو ہاتھ دکھائی دیئے، اس کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ جنگل میں رات کھڑی ہوئی ہے جس کے سخت اور سیہ سینہ میں دو جکڑے ہوئے ہاتھ پیوست

ہوئے جا رہے ہیں اور ہاتھ اسکے سینہ میں اسی طرح سرگرم ستیز ہیں جیسے تنکا سمندر میں
ہوتا ہے یا تیتری کہسار پر یلغار کرتی ہے اسکے بعد شاعر کو رات کے سنگین اور سیہ
سینہ میں گھاؤ دکھائی پڑے اور یہ گھاؤ اس کو نہ صرف رات کے جسم ہی پر نظر آئے
بلکہ جسطرف نظر گئی ہر طرف گھاؤ ہی گھاؤ نظر آنے لگے۔ گویا پورا ماحول گھائل تھا
اُف کس قدر بھیانک خواب ہوگا خیر خدا خدا کرکے روشنی پھیلی اور دریہ صبح کی چھاتیوں
کے دھڑکنے کی آواز آتی معلوم ہوئی اس کے بعد شاعر خواب ہی کی حالت میں اس
جسم سے مخاطب ہوتا ہے جسکے ہاتھ تاریکی میں ظاہر ہوئے تھے اور کہتا ہے کہ
اے نہ نظر آنے والے جسم تیرا سرمایہ اور تیری آس یہی ہاتھ ہیں اور فقط ہاتھ ہی ہاتھ
میں بظاہر تو کوئی اور چیز معلوم نہیں ہوتی لیکن تجھکو اس اندھیرے کا غلبہ
غالباً منظور نہیں اسی وجہ سے تو نے ہاتھ نکال کر ثابت کر دیا کہ اندھیرا سب کچھ
چھپالے مگر تیرے ہاتھ نہیں چھپا سکتا پھر اُسی جسم سے عالم خواب میں کہتا ہے
کہ کیا تو ان ہاتھوں کو قلم کروانا پسند کرتا ہے؟ اس کے بعد خیالات کا سلسلہ منقطع
ہو جاتا ہے تو بے ربط فقرے شاعر کے منھ سے نکلنے لگتے ہیں اس کو مشرق کی
کمین گہ میں دھڑکتا ہوا دن نظر آنے لگتا ہے اور وہ آرزو کرنے لگتا ہے کہ
رات کی آہنی ہیئت کے تلے دن غریب دب جائے۔ اور اس بھیانک خواب سے
شاعر کی آنکھ اُسوقت کھلتی ہے جب شائد یو۔پی کے اخبار "لیڈر" کا ہاکر زور سے
لیڈر کی آواز لگاتا ہے جس سے شاعر جاگ پڑتا ہے، چنانچہ اس نے غالباً اسی
وجہ سے اس نظم کا عنوان "لیڈر" رکھا ہے۔ شاعر فرائیڈ کے کسی خواب سے
متاثر معلوم ہوتا ہے۔

بُول

(از فیض احمد فیض)

بُول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بُول زباں اب تک تیری ہے
تیرا اسُتواں جسم ہے تیرا
بُول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہنگر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے سُرخ ہے آہن
کھُلنے لگے شعلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بُول یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بُول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بُول جو کچھ کہنا ہے کہ بُول

تنہائی

جناب فیض احمد صاحب فیض

پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوان میں خوابندہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گذار
اجنبی خاک نے دھندلا دئیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں آئے گا

چٹخارے

۱- ہائے وہ تیرا پیار
وہ ترا لمبا پیار
جسکی گالوں پر نکھار
آجتک قائم ہے یوں
جسطرح کیچڑ میں ہو
اک فوجی جوتے کا نشاں
اور خشک ہو جانے پہ بھی
قائم رہے، دائم رہے
اس کا نشاں

تیرے رنگیں، رس بھرے
ہونٹوں کا رس میں چوس لوں
کیسے؟
جیسے چوستے ہیں آم کو
یا زخم کو اور خون کو
وہ جونک جسکی آہ قیمت کچھ نہیں
ننھی سی جونک
منّی سی جونک
اور پھر کلی کروں اس شہد خالص کی کہ جو

چوسا ہے تیرے ہونٹ سے
دشمن کی اجلی شرٹ پر

اور اگر وہ کچھ کہے
تو اسپہ اک دم پل پڑوں
اور دوں ایسا ثبوت
اپنی شجاعت کا کہ تو
اُسکے صلہ میں مجھکو دے
دو چار بوسے گرم گرم
اُس دیگ سے نکلے ہوئے
جسمیں اُبلتا ہے شباب
کیسے بوسے ؟
جنکے چٹخارے لبوں کے واسطے
آبِ حیات
وجہ نجات
اور حاصلِ عمر فنا

گھر اپنے واپس آؤنگا

اک گناہِ آتشیں کا مرتکب ہونے کے بعد
۲۶- اسطرح بھاگوں گا میں تیری نگاہِ گرم سے
جسطرح بندر کوئی کھمبا ہلا کر بھاگ جائے
اور دنیا ہکا بکا ہو کے دیکھے کون تھا
اور کچھ نہ چل پائے پتہ
اس رمز کا

دوسرے دن تیری فردوسِ نظر کے سامنے
مسمریزم آنکھ سے رخسار پر کرتا ہوا
جب میں گذروں گا تو کیا
تو جان جائیگی مجھے
پہچان جائیگی مجھے
اور بھیجکر نوکر کوئی
مجھکو پکڑا منگوائیگی
اور باپ سے پٹوائیگی
لگوائے گی
جوتے مرے

اچھا تو سُن، لے بیسوا!
اتنا سمجھ لے اُس گھڑی
تو اپنے منہ کی کھائیگی
جب اُس بھرے مجمع میں میں
چلّا کے کہہ دوں گا، سُنو
میں تو کسی قابل نہیں
میرا کوئی حاصل نہیں
اُس وقت تیرے باپ کا
چہرہ تو فق ہو جائے گا
اور میں اُچھلتا کودتا
گھر اپنے واپس آؤں گا

اندیشہ

تو نہ جانا کبھی اُس راہ سے ہرگز اے دوست
اس میں پوشیدہ ہیں ارمانوں کے صدہا گرداب
اور کچھ خاک کے ادنٰے تودے ....
کہیں پر پیچ سی راہوں میں نہ تو کھو جائے
اور پھر مل نہ سکے تیرا پتہ بھی مجھ کو ......
میری گھبرائی ہوئی نظروں .... کو

سُن مرے دوست یہ میری ہی تمنائیں ہیں
ہیں بظاہر تو یہ اک خاک کے ادنٰے تودے
مگر ان تودوں میں پوشیدہ ہیں ....
سیکڑوں خوف کے مارے طوفاں
جسطرح آرزوئیں دل میں سوسے کوئی
اور خاموش سی گھبرائی نگاہوں سے تجھے
اسطرح دیکھے کہ جیسے کسی گونگے کی نظر
چند گھبرائی ہوئی موجوں کو ساحل کے قریب
کرکے جو آئی ہوں دریا میں کسی کشتی کو غرق
اور یہ جرم چھپانے کے لئے ....
چوستی آئی ہوں ساحل کے قدم .....
تاکہ آغوش میں لے لے ساحل .....
تو نہ جانا کبھی اس راہ سے ہرگز اے دوست

تنہائی

آج خوابیدہ چراغوں میں ہیں ایوان کھڑے
اور ایوانوں کے پہلو میں ہیں دروازے لگے
رہ گذر راو نگھ گئی تیرا تصور کرکے
اجنبی کیف کی آوازیں دھندلا گئے پاؤں
گُل کرد شمعوں کو اور باندھ دو داب گردن زاغ
اور سوئے ہوئے کوٹلوں کو اکھٹا کر لو
اور بے خواب بے حقّہ اُسے تازہ کر لو
سچو کنے کون یہاں آئے گا
میرے سُلفے کی چلم
آج خوابیدہ چراغوں میں ہیں ایوان کھڑے

خواب

اُچٹی اُچٹی تری نظروں میں کہیں سازِ الم
کوئی نغمہ نہ مرے سوزِ جگر کا گا دے
اور ترے صبر کے مذموم گلابی بادل
جھک کے دامن پہ مرے اشک فشانی نہ کریں
اور تری مست جوانی پہ تصدق ہو کر
ذرّہ ذرّہ مری محرومی پہ رونے نہ لگے
پھر اُسی خواب میں بھولے ہوئے رازوں کو مرے
طشت از بام نہ یہ مست اشارے کر دیں
روشناس اس غمِ ہستی سے انھیں آہ نہ کر
ان کو بے کیف یونہی رہنے دے
اور مری فطرتِ خاموش محبّت کے گلے
تری پازیب کی جھنکار سے یوں کرتی ہے
جیسے سہمے ہوئے ساون میں محبّت کی عروس
ہو کے ششدر کسی بھیگے ہوئے سنّاٹے میں
ایسے چھپ جائے کہ جیسے کسی خوشبو سے کلی
اپنے دامن کو بچاتے ہوئے کملاتی ہے
اور پھر خواب میں بھٹکی ہوئی تخئیل تری
اسکے دیدار کو تا عمر ترستی رہ جائے
اور پھر خاک کے ذرّوں میں نگاہیں اسکی
چاک دل چاک جگر چاک گریباں ہو جائیں
اچٹی اچٹی تری نظروں میں کہیں سازِ الم!!

خدمت

چند مسند کے گدھے
خواجہ سرا ایسے ہستی
اپنی بے کیف وفاؤں کا سہارا لے کر
قوم کے درد سے یوں کانکھ رہے ہیں سہم سہم
جیسے مجرے میں کوئی حاملہ رنڈی تھک کر
بے سرے پن کو چھپانے کے لئے
کانکھ کر تان کو کر دیتی ہو بند

ناخداؤں کے خدا
جبر پہ اپنے بیٹھے ہیں
اور مزدور ــــــ بچارے مزدور
جنکے بیٹوں کو یہ سب کاٹ کے یوں لیٹے ہیں
جیسے دریا کے کنارے پہ چوہے
اور اسطرح اڑاتے ہیں یہ عہدوں پہ مزے
جیسے گدھ لاش کو مرحوم گدھے کی نوچیں

چند مسند کے گدھے
ہو کے اعزاز غلامی پہ سوار
شان میں اپنی ہیں اکڑے جیسے
[illegible] تماشہ میں چمار
اور ایثار سے اسطرح لرز اٹھتے ہیں
جیسے بقرعید کا بدھیا بکرا
دیکھ کر چاقو کو ڈر جاتا ہو

چند مسند کے گدھے

چند مسند کے گدھے
قوم کے درد میں دن رات گھلے جاتے ہیں
آہ! مزدور کی سلگتی آہیں
اُف یتیموں کے وہ گھٹتے نالے
اور وہ بیواؤں کی پھیکی چیخیں
اتنے اونچے پہ پہنچی ہیں یہ چیخیں کہ کبھی
جس جگہ ٹھاٹھ سے مسند پہ یہ سب لوٹتے ہیں
اور ہیں فرشِ غلامی پہ پڑے
چند مسند کے گدھے

تڑپ

برف آسا ترے رُخسار کو چھو لینے سے
ہو گیا ہے مرے ہونٹوں کو زکام
اپنی پیشانی کے تیوروں سے مجھے
اسطرح پر تو بنائے ہے شکار
جسطرح سے کسی بگلے کی نظر مچھلی پہ
اور تری شوخ نگاہوں کی طربناک ہوا
یوں پکارے ہے مجھے رات کے سنّاٹے میں
گائے سے چھوٹ کے بچھڑا جیسے
کھیت کی مینڈ سے دیتا ہو صدا
یا کسی عید کے موقع پہ برائے تفریح
کوئی گمراہ ترقی زدہ شاعر شب کو
اختری بائی کے بعد اپنا کلامِ عریاں
ریڈیو والوں کے کہنے سے اچانک گا دے
اور پھر ریڈیو کے سٹ کی شریفوں کے یہاں
اسطرح سوئی گھمائے کوئی بوڑھا بڑھ کر
جسطرح کان اُمیٹھے کسی بچّہ کا بزرگ
منھ سے گالی کے نکل جانے پہ
برف آسا ترے رخسار کے چھو لینے سے!

جواب

تیری بانہوں کی گلابی نظریں
گُل کی آغوش میں دا بیٹھی ہیں
جسطرح تیری نگاہوں کے کروڑوں نغمے
میری مفقود سماعت کے نہاں خانوں میں
خوف سے بیٹھے ہوں پردے سے لگے
جیسے جوُڑی کو بخار آجائے
اور تری خواب گہ ناز کی ننگی دہلیز
اسطرح سامنے آ آکے گذر جاتی ہے
جیسے سادھو کوئی جٹ باندھ کے بازاروں سے
سیکڑوں بچوں کے جھُرمٹ میں یہ کہتا گذرے
"صُاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں"
تیری بانہوں کی گلابی نظریں

خزاں!

ننگ انسانی کی ڈھلتی چھاؤں میں
نہ سہی جوش و خروش
خیر میدانِ عمل میں تو اتر آئے ہیں
ٹوٹی پھوٹی سی پچھڑی ہڈی
اپسے لڑتے ہیں درندوں کی طرح
آہنی قدموں سے ہیں روندی ہوئی

اور یہ مردہ غلام
ہنس رہے ہیں اور روتے بھی نہیں
پس رہے ہیں اور مرتے بھی نہیں
خیر چلنے دو انھیں
کون ہیں تم نے انھیں پہچانا؟
یہ ہیں سب مل کے بغاوت کا نشاں
ننگ انسانی کی ڈھلتی چھاؤں میں

نغمہ

تیرے جذبات کے طوفان میں ڈوبا ہوا ساز
میری تقدیر کے نغموں کے گلے گاتا ہے
اور میری حسرت و اندوہ کے ٹوٹے موتی
چشم آہو کے خماروں کا پتہ دیتے ہیں
کیا تیری بزم شبستاں سے تڑپتا ہوا سوز
ہولے ہولے مرے کاشانہ میں آجاتا ہے
اور پھر چھوڑ کے آغوش محبت میں مجھے
ڈھونڈنا اور بھٹکتا ہوا کاشانوں میں ....
مسکراتا ہوا ارمانوں پہ ....
میرے ناکردہ گناہوں کا پتہ دیتا ہے ....

تیری پازیب کی جھنکار کے روٹھے نغمے
میری بچھڑی ہوئی رنگین امنگوں پہ نثار
تیرے سینہ میں نہاں میری تمناؤں کا راز
یوں شرر افشاں ہے جیسے کہ جہنم کا عذاب
اپنے مخمور تغافل سے نہ کہنا ہرگز
آہ اس کو مرے اس غم کا پتہ مت دینا
تیرے جذبات کے طوفان میں ڈوبا ہوا ساز

مخمور جالندھری

سے

متاثر ہو کر

نیفہ سرکا کے نہ بل ریشمی شلوار میں ڈال؟

مخمور جالندھری

مخمور جالندھری

مخمور بالکل ترقی پسند ہے۔ سماج کی گہرائیوں سے بھی کچھ نیچے اتر گیا ہے ایک "ترقی پسند شاعر" کو صحیح معنوں میں جن چیزوں سے متاثر ہونا چاہئے مخمور انھیں میں مخمور اور مدہوش ہے۔ رجعت پسند شعرا قدرتی مناظر، محبوب کے خدوخال چال ڈھال اور عشوہ سے متاثر ہو کر شعر کہتے ہیں مگر مخمور خالص جنس لطیف کی ان چیزوں سے متاثر ہے جن کو اس کے نزدیک فردوس کے میوؤں کی منزلت حاصل ہے جب وہ جنس لطیف کی عریانی سے متاثر ہو کر شعر کہتا ہے تو اس کا ہر شعر آرٹ بن جاتا ہے۔ اس کی جلوہ گاہ میں آپ کو یہ "ادبی جواہر ریزے" جگہ جگہ پروئے ہوئے ملیں گے۔ وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے اس کو بجنسہ لکھکر دوسروں کو بھی متاثر کرتا ہے۔ اس کی نظم "عورت کو کپڑے پہنتے دیکھکر" اسکے لطیف جذبات کا شاہکار ہے۔

شاعر کا قیام ایک کمرہ میں ہے۔ پاس ہی ایک گھر ہے جسمیں کوئی دوشیزہ رہتی ہے ایک دن وہ اپنی تنزیب کی ساری پہنے نل کے نیچے بیٹھ جاتی ہے اور نہانا شروع کر دیتی ہے۔ ساری بھیگ کر جسم میں جب تک سما جاتی ہے اور وہ نیم عریاں نظر آنے لگتی ہے جس کمرہ میں شاعر رہتا ہے اسکے دروازے دوشیزہ کے مکان کے صحن کی طرف کھلتے ہیں جہاں سے روز صبح وہ مکان کی ہر چیز کو دیکھتا رہتا ہے۔ ایک روز لڑکی کو نہاتا دیکھکر شاعر غیر معمولی طور پر متاثر ہو گیا اور اُس نے خوشی میں آکر یہ نظم کہہ ڈالی۔ شاعر کو اُس کا نیم عریاں سینہ میوؤں کا ایک خوان نظر آتا ہے۔ اگر ان میوؤں میں سیبوں کی تخصیص کر دی گئی ہوتی تو

زیادہ مناسب تھا۔ بہرحال لڑکی نے اپنی بھیگی ساری اُتاری، بدن پوچھا،
اور قدِ آدم آئینہ کے قریب آ کر اپنی صورت دیکھنے لگی۔ شاعر کو جو دور اپنے
کمرہ کے کواڑوں کی آڑ سے سمریزم کی مشق کر رہا تھا اس کے جسم کا عکس شیشے
پر رقصاں نظر آنے لگا۔ اُس نے کپڑے بدلنا شروع کئے، پہلے مونگیا رنگ
کی انگیا پہنی اور جوانی کے جوش میں انگیا کے بند اس قدر کس کر باندھے کہ
شاعر کا دل دہل گیا۔ اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اس نے اپنی انگیا کے بند
شاعر کے سینے پر کس دئے ہیں۔ ابتک جن رس بھرے میوؤں کو وہ دیکھ رہا تھا
انگیا کس دینے سے جب اسمیں خلل واقع ہوا تو اس نے گھبرا کر کہا کہ رس دار میوؤں کو
ابھی مت چھپاؤ ورنہ میری مخمور آنکھیں اُن کے نظارے سے محروم ہوجائینگی
مگر جب وہ نہ مانی تو کہتا ہے کہ کیا اس خوان کی نمائش تجھے منظور نہیں ہے اور
کیا محض راہ گیروں سے دادِ دوشیزگی لینے کے لئے تو نے انھیں عریاں کیا تھا
لیجئے کمرے اُوپر کے حصے کا کُل لباس اُسنے پہن لیا۔ اور وہ اپنے الجھے ہوئے
بالوں کو کنگھی سے سلجھانے لگی۔ اُدھر شاعر کو اختلاج اور الجھن شروع ہوگئی
اور اُسے یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں وہ اپنی بکھری ہوئی زلفوں کو سمیٹ کر
چوٹی نہ باندھ لے اور وہ بکھری ہوئی زلفوں کے منظر سے محروم ہوجائے مگر
وہ نہ مانی غالباً اس نے چوٹی باندھ ہی لی۔ یا ممکن ہے کہ جوڑا کس لیا ہو
بہرحال اسی درمیان میں "ترقی پسند شعرا" کا ایک بھولا بھٹکا "کوا" دوشیزہ کے
مکان کی کھڑکی پر آبیٹھا جس سے لڑکی قدرے جھجک گئی۔ اس چیز نے شاعر کو
سخت غلط فہمی میں مبتلا کردیا اور اس کا مفہوم اس نے یہ لیا کہ لڑکی اُس کی طرف
ملتفت ہے ورنہ ایک ادنیٰ "کوے" سے جھجکنا اور اسکی مستقل سمریزم کی مشق سے
نہ جھجکنا کیا معنے؟ ضرور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ شاعر کو کوے پر ترجیح دی گئی

اس کے بعد ہی لڑکی نے جو چست قمیص زیب تن کی تو اُس سے شاعر کے فردوسی رس بھرے میوے بالکل باہر نکلنے پر آمادہ ہو گئے اور شاعر کی جملہ ہمدردیاں اُس بٹن کے ساتھ ہو گئیں جو اُسکی قمیص کو کسے ہوئے تھا اور اُس کو یہ اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں بیچارہ بٹن ٹوٹ کر اپنی جگہ سے علیحدہ نہ ہو جائے۔ کمر کے اُوپر کے لباس سے فراغت پانے کے بعد اب نیچے آئیے۔ اسنے شلوار پہنی غلطی سے یا عمداً شاعر کو ستانے کے لئے تاکہ وہ اس حصّہ سے پورے طور پر لطف اندوز نہ ہو سکے شلوار پہن کر لڑکی نے شلوار کے نیفے کو سرکا کر شلوار میں بل ڈال لئے جس نے شاعر کی غلط فہمی اور بڑھا دی، بد نصیب یہ سمجھا کہ وہ آنیوالی دشواریوں اور عشق کی صعوبتوں سے آگاہ کر کے اُسے یہ بتانا چاہتی ہے کہ ہفت خوان کی پر پیچ منزل تک پہونچنے میں اُسے کیسے کیسے سخت مصائب برداشت کرنا ہونگے۔ اور مخمور صاحب کو اس سوچ میں ڈالدیا کہ معلوم نہیں اُن کو منزل مقصود تک پہونچنے میں کامیابی بھی ہوگی یا نہیں۔ اسکے بعد مخمور صاحب کی فرمائش ہوئی کہ فردوسی میووں کو بادل کے غلاف میں نہ چھپایا جائے مگر جب لڑکی نے مخمور کی اس فرمائش کو بھی ٹھکرا دیا تو وہ تمدن کو گالیاں دینے پر اُتر آئے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ ایسی "حسین" چیز کو لباس میں چھپانا تمدن کا ظلم ہے۔ بہر حال پھر حکم ہوتا ہے کہ اچھا اب ذرا اس لباس کو زیب تن کر کے گھر سے اٹھلاتی ہوئی نکلو کیونکہ آنکھوں کا نظارہ بیچینی سے راہ میں پڑا انتظار کر رہا ہے۔

مخمور صاحب کی شاعری کا تخلیقی پس منظر اسی قسم کا ہوتا ہے۔ آپ کی دوسری نظم "میرے معجزے" ہے۔

ایک عورت کو کپڑے بدلتے دیکھکر

(از مخمور جالندھری)

نیم عریاں ہی نہاکر تو چلی آئی ہے
رس بھرے میووں سے لبریز ہے فردوس تیری
صاف آئینے میں رقصاں ہے ترا عکسِ جمیل

مونگیا رنگ کی انگیا پہ گرہ کس کے نہ دے
کیا نمائش نہیں منظور تجھے جوبن کی
رہرووں سے نہیں تو چاہتی کیا دادِ نگاہ؟
سمجھا سمجھا میں تری فطرتِ چالاک کے داؤ
تیری خواہش ہے تری سب سے بڑی خواہش ہے
دیکھنے والوں کو دوشیزہ نظر آئے تو

بار بار آئینہ میں زلف کے سلجھاؤ نہ دیکھ
تو نہیں جانتی کیا گیسوئے مشکیں کی لٹیں
بکھری بکھری ہی نگاہوں پہ ستم ڈھاتی ہیں

خوف سے کیوں تو سمٹتی ہے جو کوئی کوّا
تیری کھڑکی پہ بھٹکتا ہوا آ بیٹھا ہے
گو اکیلی ہے تجھے پھر بھی حیا آتی ہے

جانے کیا بات ہے؟ مجھ سے نہیں پردہ کوئی
میں کہ کھڑکی میں سے ہر روز تجھے جھانکتا ہوں

چمٹا جاتا ہے ترے جسم سے یوں تیرا قمیص
ڈر ہے شانے نہ بٹن توڑ کے عریاں ہو جائیں
نیفہ سرکا کے نہ بل ریشمی شلوار میں ڈال
ڈر رہا ہوں میں کہیں یہ ترا مطلب تو نہیں
کہ مجھے منزلِ مقصد کے پہونچنے کے لئے
اتنے پرپیچ مراحل سے گذرنا ہوگا

کیوں نگاہیں نہیں ہٹتیں تری آئینہ سے
کیوں تجھے تنگ ہے دلاویز نہیں تیرا لباس
مجھ سے پوچھے تو یہی بات کہوں گا تجھ سے
مہِ صنوباش پہ سجتا نہیں بادل کا غلاف

اس تمدن نے بڑا ظلم کیا ہے تجھ پہ
ہر حسیں شہ پہ ضروری تو نہ تھی قیدِ حجاب
خیر ہنستی ہوئی اٹھلاتی ہوئی گھر سے نکل
آنکھیں بچھنے کو ہیں بیتاب ترے رستوں میں

میرے معجزے

(از مخمور جالندھری)

تجھے یوں عشق کا اعجاز دکھایا میں نے
کر دیا آگ سے لبریز تری سانسوں کو
بھر دیا برق کی لہروں سے ترے ہونٹوں کو
جسم میں تیرے حسیں لوچ سموئے میں نے
فتنے اعضائے جواں میں ترے بوئے میں نے
چال میں تیرے کیا رقص بھنور کا پیدا
نرم سا ڈال دیا تیری کمر میں جھولا
تیرے گالوں کے گڑھے پاٹ دیئے شعلوں سے
ساغر آنکھوں کے بھی چھلکائے حسیں نغموں سے
تیری سانسوں کو دیا تیز سے دھاروں کا بہاؤ
قد رعنا کو عطا کر دیا شبنم کا تناؤ
گفتگو میں تری رس گھول دیا پھولوں کا
تیرے نغموں کو دیا ساز رواں جھرنوں کا
پہلے تھا شانۂ بلور ترا ایک چٹان
اب ہے دو تازہ بگولوں کی جواں عمر اٹھان
رکھ دیئے تیری نگاہوں میں اشارے میں نے
تا نہ پلکوں پہ مستی کے اتارے میں نے

بند دل میں رکے طوفان کے سب توڑ دیئے
سینے میں قید امنگوں کے ہرن چھوڑ دیئے
تیرے سینے کو سمٹنے کے دیئے رنگ ایسے
خوف سے دل میں ہوں دبکے ہوئے آہو جیسے
تجھے انگڑائی سے اظہار تمنا بخشا
نیچی نظروں کو دھڑکنا بھی سکھایا میں نے
اپنے قابل تجھے اس طرح بنایا میں نے
گیت رگ رگ میں تری چھیڑ دیئے ساون کے
بھرے خوشبو سے کٹورے یہ ترے جوبن کے
کھینچ کر تیرے لبوں تک ترا دل لے آیا
تیرے ٹھٹھرے ہوئے جذبات کو بھی گرمایا
تیری آغوش کی فردوس کا در کھول دیا
نرم بانہوں کو تری حلقۂ زنجیر کیا

ساری

کیا تری ساری کا آنچل ادھر ہٹ سکتا نہیں
اور ترے سینے کا وہ رنگیں ابھار
سامنے میرے نکھر سکتا نہیں
دے رہا ہے دیر سے جو
میری لاغر انگلیوں کو ہاتھ کی
شوخیوں کی دعوتیں

اک ذرا اپنی نگاہِ گرم سے
بلب آسا نور کے ٹکڑوں کو پھر
اس طرح جھنجھلا کے جنبش دے ذرا
جسطرح ہوں سیب پتوں میں چھپے
اور ہوا کا سخت جھونکا زور سے
ان کو پختہ اور پکا دیکھکر
اپنی لاغر انگلیوں سے چھیڑ دے
اور مجھ سے یوں بگڑ کر تو کھنچے
جسطرح نیچے جھکا کر کوئی ڈال
دفعتاً ہاتھوں سے اپنے چھوڑ دیں

خواب میں

دیکھ جمپر کا بٹن تیرے کھلا جاتا ہے
اور رس دار جنوں خیز جوانی تیری
میری شرمائی نگاہوں میں کھبی جاتی ہے
آہ! دوشیزہ نگاہیں مری گھبرائی ہوئی
تیری زلفوں کی گھٹاؤں میں نہ گم ہو جائیں
اور پھر اُنکی جدائی میں مرا دیدۂ تر
خون رو رو کے کہیں حشر نہ برپا کر دے

اپنی رفتار کی شوخی سے اشارہ کر دو
کہ وہ ان ٹوٹے ہوئے شیشوں کے ٹکڑے نہ کرے
کیوں کہ ان ٹکڑوں میں پوشیدہ ہیں
میری مرحوم تمناؤں کے داغ
جن سے اٹھیں گے ہزاروں طوفاں
اور ترے کوچہ سے کچھ خاک کے ذرّے لیکر
اسطرح اُن کو اچھالیں گے زمانے بھر میں
جسطرح آندھیاں صحراؤں میں
ریگ کے ڈھیر اڑا دیتی ہیں
آہ پھر ہاتھ نہ ملنا اے دوست
دیکھ جمپر کا بٹن تیرے کھلا جاتا ہے

شبستاں کے قریب

شب کے سناٹے میں تیری خوابگاہِ ناز سے
کچھ دور اٹھلاتا ہوا
میں دیکھتا ہوں
اک گدھا

ہاں
اک گدھا
خالص
گدھا
بالکل
گدھا
سچ مچ کا اک تگڑا
گدھا

معصومیت کا بادشاہ
مظلومیت کا ناخدا
خرمستوں سے کھیلتا
تیرے محل کو دیکھتا
کچھ ہنہناتا کچھ ٹھٹکتا
گردن کو کچھ موڑے ہوئے
کل رسیاں توڑے ہوئے

کب سے کھڑا ہے منتظر
تجھکو نہیں اس کی خبر
تو نے کبھی دیکھا بھی ہے
اور یہ کبھی سوچا بھی ہے
کیسے کھڑا رہتا ہے یہ
کسکی نظر کا صید ہے
کیا راز ہے کیا بھید ہے
تجھکو نہیں معلوم مگر
مجھکو ہے سب اسکی خبر
لیکن نہ میں اس راز کو
تجھ سے کبھی بتلاؤں گا
تیرے حریم قلب کو
ہرگز نہیں لرزاؤں گا
دہلاؤں گا تھرّاؤں گا
جانے بھی دے جانے بھی دے
اُس بات کو
اُس رات کو
جب میں نے دیکھا تھا گدھا
خرمستوں کی چھاؤں میں
تیری شبستاں سے قریب

لیکن غسلخانہ میں میں
خاموش و اکڑوں بیٹھکر
یہ سوچ کر اکثر ہنسا
یہ حسن بھی کیا چیز ہے
اک عشق کی دہلیز ہے
تانگھے ہے جس کو کل جہاں
جس سے نہ دنیا بچ سکی
کیا جانور کیا آدمی
سب ہی کو ہے اسکی لگن
خرمستیاں سب کرتے ہیں
لیکن نہ میں اس راز کو
تجھ سے کبھی بتلاؤں گا
لرزاؤں گا دہلاؤں گا
یعنی کہ تیرے حسن پر
گدھے بھی ہیں مچلے ہوئے
تیری شبستاں کے قریب

کھڑا رہنے دے!

کھڑا رہنے دے اسکی خوابگاہِ ناز کے آگے
ستون آرزو ہوں
اور نشانِ رنگ و بو ہوں میں
مری خاموشیوں کی آڑ میں کچھ آرزوئیں ہیں
جنھیں اے دوست تری مست آنکھوں نے نہ پہچانا
نہ جانا آہ تو نے آجتک ان کو نہیں جانا
کھڑا رہنے دے اسکی خوابگاہِ ناز کے آگے
میں اُس کے ایک پوشیدہ خزانہ کا بھکاری ہوں
کہ جسکی کیف آور موج میں جنت کے نقشے ہیں
نہ راہیں آجتک مجھکو ملیں اُس آستانہ کی
کہ جسکی لذتوں میں چھپ رہی ہیں میری فردوسیں
نہ مجھکو اب ستا اے حسرتوں کے بانٹنے والے
کھڑا رہنے دے اسکی خوابگاہِ ناز کے آگے

چھوڑ دے تنہا ہمیں

حُسن والوں سے شہا
اس سمت آ
اور جلد آ
تو مجھکو دیکھ
اور اُن کو دیکھ

اور ہاتھ میں لے میرا دامانِ حیات
اور رحمتوں کو حکم دے نازل نہ ہوں مجھ پر کبھی
کیونکہ میں ہوں اک مریض
حُسن و خواہش کا حریص
حُسن کیسا؟
جسپہ دوزخ کے حوادث ہوں نثار
اور بجلی ہو ہر طرف کو آشکار
بھیجدو اُسکو مری آغوش میں
اور چھوڑ دو اک بند کمرے میں ہمیں
اچھی طرح سے
ہو کے آسودہ تمناؤں کے ساتھ
لوں انتقام اُس حسن سے
جسنے کہ رکھا آجتک
دُور اُن لذّات سے

جو وقف تھیں سب کے لئے
لیکن فقط تیرے لئے
تھے اُن کے سب در وا نے بند

اّبا کی اسمیں کیا خطا
اّماں کی اسمیں کیا خطا
میری سراسر تھی خطا
کیوں چھپ رہا
اب دیر میں پہونچا تو کیا
اچھا اڑانے دے مزا
اور چھوڑ دے تنہا ہمیں
ہاں چھوڑدے تنہا ہمیں
اور کنڈی دے لگا
اندر سے بھی باہر سے بھی
باہر سے بھی بھیتر سے بھی
تا خوب سے کرلیں مزے
ان حُسن والوں سے ذرا
اِس چند روزہ زندگی کی آڑ میں

سہمی جوانی

مچلتی اور ننگی بدلیوں میں
چلے جاتے ہیں بادل مسکراتے
ہجوم زندگی کی سرخ انگیا
بہت گھبرا رہی ہے زندگی سے
خمیدہ اور رتیلی مسکراہٹ
تری نظروں کو لوری دے رہی ہے
تری سوئی ہوئی خوابوں کی دنیا
نہاں خانوں میں اسکے آج گم ہے
نہیں اٹھتا عروسِ زندگی سے
تری اُف مدبھری آنکھوں کا کاجل
محبت کی جوانی سو رہی ہے
ترے جمپر کے کونے کے بغل میں

دباؤ

اپنے رنگیں ازار بند سے تو
میرے سازِ خموش کو مت چھیڑ
تیری لہرائی مدبھری زلفیں
میرے جذباتِ عشق کیا جانیں
جن سے آباد ہے ترا سینہ
وہ مرا سوز و ساز کیا سمجھے
ہاں مری بے زبان خاموشی
تجھکو تنہائیوں میں چھیڑیگی
اور شرما کے دونوں ہاتھوں سے تُو
بھینچ لیوے گی آہ وہ سینہ
جس سے ملنے کے واسطے مرے ہاتھ
چٹکیاں رات دن بجاتے ہیں
اور ہر وقت دھڑکنوں کے بغل
اِسی بے راگنی کو گاتے ہیں
تو نہ آئے گی کیا نہ آئے گی

گناہ!

ہاں گناہ اور کروں گا اب تو
کسی للچائی جوانی کی بغل میں جاکر
بیسوا اینٹھی ہوئی جھانک رہی ہے مجھ کو
میری رسدار جواں ٹانگوں کو
تیری بیباکی پہ ہنستی ہے جوانی میری
تو سمجھتی ہے کہ میں ریجھ گیا ہوں تجھ پر
تیری اس روندی ہوئی لاش کو روندیں گے ہزار
پھر بھی آئے گا نہ کمبخت ترے دل کو قرار
مفلسی مجھ کو پریشان کئے ہے ورنہ
میں کچل کر ترا بھرتا ہی بنا ڈالوں گا

زندگی کی کروٹ

چمن سکوں کی سے رہا ہے
ننھی ننھی کروٹیں
تنگائے کوہ میں تھا اک نحیف چشمہ سو رہا
کھلی جو آنکھ اُبل پڑا، روش کے خوابِ ناز پہ
تخئیل کی بساط پہ
ادھر نحیف سی تکس اڑی پروں کو تولتی
ہر ایک قید و بند کی رکاوٹوں کو توڑتی
ردائے گرم گرم میں چھپا ہوا تھا اک خروش
ہو جیسے مدبھرا ہوا کسی کی چشم مست میں
ابھا ابھا کے چل پڑی فضائے خوشگوار میں
بہار کے کنار میں
اور اُسکے نرم بازوؤں کے گیسوؤں کے سائے میں
خرد کا ایک پاسباں
مگر وہ ایک سیری ستم زدہ پلیٹ میں
نہ جانے کیسے گر پڑی
اٹھا پھر اک خروشِ غم
کہ جیسے اسکی زیست کا چھپا ہوا تھا زیر و بم
تو پھر تمام فرش پر وفورِ غم سے شور با ڈھلک گیا

تڑپ گیا، مچل گیا
مگر قضا کے دوش پر لدے ہیں ذلتوں کے داغ
کہ جن کے آج سوگ میں ہیں جو گھٹیں اُداس اُداس
مگر ابھی تلک یہ راز کسی پہ بھی نہ کھل سکا
چمن سکوں کی لے رہا ہے
ننھی ننھی کروٹیں

بیتے زمانہ کی یاد

وہ ململ سی شلوار تری ٹانگوں پر
خیر مقدم کو مرے وہ ترے سینہ کا اُبھار
اور ڈھلکتا ہوا ساری کا وہ آنچل ہر دم
دعوتیں دیتا ہوا میری نظر کو پیہم
یاد آتا ہے مجھے

یاد آتا ہے مجھے
تیرے جمپر کا وہ رنگین بٹن
کتنا ایثار پسند ——— ایک مجسّم ایثار
قمقمے نور کے پوشیدہ کئے دونوں طرف
اور شدّت سے وہ کھنچتا ہوا انگیا کا تناؤ
یاد آتا ہے مجھے

یاد آتا ہے مجھے
سرخرو گالوں پہ ہنستا ہوا غازہ تیرا
اور ترے لب پہ لپ اسٹک کی وہ باریک لکیر
تیری آنکھوں کا گرہ گیر خمار
تیری باہوں کی وہ کمزور گرفت

دعوتیں دیتا ہوا تیرا خرام
یاد آتا ہے مجھے

تیرے غمزوں کا سبک گام فریب
تیری انگڑائی کی بل کھائی ہوئی ایک لہر
لوٹتی رہتی ہے ابتک جو مرے سینہ پر
برق آسا لبِ لعلیں پہ مچلتا ہوا جھوٹ
ریشمی وعدوں کی رنگین رداؤں پہ سوار
آخری بار ملاقات کے وقت
یاد آتا ہے مجھے

یاد آتا ہے مجھے
شعلہ آسا ترے کوچہ کا دہکتا پتھر
سیکڑوں جس پہ طلبگار پڑے لوٹتے تھے
اور تری راہ کے کتے جنہیں رٹپاتے ہوئے
دُور۔ دُور۔ آہ بہت دور بھگا آتے تھے
بارہا میں بھی رہا ہوں اُن میں
یاد آتا ہے مجھے

یاد آتا ہے مجھے
اک جواں رات کا سین

تیرے کوچہ میں وہ یلغار، ہجوم اور میلہ
اور پھر ستیہ گرہ
تیر مژگاں کا ترے ناوک چارج
اک المناک سی بھگدڑ ترے متوالوں میں
گرتے پڑتے ہوئے عشاق کا غل
اور ترا حکم ــــــــ "بزن"
یاد آتا ہے مجھے

یاد آتا ہے مجھے
ہو کے مایوس مرا فوج میں بھرتی ہونا
اور یہ سُن کے ترا خوش ہونا
شکر میں اِس کے نمازیں پڑھنا
اور کہنا ــــــــ "کہ چلو خوب ہوا"
اچھا چھٹکارا ملا
اور پھر بن کے جمعدار مرا گھر آنا
اور پھر جانا ترے کوچہ میں
پانا دروازوں کو بند
نیند سے قبل بڑی دیر تلک
یاد آتا ہے مجھے

تلخی!

محمور جالندھری کی نظم "طوائف" سے متاثر ہو کر

ڈھل رہی تھی دوپہر
جیسے حسینوں کا شباب
ضو پاشیاں کرنے کے بعد
ڈھلنے لگے!
ناگہاں کانوں میں آئی اک صدا
نغمہ ریز و نغمہ بار
میرا احساس خفی بیدار یوں ہونے لگا
جس طرح برسات میں بنجر زمیں سے اُگ پڑیں گھاس اور پھول
یا شجر سے نیم کے
میٹھی میٹھی پتیاں!

کیا کہا ——— یہ پتیاں میٹھی نہیں؟
سچ ہیں اے ہمدم
تمیز رنگ و بو بالکل نہیں
جس کو تو تلخی سمجھتا ہے وہ ہے ایسی مٹھاس
جو کسی معشوق کے ہونٹوں میں مل سکتی نہیں
زندگی بھر تو انھیں چوسے تو کیا

ہاں تو تھا ذکرِ صد لئے دلنواز
لاؤ جھانکوں تو ذرا
دیکھوں یہ آخر کون ہے
ہیں! یہ تو نٹنی ہے کہ جو
انداز سے اور ناز سے
سینہ گراتی ہوئی، اٹکھیلیاں کرتی ہوئی
گاتی ہے کچھ ہنستی ہے کچھ

اے مہ لقا، اے مہ جبیں
تجھکو قسم اُس جسم کی
اور اُس میں جو کچھ ہے چھپی
وہ ہو بھی یا ہو وہی

تجھ سے مری درخواست ہے
ٹوٹے ہوئے محروم دلکی ایک یہ آواز ہے
جنتا کی تو اک فرد ہے
میں بھی اُسی کا رکن ہوں
تو اور میں چاہیں تو کر دیں، انقلاب

گر ایک رات
کر لے بسر تو میرے ساتھ

تو حرج ہی کیا، کچھ نہیں
کوئی دیکھے گا نہیں اور کوئی جانے گا نہیں
اور کوئی جانے گا بھی تو کیا ہوا؟
صبح جب ہو گی تو ہم نکلیں گے باہر اسطرح
جسطرح بچے جنے جڑواں کوئی
اور کہیں گے لو سُنو
رات ہم نے اس طرح کی ہے بسر
جسطرح کیا کرتے تھے ہم
اپنی جوانی میں بسر

اب نہیں وہ دور جب چھپ چھپ کے تم
شب کے سناٹے میں جاتے تھے کہیں
آ گیا اب انقلاب
انقلاب اے انقلاب

پیغامات

کچھ آزاد نظم کے متعلق

پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے صدر شعبۂ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی

دنیا کی ہر چیز بدلتی رہتی ہے اور بدلتی رہے گی لیکن کچھ ذوقی اور وجدانی چیزیں ایسی ہیں جن میں اگر تغیر ہوتا بھی ہے تو اتنی سست رفتار سے کہ صدیوں تک اس کا احساس نہیں ہوتا۔ گلاب کا تختہ اور بلبل کا نغمہ آج بھی اتنا ہی دلکش ہے جتنا آج سے سیکڑوں برس پہلے تھا۔ اب اگر کوئی شخص اس دلکشی کی قدامت سے بیزار ہو کر طے کرے کہ میں آج سے دھتورے کے پھول کو دیکھ کر وجد کیا کروں گا اور کوّے کی کائیں کائیں سن کر جھومنے لگوں گا تو اس فیصلے میں جدت ضرور ہوگی مگر یہ جدت "خشکہ باگندہ بر دزہ" والی جدت ہوگی۔ آزاد نظم کے وکیل آج کل اسی قسم کی جدت کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے انوکھے خیالات کے اظہار کے لیے وہ لفظ اور محاورے، وہ صرف و نحو کے قاعدے، وہ فصاحت و بلاغت کے معیار، وہ بحروں اور وزنوں کے پیمانے، جو صدیوں سے استعمال ہوتے چلے آتے ہیں، کام نہیں دیتے۔ اس دعوے میں اگر کچھ اصلیت ہوتی تو یہ ناگہانی، قلب ماہیت یا تاریخی تسلسل کے انقطاع کی ایک عدیم النظیر مثال ہوتی مگر آزاد نظمیں خود اس دعوے کی تکذیب کرتی ہیں۔ ان میں کچھ فرسودہ خیالات ہیں، کچھ سوقیانہ جذبات ہیں جنہیں اجنبی اسلوبوں، بے محل لفظوں، بھدی تشبیہوں اور رکاوٹ استعاروں سے ابہام پیدا ہو جاتا ہے اور ٹوٹی پھوٹی بحروں کے استعمال سے ایک بے ڈھنگا پن آ جاتا ہے۔ اسی ابہام کی بدولت اسے قدامت پسند

ذہنیت سے بالاتر بتایا جاتا ہے اور اسی بے ڈھنگے پن کو جدت طرازی قرار دیا جاتا ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ آزاد ناظموں کو نہ زبان پر عبور ہے نہ نظم کی قدرت ہے۔ آزادی اور جدت کے پردے ان کمزوریوں کو چھپا نہیں سکتے۔ مشاق سخنوروں کا ذکر نہیں معمولی ناظم بھی ہر آزاد نظم کو، بشرطیکہ وہ معنی سے آزاد نہ ہو، موزوں و مقفیٰ نظم میں آسانی سے تبدیل کر سکتا ہے۔ وزن اور قافیے کی اصولی بحثوں کو چھوڑیئے، حقیقی شاعروں کے عملی تجربوں پر نظر کیجیے۔ اکبر کی اصلاحی شاعری، چکبست کی سیاسی شاعری، جوش کی انقلابی شاعری اور اقبال کی فلسفیانہ شاعری میں کیسے کیسے جدید خیال کیسے کیسے حسین انداز سے ادا کیے گئے اور وزن و قافیہ اظہار خیال میں کبھی حائل نہ ہوا۔ یہ آزاد ناظم کون سے عرش کے تارے توڑ کر لاتے ہیں جو موزوں و مقفیٰ نظم کے جامے میں نہیں سماتے؟

اردو کے بعض مخلص بھی خواہ اس بے لگام شاعری کو دنیائے ادب میں ایک تباہ کن فتنہ سمجھ رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک فتنہ تو ضرور ہے مگر تباہ کن نہیں ہے۔ چورن والوں کے لٹکے اور چنا جور گرم والوں کی بانیاں سن کر محظوظ ہونے والے ہمیشہ موجود رہا کیے مگر حقیقی شاعری کو اُن سے کیا نقصان پہنچا؟ ڈفالیوں کے ربانے اور کہاروں کے ہڑک ہمیشہ بجتے رہے مگر اُن سے ستار اور طبلے کی مقبولیت پر کیا اثر پڑا؟ دھوبی اپنے برہے اور کنجڑے اپنے "خیال" ہمیشہ گایا کیے مگر اُن سے ہندوستانی موسیقی کا کیا بگڑا؟ آزاد نظم زبان پر ناکافی عبور، صوتی آہنگ کے ناقص احساس، اور شعریت کے ناتربیت یافتہ مذاق کے مجموعی اثر کی پیداوار ہے۔ دل کی دنیا جو شاعری کی قلمرو ہے آزاد نظم کا وہاں گزر نہیں۔ وہ زبان سے نکلتی ہے اور کانوں تک پہنچ کر رہ جاتی ہے۔ نہ از دل خیزد، نہ بر دل ریزد۔

آزاد نظم کی کل کائنات اُس کی جدّت ہے اور جدّت کو ثبات کہاں؟ جو عمارت صرف جدّت کے ستونوں پر کھڑی ہو اُس کا انجام ظاہر ہے کہ اِدھر جدّت رخصت ہوئی اُدھر وہ عمارت زمین پر آ رہی۔ ایسی بودی اور کُھسپھُسی نظم میں کیا دم ہے کہ وہ ہماری شاعری کے فطری ارتقا کا رُخ موڑ کر اُسے پھر ابتدائی منزلوں کی طرف پلٹا دے۔

آزاد شاعری — کدھر؟

(از مولانا نیاز فتحپوری)

یوں اگر ہم کسی سے سوال کریں کہ آزاد شاعری کے متعلق جنابکا کیا خیال ہے، تو وہ یقیناً اس کی تائید کریگا، کیونکہ لفظ آزاد کا جو مفہوم ہمارے سیاسی لٹریچر نے پیدا کر دیا ہے اس پر کسی کو اعتراض ہو ہی نہیں سکتا اور اس سے منسوب ہونیکے بعد ہر بات اچھی معلوم ہوتی ہے، چنانچہ اول اول جب میں نے "آزاد شاعری" کا ذکر سنا تو میں نے بھی اس کا مفہوم کچھ ایسا ہی قرار دیا تھا جیسے آزاد سیاست، آزاد تجارت، آزاد صحافت وغیرہ، لیکن جب میری نگاہ سے اس شاعری کے بعض نمونے گزرے، تو میں ان میں سے بعض کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

شاعری میں آزادی کا کوئی مفہوم اگر قابل قبول ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ قدما کی تقلید ترک کرکے اسلوب بیان، تشبیہ و استعارات، مطالب و معانی میں جدت سے کام لیا جائے، لیکن ہمارے بعض نوجوان شاعروں نے "آزاد شاعری" کا مفہوم وہی قرار دیا ہے جسے ہم اپنی زبان میں بے لگام، دریدہ دہن، غیر ذمہ دار، اور منہ پھٹ کے الفاظ سے ظاہر کرتے ہیں۔

ایسی شاعری کرنے والوں کا نصب العین جو کچھ ہو، لیکن ہمیں اس میں صرف دو باتیں نظر آتی ہیں، ایک یہ کہ جو دل میں آئے اُسے بے پس و پیش کہہ ڈالنا اور جیسے [illegible] میں آنا تو یہ نہ دیکھنا کہ ہمارا اسلوب بیان کیا ہے، گویا آزاد شاعری کا مقصود ان کے نزدیک صرف ناگفتنی باتوں کا اظہار رہے اور وزن کے لحاظ سے [illegible] ان کی سی کیفیت کہنا، جس کو ہم نظم تو یقیناً نہیں کہہ سکتے اور نثر کہتے اسلئے

ڈر معلوم ہوتا ہے کہ اگر واقعی نثر نگاری کا یہی اسلوب کہیں قائم ہو گیا تو پھر ہمارے لٹریچر کا خدا حافظ ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ "ترقی پسند لٹریچر" اس نوع کی شاعری کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ ناروا بدعت واقعی اس کے حدود سے باہر نہیں تو پھر۔

الوداع اے صبر و تقویٰ الوداع اے عقل و ہوش!

نئی شاعری

(مولانا عبدالمجید صاحب سالک ایڈیٹر انقلاب لاہور)

بعض "جدید" شعراء نے آج کل عروض سے بے نیاز ہو کر جو شاعری اختیار کر رکھی ہے۔ اُس پر ہمارا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس شاعری کے کوئی اصول و قواعد نہیں ہیں۔ یہ طرز تخیل اور یہ انداز نظم کبھی مقبول عام نہیں ہو سکتا اسلئے کہ شاعری اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور اس جدید شاعری کو موسیقی سے کوئی تعلق نہیں۔ میں تجدید اور تجدّد کا مخالف نہیں ہوں لیکن تخیل ہو یا عروض دونوں میں حدّ معین سے تجاوز کرنے والے کو اپنی زبان۔ اپنے ادب اور اپنے ملک کے مجموعی کلچر کو کسی حالت میں نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ ورنہ اہل ملک کا ذوق ایسی بے سرو پا تخلیقات کو رد کر دے گا اور اس جدید شاعری کو رواج حاصل نہ ہو گا۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کا اپنی ادبی مساعی کو رائگاں کر دینا بے حد دردناک ہے۔

ہمیں اس جدید شاعری کی حوصلہ شکنی کے لئے ہر حربہ استعمال کرنا چاہئے اور فرقت صاحب نے جو حربہ اختیار کیا ہے وہ سب دوسرے حربوں سے زیادہ موثر ہے۔

آزاد شاعری

(مسٹر شوکت تھانوی)

میں اُس غلام دور میں پیدا ہوا ہوں کہ آزادی کا کوئی تصوّر اُس غلام گردش میں سما ہی نہیں سکتا جس کو عرفِ عام میں دماغ کہتے ہیں خصوصًا وُہ آزادی جو سیاسی طور پر تو حاصل نہ ہو سکے مگر اتفاقًا فنّی طور پر حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اسی قسم کا جو غصہ آج کل ادب اور شاعری پر اُتارا جا رہا ہے اس کو سمجھنے کی کوشش کرنے کے باوصف میں قاصر ہوں اور صرف اتنا سمجھ سکا ہوں کہ آزاد شاعری۔ دورِ جدید کا وہ تقاضا ہے جس کو سمجھنے سے پہلے سمجھانے کی کوشش ہمارے بعض "سمجھناک" شاعر کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اب وہ وقت نہیں ہے کہ طول طویل مثنویاں اور مسدس کہے جائیں۔ نہ ہمارے پاس اب اتنی فرصتیں ہیں کہ نظموں اور غزلوں کے مقررہ اوزان اور پیمانوں سے سر کھپایا جائے۔ سچ پوچھئے تو یہ راز اب سمجھ میں آچکا ہے کہ شاعری اُفقی شغل بیکاری ہے۔ اور بیکار وقت آج کل کے بیروزگاروں کے پاس بھلا کہاں ممکن ہے لہذا وہ اپنی فرصت کے معیار پر شاعری کو بھی لے آئے ہیں ہوتا ہے کہ کسی وقت کسی کو صرف ایک منٹ فرصت کا ملتا ہے اور وہ ایک منٹ والا مصرع کہہ لیتا ہے کہ ع

اے حسینہ میں تجھے ڈھونڈ نکالوں گا ضرور

پھر کبھی نصف منٹ کا وقت ملا لہذا نصف منٹ والا مصرع کہہ لیا۔ ع

تو جہاں جا کے چھپے

پھر کبھی چوتھائی منٹ ملا اور مصرع ہوا۔ ع

آنکھ سے دُور

اسی طرح وقت کی مقدار کے مطابق نظم مرتب ہو کر کچھ یوں ہو جاتی ہے کہ۔

اے حسینہ میں تجھے ڈھونڈھ نکالوں گا ضرور
تو جہاں جا کے چھپے
آنکھ سے دور
اسکی پرواز نظر سے بھی ہر امکاں سے دُور
اور اگر
تو نے وہاں سے بھی کھسکنا چاہا
تو ترے سر کی قسم
میں بھی کھسک جاؤں گا
اپنے ادراک سے دُور
اس قدر دور کہ تو مجھ سے قریں ہو جائے
پھر جدا کر نہ سکے
اپنے دریچہ سے کبھی
سُرخ آندھی کے تھپیڑوں سے بھی کچھ ہو نہ سکے
وہ بھی ناکام رہیں
تو بھی ہنسے
ہم بھی ہنسیں
جیسے دو توں کے دماغوں میں نظر آئے فتور
اے حسینہ میں تجھے ڈھونڈھ نکالوں گا ضرور

ترقی پسند ادب

(ابن صاحب سلونوی)

نیا ادب۔ اور ترقی پسندی کی ابتدا کیسے ہوئی یہ پھر کبھی بتاؤں گا۔ تجربہ کے بعد میں جس نتیجہ پر پہونچا ہوں پہلے اُسے سُن لیجئے۔ انتہائی بے ادبی کا نام نیا ادب۔ اور تمام بے اصولیوں کو ترقی پسندی کہتے ہیں۔

نئے ادب کے حلقہ میں ترقی پسندی کے ماتحت رہنے والوں کے خیال سے یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ایک لڑکا اپنے باپ کے وجود ہی سے دلچسپی لے اور ایک باپ ہمیشہ لڑکے کو لڑکا ہی سمجھتا رہے۔ اس دور ترقی میں ہر نظریہ نو اسی اعتبار سے بدل جانا چاہئے اور ہر حیثیت سے لوگوں کو منکر ہو جانا چاہئے خواہ وہ سورج کی طرح روشن ہو۔ یہی دلیل ترقی پسندی ہے۔

عورت اس دور میں آزادی چاہتی ہے تاکہ شعبۂ حیات میں مردوں کے دوش بدوش وہ بھی اپنی زندگی کا ثبوت دے سکے یہاں تک تو غنیمت تھا لیکن نیا ادب جس "دین" کی تبلیغ کر رہا ہے اس کی رو سے یہ کہا جاتا ہے کہ عورت خود ایک زندگی کی حقیقت ہے اور اس حقیقت کو ہمیشہ بے نقاب ہونا چاہئے۔ تاکہ سارا عالم اس عریانی سے لطف اندوز ہو اسکی آزادی پابندی کے حدود سے بالاتر ہے اگر اُس کی راہ میں اُس کی عصمت بھی حارج ہو تو اسے ٹھکرا دینا چاہیئے۔

ظاہر ہے ایسی جگہ شعر کو موزونیت سے اور ادب کو اخلاق سے کیا لگاؤ ہو سکتا ہے جہاں بے اصولی ہی کو اصول کہا جاتا ہو اور بدعنوانیاں اس کا رنگین عنوان ہوں ایسے ادب اور ایسی ترقی پسند شاعری کو کہیں گہرائی میں دفن کر دینا چاہئے۔

آزاد نظم

جناب افسر میرٹھی

آزاد نظم اصل میں ترجمہ ہے (FREE VERSE) کا، انگریزی میں فری ورس کا رواج ایک مدت سے ہے لیکن اوّل تو انگلستان کے باشندوں کی طبائع اس قسم کی نظموں سے مانوس ہیں دوسرے وہاں اخلاق کی پستی کو کبھی ادبیات عالیہ میں راہ پانے کا موقع نہیں دیا گیا۔ ہمارے یہاں کچھ ابتدا ہی سے رنگ بگڑ گیا، یہاں ترقی پسند شاعری اخلاق اور مذہب، خدا اور رسول سب کے خلاف شمشیر برہنہ ہو کر نمودار ہوئی۔

ہر ادب زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے، اور زندگی میں جو انقلابات رونما ہوتے رہتے ہیں وہ ہمیشہ ادب میں جگہ پاتے ہیں، اس طرح اگر زندگی ترقی پسند ہے تو ادب بھی ترقی پسند رہتا ہے، یہی سبب ہے کہ ادب میں ہمیشہ نئی نئی راہیں نکلتی رہتی ہیں۔

اخلاق و کردار کی بلندی ہمیشہ شعر و ادب کے پیش نظر رہی ہے، اگر ادبیات ہی کو ہم فواحش کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بنا لیں تو پھر اصلاح اخلاق و کردار کا کیا ذریعہ باقی رہ جائے گا۔

پھر یہ بھی کوئی نئی چیز تو نہیں ہے، جعفر زٹلی، چرکین، جان صاحب نے کیا کسر چھوڑ دی تھی جس کو جنسی رجحانات کی نفسیاتی تحلیل کے جدید علمبردار پیش فرمانے کی تکلیف گوارا کر رہے ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ قدیم زمانے کے فحش نگار ان مزخرفات کو فخر و مباہات کے ساتھ پیش کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔

میرے نزدیک ترقی پسند شعراء کو انکے حال پر چھوڑ دینا چاہئے۔ انکی تحریروں کا کوئی اثر زبان پر نہیں پڑے گا زبان ایک سمندر ہے اس کے پانی کو تھوڑی بہت گندگی خراب نہ کر سکے گی۔

آزاد شاعر

از پروفیسر سید علی عباس صاحب حسینی ایم اے

پروفیسر کنہیا لال کپور نے ادب لطیف میں جو بیج بوئے تھے وہ حضرت غلام احمد فرقت کی آبیاری سے اس مجموعے میں مع برگ و بار نمودار ہوئے ہیں۔ اس لئے دو گھڑی دل بہلانے کی غرض سے اس کے چھتنار اور گھنیرے سائے میں بیٹھنا ہر ادیب پر فرض ہے۔ البتہ یہ دھڑکا ضرور لگا رہے گا کہ کہیں اس ظریفانہ خوشہ چینی کے سلسلے میں جدید اُردو شاعری کے وہ رطب تازہ بھی نہ اڑا دئے جائیں جن کا باقی رہنا اُردو کے نمو کے لئے ضروری ہے یا محض ضد میں وہ سڑے گلے پھل نہ مطبوع طبائع بن جائیں جن کا دفن کر دینا ہی زبان و ادب کے صحت اور وقار کیلئے لازمی ہے۔ بہر نوع وہ صاحبان ذوق و نظر جن کے کام و دہن صرف ترقی پسندانہ شاعری سے لذت یاب ہونے کے عادی بن چکے ہیں حضرت فرقت کے اس نئے "سلاد" میں بھی بہت کچھ "سواد" پائیں گے اور مجھے یقین ہے کہ "نئی قدروں" پر ان کی قدرت کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھیں گے۔

شعر میں موزونیت کی اہمیت

ماخوذ از "ہماری شاعری"

مصنفہ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے صدر شعبۂ فارسی و اردو
لکھنؤ یونیورسٹی

کلام کے موزوں ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جائے جن کو ادا کرتے وقت آواز میں ایک خوبصورت تسلسل یا ترنم پیدا ہو جائے اور جن میں باہم ایک لذت بخش تناسب اور توازن ہو عروض کی زبان میں یوں کہنا چاہیے کہ موزوں کلام وہ ہے جس کے حرفوں کی حرکتوں اور سکونوں کی ترتیب میں ایسا نظام ہو اور ان حرکتوں اور سکونوں کی تعداد اور مقدار میں ایسا تناسب ہو کہ اُس نظام اور تناسب کے ادراک سے نفس کو ایک خاص طرح کی لذت حاصل ہو۔ اس لذت کا احساس انسان کی فطرت میں داخل ہے اور اسی فطری احساس پر غور کرنے اور اُس کا استقراء اور تجزیہ کرنے سے وہ اوزان دریافت ہوئے جن کی مطابقت سے کلام میں موزونیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اِن وزنوں کے نام اور پیمانے عروض کی کتابوں میں دئیے ہوئے ہیں۔ لیکن اصول موزونیت کے ماتحت شعر کے نئے اوزان دریافت کرنے کا امکان اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

لفظوں کا وہ مجموعہ جس میں موزونیت کی صفت پائی جائے مصرع کہلاتا ہے۔ اور مصرعوں کا وہ مجموعہ جس میں فکری تسلسل یا معنوی ربط پایا جائے "نظم" کہلاتا ہے یہاں یہ نکتہ ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ مصرعوں کی انفرادی موزونیت، اور چیز ہے اور نظم کی مجموعی موزونیت اور چیز ہے۔ مصرعے کی موزونیت یہ ہے کہ وہ کسی عروضی وزن کے مطابق ہو۔

اور نظم کی موزونیت یہ ہے کہ اُس کے مصرعوں میں باہم تناسب اور توازن ہو۔ اس کے لئے مصرعوں کو اس طرح ترتیب دینا چاہیے کہ کلام کی ایک ہیئت معین ہو جائے۔ اس ہیئت کے وجود کا علم یا اُس کی تکرار نظم کی موزونیت کے احساس کے لئے ضروری ہے یعنی یہ ضروری ہے کہ اُس ہیئت کا تصور یا تو پہلے سے ذہن میں موجود ہو یا اُس کی تکرار سے ذہن اُس کا تصور پیدا کرے۔ دونوں صورتوں میں نظم کی ہیئت کا ذہنی تصور اور اُس (نظم) کی واقعی ہیئت ان دو چیزوں کی مطابقت سے نظم کی موزونیت کا احساس ہوتا ہے۔ اور اس احساس سے کلام میں وہ دلکشی پیدا ہوتی ہے جو موزونیت کے ساتھ فطرتاً وابستہ ہے۔ نظم کی ہیئت معین کرنے اور اُس ہیئت کو محسوس کرنے میں قافیہ بہت مدد دیتا ہے اور ردیف اُس ہیئت کو اور واضح کر دیتی ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ شعر کے لئے موزونیت ضروری نہیں ہے کیونکہ شاعرانہ خیالات نثر میں بھی ادا ہو سکتے ہیں۔ یہ بات کچھ ایسی ہی معلوم ہوتی ہے جیسے کوئی کہے کہ سائنس کے مسائل نظم میں بھی بیان کئے جا سکتے ہیں۔ ان دونوں قولوں میں صداقت کا عنصر غالباً برابر نکلے گا لیکن یہاں اس سے بحث نہیں کہ کیا ہو سکتا ہے دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہوتا ہے اور کیا ہونا چاہیئے۔

جس طرح یہ ایک بدیہی بات ہے کہ علمی مسائل کی تفصیلی بحث کے لئے وزن کی قید سے نظم کا دامن تنگ ہو جاتا ہے۔ اُسی طرح یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ شعر کا اثر نثر کی نامحدود وسعت میں گم ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وزن کی حد بندیاں شعر کے اثر کو قوی کر دیتی ہیں۔ انسان کی فطرت خود بتاتی ہے کہ شاعرانہ خیالات کا اظہار یا خیالات کا شاعرانہ اظہار اپنی تکمیل کے لئے نظم کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ شاعری جذبات کی ترجمانی ہے۔ اور انسان کے گہرے جذبات فطرتاً موزونیت اور موسیقیت کے ساتھ ظاہر ہونا چاہتے ہیں۔ اس نکتے کو سمجھنا ہو تو کسی بیٹے کی موت پر

ماں کے بین سنو کسی سحر بیان مقرر کی پرجوش تقریر پر غور کرو نثر کی وہ عبارتیں پڑھو
جن میں جذبات کا زور شور دکھایا گیا ہے۔

لفظوں کو نظم کی صورت میں ترتیب دینا کلام میں اثر یعنی جذبات کو متحرک کرنے
کی قوت پیدا کر دیتا ہے۔ مثلاً اگر کہیں کہ "دنیا کے واقعات دنیا کے ساتھ ساتھ ہیں۔ جو
کچھ آج ہو رہا ہے یہی بارہا ہو چکا ہے" تو اس کلام سے دل ذرا بھی متاثر نہیں ہوتا۔
لیکن اگر اسی بات کو نظم کی صورت میں یوں ادا کریں ؎

دنیا کے ساتھ ساتھ ہیں دنیا کے واقعات
جو آج ہو رہا ہے یہی بارہا ہوا (صفی)

تو دل پر ایک خاص طرح کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ موزونیت سے کلام میں اثر پیدا ہوتا تو مسلم
ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ کسی کلام میں کوئی ایسی بات ہو جو موزونیت کے اثر کو زائل
کر دے مثلاً ؎

ہاتھی کو بڑا کیا بڑا ہے
لیٹے کو کھڑا کیا کھڑا ہے

یہ کلام بھی موزوں ہے مگر اس میں اثر نہیں۔

جب یہ مسلم ہے کہ موزونیت سے کلام میں جذبات کو متحرک کرنے کی قوت پیدا
ہو جاتی ہے، تو شاعری جس کا مقصد ہی جذبات کا اظہار اور احساسات کا اشتعال
ہے، اُس کے لئے پیرایۂ نظم کا فطری ہونا کسی دلیل اور بحث کا محتاج نہیں معلوم
ہوتا۔ موزونیت سے شعر کے حسن اور اثر میں جو اضافہ ہو جاتا ہے اُس کا اندازہ
کرنا ہو تو کسی اچھے شعر کی نثر کیجئے اور دیکھئے کہ اُس میں وہی اثر باقی رہا جو اصل شعر میں تھا
اور کسی شعر کی نثر کرنے کے معنی یہی تو ہیں کہ موزونیت کی ضرورت سے لفظوں کی نظری
بااصولی ترتیب میں جو فرق کرنا پڑا تھا وہ دور کر دیا جائے۔ شعر کی نثر کرنے کے بعد یعنی
لفظوں کی ترتیب درست ہو جانے پر کلام کے اثر کا کم ہو جانا اور نظم کی حالت میں

ترتیب الفاظ ناقص ہونے کے باوجود اثر کا بڑھ جانا! یہ کیوں؟ اسی لئے تو کہ موزونیت نے نہ صرف بے ترتیبی کے عیب کی تلافی کر دی بلکہ اس سے بڑھ کر کلام کے اثر میں اضافہ کر دیا۔ اسی بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تعقید لفظی یعنی جملے کے لفظوں کی صحیح ترتیب میں خلل پڑ جانا کلام کا ایک نمایاں عیب ہے لیکن نظم میں یہ عیب ایک حد تک محسوس ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً نثر کے دو فقرے ہیں "یہ جور کے خیال" اور "اب زمیں سے وہ شکوے ہیں"۔ اگر لفظوں کی ترتیب بدل کر یوں کہیں "خیال جور کے یہ" اور "زمیں سے اب ہیں وہ شکوے"۔ تو یہ فقرے سماعت پر بار ہوتے ہیں لیکن یہی فقرے جب نظم میں آ جاتے ہیں تو تعقید کا احساس تک نہیں ہوتا۔ شاعر کہتا ہے ؎

خیال جور کے یہ گردش جہاں سے نہ تھے
زمیں سے اب ہیں وہ شکوے جو آسماں سے نہ تھے

نظم کی دل نشینی یوں بھی ثابت ہوتی ہے کہ وہ نثر سے کہیں جلد یاد ہو جاتی ہے اور کہیں دیر تک یاد رہتی ہے۔ اُن نظموں کا ذکر نہیں جن میں خیال کی ندرت یا طرز ادا کی دلکشی سے حافظے کو مدد پہنچتی ہے۔ ایسی نظمیں بھی آسانی سے یاد ہو جاتی ہیں جن کو نثر سے ممتاز کرنے والی چیز موزونیت اور صرف موزونیت ہوتی ہے سبب یہ ہے کہ قوت حافظہ جب کسی چیز سے رم کرتی ہے تو نظم ہی کے منتر سے اُس کو رام کرتے ہیں مثلاً ہندوستان پر جن مسلمان خاندانوں نے حکومت کی اُن کے نام تاریخی ترتیب کے ساتھ یاد رکھنا بچوں کے لئے مشکل ہوتا ہے لیکن اس بیت کے یاد کر لینے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوتی ؎

غزنی و غوری ہوئے اور بعد ازاں آئے غلام
خلجی، تغلق، سید و لودی، مغل پر اختتام

اسی طرح آسمانی برجوں کے نام ترتیب کے ساتھ بچوں کا کیا ذکر بوڑھوں کو بھی یاد

نہیں رہتے لیکن یہ قطعہ ایک دفعہ یاد ہو جائے تو پھر کبھی نہیں بھولتا ؎

برجہا دیدم کہ از مشرق بر آوردند سر
جملہ در تسبیح و در تہلیل حیّ لا یموت

چوں حمل، چوں ثور، چوں جوزا و سرطان و اسد
سنبلہ، میزان و عقرب، قوس و جدی دلو و حوت

بے معنی کلام کا یاد رکھنا بہت مشکل ہے لیکن نظم کی مدد سے یہ مشکل بھی آسان ہو جاتی ہے۔ یہ بیت کس کو یاد نہ ہوگی ؎

ٹوٹی دریا کی کلائی زلف الجھی بام میں
مورچہ مخمل میں دیکھا آدمی بادام میں

ان باتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ موزونیت کو ہمارے دل کے ساتھ کوئی خاص لگاؤ ہے۔ اور اس تمام بحث سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شعر کے لئے موزونیت نہ کوئی رسمی چیز ہے نہ اتفاقی۔ بلکہ شاعری کی حقیقت اور مقصد دونوں کا مقتضا یہی ہے کہ شعر نظم کے لباس میں ظاہر ہو۔ دنیا کی تمام زبانوں میں شعر نے نظم ہی کی صورت اختیار کی ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ شاعرانہ خیالات کے اظہار کا فطری ذریعہ نظم ہے۔

اس سلسلے میں قافیے اور ردیف کے متعلق چند لفظ کہنا خلاف محل نہ ہوگا۔ نظم کی صورت یا ہیئت کو واضح کرنے میں قافیے اور ردیف سے جو فائدہ پہنچتا ہے اس کا ذکر اوپر ہو چکا۔ یہاں مختصراً یہ بتانا ہے کہ کلام کی شعریت کو ان سے کیا مدد ملتی ہے۔ اگرچہ یہ چیزیں وزن کی طرح شعر کے عناصر میں شمار نہیں ہو سکتیں لیکن اس میں شک نہیں کہ جن چیزوں سے شاعری ساحری بن جاتی ہے اُن میں قافیے اور ردیف کو ممتاز درجہ حاصل ہے۔ بدیہیات کے لئے دلیل کی حاجت نہیں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے

میر نے ذیل کے دو شعروں میں ایک ہی مطلب ادا کیا ہے ؎

ظالم نگاہِ خشم اِدھر کی غضب کیا　　حالت سے میرے دل کی خبر تجھکو کیا نہ تھی

نگاہِ خشم اِدھر تونے کی قیامت کی　　خبر نہ تھی تجھے کیا میرے دل کی حالت کی

دونوں شعروں میں موزونیت پوری طرح موجود ہے۔ دونوں کے الفاظ اور اُن کی بندش بھی بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔ مگر قافیے اور ردیف کی سحرکاری نے دوسرے شعر میں کتنا حسن اور اثر پیدا کر دیا ہے۔

بعض لوگ انگریزی میں غیر مقفیٰ نظمیں دیکھ کر اور بعض غیر ملکی نقادوں کی رائے پڑھ کر یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ قافیہ اور ردیف شاعرانہ تخیل کے پاؤں کی زنجیریں ہیں، اور اس لئے قابلِ ترک۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اِن قیدوں سے اگر ایک طرف تخیل کی آزادی میں کسی قدر فرق پڑتا ہے تو دوسری طرف کلام کے اثر میں بہت کچھ اضافہ بھی ہو جاتا ہے۔ اور اثر ہی شعر کی جان ہے۔ مذاقِ سلیم کبھی اس چیز کے ترک کا فتویٰ نہیں دے سکتا جو شعر کے اثر میں اضافہ کر سکے۔ اس کے علاوہ زیادہ تر تو یہ ہوتا ہے کہ جس طرح گزرگاہ کی تنگی دریا کی روانی میں طغیانی اور جوش میں خروش پیدا کر دیتی ہے اسی طرح وزن، قافیہ اور ردیف کی قیدیں شاعر کی تخیل کو رسا اور فکر کو تیز کر دیتی ہیں۔

جو شاعر ان قیدوں کے ساتھ اظہارِ مطالب میں عاجز ہوں وہ خود کو آزاد ہی رکھیں۔ مشّاق سخنور کو ان قیدوں سے الجھن نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ انہیں سے اپنے کلام کو سجاتا اور اثر کے نشتر کو تیز کرتا چلا جاتا ہے۔ دیکھو انیس کے مرثیے مسدس اور مسلسل طولانی نظمیں ہیں، جن کے کل بند مقفیٰ اور بیشتر مردّف بھی ہیں لیکن احساس بھی نہیں ہوتا کہ شاعر کو اظہارِ خیال میں کہیں دشواری ہوئی ہو۔ علامہ اقبال کی کل نظمیں موزوں اور مقفیٰ اور بہت سی مردّف بھی ہیں لیکن ان پابندیوں کے ساتھ

انھوں نے کیسے کیسے بلند، نازک اور نئے خیالوں کو کیسی کیسی دلکشی اور دل نشینی کیساتھ ادا کیا ہے۔

عہد حاضر کا ایک ذی علم اور ممتاز انگریز شاعر بھی ان خیالات کی تائید کرتا ہے۔ وہ وزن اور قافئے کی بحث کو متعدد مثالوں سے واضح کرنے کے بعد کہتا ہے:

"میری گزارش یہ ہے کہ ان سب اقتباسوں میں وزن اور قافئے سے کلام کا اثر بڑھ گیا ہے۔ اور ان پابندیوں کیساتھ فکر کرنا شاعر کے لئے ایک محرک ثابت ہوا ہے، جو اُسکو ہوشیار اور مجبور کرتا رہا ہے کہ وہ اپنے الفاظ پر نظر رکھے۔ اپنے آلات کا انتخاب کرے۔ اور اپنے بیان کو لطیف بنائے۔ یہاں تک کہ کلام کی ساری سستی اور کمزوری دور ہو کر صرف نشتریت باقی رہ جائے[۱]"

اس نقاد شاعر کے آزمودہ قول کے سامنے ناشاعر نقادوں کا مفروضہ بیان کیا وقعت رکھتا ہے؟

---

[۱]

تنقیدی مضامین

تعارف

(مسٹر صباح الدین عمر ایم۔اے)

غلام احمد صاحب فرقت بی۔اے میرے بڑے مخلص دوست ہیں جن سے سال بھر میں چھ مہینے میری لڑائی رہتی ہے۔نام کے لحاظ سے وہ قطعاً غیر شاعر معلوم ہوتے ہیں مگر اس کمی کو انھوں نے تخلص سے پورا کر لیا ہے گو اس میں "رجعت پسندی" کی بو آتی ہے۔جب انکی خانگی زندگی کی تنہائی باقی نہیں رہی تو میں نے اُن سے بہت کچھ کہا کہ وہ اپنا تخلص "وصل" رکھ لیں، مگر وہ کسیطرح اسپر راضی نہیں ہوئے "پتہ نہیں کیوں" شائد اس تخلص میں کچھ "رازہائے سربستہ" ہوں جن کی وجہ سے "وصل" کے بعد بھی "فرقت" کا پہلو موجود ہے لیکن اسپر بحث کرنے کا نہ یہاں موقع ہے نہ اسکی ضرورت۔

فرقت صاحب اُس وقت سے شاعری کر رہے ہیں جب سے انھوں نے فرقت تخلص رکھا ہے لیکن نہ تو کبھی مشاعرہ میں شریک ہوتے ہیں، نہ ہر ایک کو اپنا کلام سناتے ہیں۔اور نہ اپنی نظمیں رسائل و جرائد میں بھیجتے ہیں۔ایک زمانہ میں انھوں نے اپنے ہفتہ وار پرچہ "صداقت" میں اپنی قومی نظمیں شائع کرنا شروع کی تھیں مگر وہ پرچہ بند ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ نظمیں بھی۔اگر وہ چاہتے تو اُن متعدد جرائد میں جن میں وہ کام کرتے تھے آسانی سے کہیں دور گئے بغیر اپنی نظمیں شائع کرتے رہتے مگر انھوں نے یہ بھی نہیں کیا۔کچھ نظمیں اِدھر اُدھر کبھی کبھار چھپنے کیلئے بھیجدیتے ہیں ورنہ اُن کا سارا مجموعہ اُن کے کپڑوں کے بکس میں رکھا رہتا ہے۔معلوم نہیں جب انکی اہلیہ محترمہ ان کے گرم کپڑے دھوپ میں رکھنے کے لئے نکالتی ہیں

تو اس مجموعہ کو کبھی دھوپ دکھا دیتی ہیں یا اسکی زبان سے بھی یہ کہلانا بہتر سمجھا جاتا ہے کہ ؎ برہنہ نہ دیدہ تنم آفتاب

بہر حال جن لوگوں نے فرقت کے اشعار سنے ہیں وہ اُن کی فنّی خوبیوں سے واقف ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ ان کی شاعری میں کتنے جوہر پوشیدہ ہیں اس کتاب میں فرقت کی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کرنے کی گنجائش نہیں اسلئے میں انکی صرف ایک آدھ غزل اور نظم کے اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں ارباب نظر کو ان سے کچھ نہ کچھ فرقت کی شاعرانہ صلاحیت کا اندازہ ہو جائیگا ان کی غزلوں میں سے صرف تین شعر مجھے یاد ہیں جو مجھے بہت پسند ہیں ؎

تھے دل کے حوصلے ہستی سے بھی کہیں آگے
جنوں میں پایۂ طلب ڈگمگا دیئے کس نے؟

دیر ہا ہوں حیات کو آواز
زندگی ہے کہ سوئی جاتی ہے

میں دامانِ حوادث پر مچل جاؤں تو کیا ہو گا
غم ہستی سے بھی آگے نکل جاؤں تو کیا ہو گا

فرقت کی ایک نظم کے چند بند جس کا عنوان ہے عزم ملاحظہ ہوں ؎

تری راہ میں سخت کانٹے پڑے تھے
مصائب تری راہ روکے کھڑے تھے
ہر اک سمت دشمن کے لشکر پڑے تھے
مگر حوصلے تیرے ان سے بڑے تھے
سپاہی مبارک ترا عزم منزل

تو دشمن کو خاک اور خوں میں ملائے — جدھر جائے تو قصر و ایواں ڈھائے
غلامی سے دنیا کا دامن چھڑائے — خدا تیری قربانیاں راس لائے
سپاہی مبارک ترا عزم منزل

انکی دوسری نظم جس کا عنوان ہے "سپاہی" اس کے دو بند ملاحظہ ہوں ؎

سج لے پھر ہتھیار سپاہی ۔ سج لے پھر ہتھیار
دیش کی رکھشا کا تو سہارا — بھارت کی جنتا کا دلارا
تیرا جیون سب سے پیارا — تو ہے اک سیلاب کا دھارا
کر دے بیڑا پار سپاہی ۔ کر دے بیڑا پار
زور پہ آئی دکھ کی بھیا — ڈوب نہ جائے دیس کی نیّا
تو ہی اس نیّا کا کھویّا — تو ہی ہے ڈھارس کا دویا
تو ہی کھیون ہار سپاہی ۔ تو ہی کھیون ہار

ہمارے نوجوان ادیبوں اور شعرا پر موجودہ جنگ نے گہرا اثر ڈالا ہے اور بعض حلقوں سے خصوصاً اس حلقہ سے جو اپنے آپ کو "ترقی پسند" کہتا ہے، یہ آواز اب برابر بلند ہو رہی ہے کہ ہمارے ادیبوں اور شعرا کا فرض ہے کہ وہ قوم میں "انٹی فاشست" جذبہ پھیلانے میں اپنی پوری قوت سے کام لیں۔ فرقت شروع سے اس فرض کو خاموشی سے انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے موجودہ جنگ کے مختلف پہلوؤں پر اتنی ہی پرجوش نظمیں لکھی ہیں جتنی پُر زور وہ قومی نظمیں کہہ چکے ہیں۔ ان میں سے بعض فرقت کے نام سے شائع ہو چکی ہیں اور بعض بغیر نام کے۔ ذیل میں انکی دو ایک نظموں کے اقتباسات درج کرتا ہوں۔

وطن کی آبرو کے پاسباں!

وطن والو! وطن کی آبرو کے پاسباں تم ہو

تمھاری تیغ کے سایہ میں طوفانوں کی دنیائیں
تمھارے وار سے ممکن نہیں دشمن اماں پائیں
جو تم چاہو تو محکوموں کی تقدیریں بدل جائیں
وطن والو! وطن کی آبرو کے پاسباں تم ہو

مچلتی ہیں تمھاری جرأتیں تیغوں کی دھاروں میں
تمھاری دھوم ہے انسانیت کے جاں نثاروں میں
تمھاری ہمتوں کے تذکرے ہیں چاند تاروں میں
وطن والو! وطن کی آبرو کے پاسباں تم ہو

تمدن کے سفینے کا سہارا بن کے آجاؤ
شدائد کے سمندر کا کنارا بن کے آجاؤ
پلٹ دے رخ جو طوفاں کا وہ دھارا بن کے آجاؤ
وطن والو! وطن کی آبرو کے پاسباں تم ہو

کچل دو، روند دو، ٹھکرا دو سر ظالم کے ارماں کا
سمندر میں بنا دو مقبرہ دشمن کے طوفاں کا
سفینہ غرق ہونے سے بچا لو نوع انساں کا
وطن والو! وطن کی آبرو کے پاسباں تم ہو

یہ تو فرقت کی سنجیدہ شاعری تھی، ان کی طنزیہ نظمیں اس مجموعہ میں آپ خود دیکھیں گے۔ ان نظموں کی شان نزول یہ ہے کہ کچھ عرصہ گذرا ایک روز ایک صحبت میں "آزاد شاعری" کے سلسلہ میں کچھ گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے فرقت صاحب سے فرمائش کی کہ وہ ذرا اس طرف بھی متوجہ ہوں۔ فرقت صاحب نے دو ہفتوں میں باوجود اپنی غیر معمولی دفتری مصروفیتوں کے نہ صرف تیس، چالیس نظمیں کہہ ڈالیں، بلکہ احباب کے کہنے سننے سے ایسا مجموعہ تیار کرنے پر آمادہ ہو گئے جس میں خود اُن کی

طنزیہ نظموں کے علاوہ "آزاد شاعری" پر ملک کے ممتاز ادیبوں اور نقادوں کی آرا شامل ہوں، یہ کام آسان نہ تھا مگر فرقت صاحب نے ایسی مستعدی دکھائی کہ ایک قلیل مدت میں انھیں کافی پیغامات اور بلند پایہ تنقیدی مقالات موصول ہو گئے جنھیں آپ آئندہ صفحات میں ملاحظہ کریں گے۔

اس سلسلہ میں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعہ کی اشاعت سے نہ "نئے ادب" کی مخالفت مقصود ہے نہ "ترقی پسندی" کی، بلکہ یہ دکھانا ہے کہ "آزاد شاعری" جس چیز کا نام ہے وہ بقول حضرت نیاز فتحپوری "نہ نظم ہے نہ نثر" اور اس پردہ میں جو لوگ شاعری کرنے لگے ہیں وہ شاعر نہیں اور چاہے جو کچھ ہوں۔

آزاد شاعر اور ان کے ہم خیال اصحاب آزاد شاعری کے جواز میں یہ دلیلیں پیش کرتے ہیں۔

(۱) پرانی اور پابند شاعری میں فرسودہ خیالات، ہجر و فراق کی داستانیں، اور حقائق سے کوسوں دور واقعات نظم کیے جاتے ہیں مگر ہماری شاعری میں زندگی کی ٹھوس حقیقتیں نمایاں کی جاتی ہیں، سماج کے عریاں جلوے پیش کیے جاتے ہیں، ہر چیز کی گہرائیوں پر نظر ڈالی جاتی ہے، کارزار حیات کی تلخیاں اور شیرینیاں واضح کی جاتی ہیں، بورژوا اور پرولتیریت کی طبقاتی کشمکش کو صفحاتِ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، ادب کو زندگی کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے وغیرہ۔

(۲) نہ صرف ردیف اور قافیہ بلکہ مروجہ بحور کی پابندیاں بھی بلند پایہ اور نئے خیالات کی نظم کہنے میں مانع ہیں۔

(۳) ہم کو مروجہ بحور بدل دینے اور نئی بحور وضع کرنے کا اسی طرح حق حاصل ہے جس طرح ہمارے اگلوں کو اُن کے وضع کرنے کا حق تھا۔

(۴) بحور بدل دینے کے بعد آزاد شاعری میں حُسنِ صورت بھی پایا جاتا ہے۔

جہاں تک پہلے اعتراض کا تعلق ہے یہ صحیح ہے کہ ایک زمانہ میں علی العموم ہجر و فراق کی داستانیں ہی ہماری شاعری کا سرمایہ تھیں لیکن جب حالات بدلنے لگے اور ہندوستانیوں میں ایک نیا شعور پیدا ہونے لگا تو ہماری شاعری میں بھی جنبش ہوئی اور اس میں آزاد، مولوی اسمٰعیل، حالی اور اکبر پیدا ہوئے۔ لکھنؤ اسکول تک جس پر ہمیشہ لعن طعن رہی کہ اسے معاملہ بندی، الفاظ کے الٹ پھیر اور معشوق کی کنگھی چوٹی کے علاوہ کسی اور چیز کی طرف خیال نہیں ہوتا، رفتار زمانہ اور وقت کے تقاضوں سے متاثر ہوا اور چکبست وصفی وغیرہ قومی اور اصلاحی نظمیں کہنے لگے۔ ادھر اقبال نے اردو شاعری کے دامن کو فلسفہ و معارف حقائق زندگی اور تمام دیگر بلند و اعلیٰ خیالات سے جن کا تعلق حیات اور جد و جہد حیات سے تھا مالا مال کرنا شروع کر دیا پھر یہ رنگ عام ہو گیا اور ردیف و قافیہ نیز بحور کی پابندیوں کو قبول کرتے ہوئے ہمارے شعراء نئے نئے خیالات پیش کرنے لگے اور نیچرل نظمیں کہنے کے علاوہ ہندوستانی سماج کی کمزوریوں پر ایک پر شکوہ اور چبھتے ہوئے انداز میں روشنی ڈالنے لگے۔ غرض اس پابند شاعری نے جوش ملیح آبادی، ملّا لکھنوی، سیماب اکبرآبادی، روش صدیقی، مجاز، فراق گورکھپوری، ساغر نظامی، جانثار اختر، مخدوم، شمس الدین شمیم، علی سردار جعفری، وغیرہ بھی پیدا کئے اور آج ان شعراء کی نظموں کی موجودگی میں پابند شاعری پر یہ الزام لگانا کہ اس میں ابھی تک فرسودہ خیالات پیش کئے جاتے ہیں اور یہ کہہ کر آزاد نظم کا جواز پیش کرنا یقیناً غیر معمولی جرأت کا کام ہے۔

(۲) اگر مروجہ بحور کی پابندیاں نئے رجحانات اور خیالات کو نظم کرنے میں حقیقتاً مانع ہیں تو ضرور انھیں ترک کر دینا چاہئے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ الزام صحیح ہے؟ اگر یہ واقعہ ہے تو آزاد شاعروں اور ان کے حامیوں کو لازم ہے کہ وہ کوئی ایسی آزاد نظم پیش کریں جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہو کہ ردیف و قافیہ

اور بحور کی پابندی کے ساتھ ایسی نظم نہیں کہی جا سکتی۔ یا کم سے کم نثر ہی میں وہ کوئی خیال پیش کر دیں اور یہ کہیں کہ اس قسم کے خیالات پابند شاعری میں نظم نہیں ہو سکتے اگر ردیف و قافیہ اور مروجہ بحور کی شاعری کرنے والا کوئی شاعر ان خیالات کو پابند شاعری میں نظم نہ کر سکے تو یقیناً آزاد شعراء کا یہ دعویٰ صحیح ہوگا کہ اردو شاعری کی پابندیاں، وقت کے تقاضوں اور زمانہ کی ضرورتوں کو نظم کرنے سے قاصر ہیں۔ اور اگر آزاد شاعر اس امتحان کے لئے تیار نہیں ہیں تو انھیں یا ان کے طرفداروں کو "پاکی داماں کی حکایت" بیان کرنے سے پہلے، دامن اور قبا کو دیکھ لینا چاہئے۔

(۳) اس میں کوئی شک نہیں کہ مروجہ بحور الہامی چیزیں نہیں ہیں کہ انہیں تغیر و تبدل ہو نہ سکے۔ یقیناً ہم کو ان بحور میں تبدیلی کا حق حاصل ہے اور نئی بحور وضع کرنے کا بھی۔ اُسی طرح جیسے ہمارے اگلوں نے مروجہ بحور متعین کی تھیں لیکن یہاں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔ اگر مروجہ بحور اور مروجہ پابندیاں نئے خیالات کو نظم کا جامہ پہنانے کی اہلیت نہیں رکھتے تو انھیں بدل دیجئے، اُن کے ارکان بدل دیجئے اور نئی بحریں وضع کر لیجئے لیکن جب پابندیوں کے باوجود بہتر سے بہتر خیالات نظم ہو سکتے ہیں تو خواہ مخواہ ایسی جدت کیوں کیجئے جس سے نظم کی لطافتیں اور اس کی وہ تمام خوبیاں جو نظم کو نثر سے ممتاز کرتی ہیں ختم ہو جائیں۔

(۴) رہ گیا حُسنِ صوت کا مسئلہ۔ آپ کہنے کو ہر آواز کے لئے کہہ سکتے ہیں کہ اس میں "حُسن" پایا جاتا ہے۔ آپ کو گدھے کے رینکنے میں بھی "حُسنِ صوت" مل سکتا ہے لیکن یہ آپ کی بد مذاقی ہوگی یا خوش مذاقی؟ اگر حسن صوت اسی طرح ہر چیز میں ملنے لگے اور صرف یہی "حسن" شاعری کا معیار قرار دے دیا جائے تو کوئی نثر کوئی گفتگو، کوئی آواز مثلاً مشین کی گڑگڑاہٹ، بادل کی کڑک، شیر کی دھاڑ،

گدھے کی "ڈھینچوں" گھوڑے کی ہنہناہٹ، کوّے کی کائیں کائیں، غرض ہر چیز میں ترنم اور حُسنِ صوت ملے گا جسکے معنی یہ ہوں گے کہ ہر ایسی آواز میں موسیقی یا شاعری بھی ہے۔

آزاد شاعری کی ترجمانی کرتے ہوئے ایک مرتبہ مجھ سے ایک صاحب نے جو اپنے آپ کو "ترقی پسند" کہتے تھے بڑے پتہ کی بات کہدی تھی، انھوں نے کہا کہ ردیف و قافیہ ڈھونڈھنے میں اور دونوں مصرعوں کے ارکان برابر رکھنے، یا مروجہ بحور میں شعر کہنے میں بڑی دقت ہوتی ہے مگر "آزاد شاعری" میں یہ دقتیں حائل نہیں ہوتیں اور مزے سے خیالات "نظم" ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بات انھوں نے واقعی بہت معقول کہی اور اصلیت یہی ہے کہ آزاد شاعری محض اس لئے کیجارہی ہے کہ "آزاد شاعر" میں۔ مروجہ پابندیوں اور قیود میں رہ کر شعر کہنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

جناب جوش ملیح آبادی نے بمبئی کے ایک جلسہ کی مخالفت میں (جس میں آزاد شاعری کے علاوہ اس امر پر احتجاج کیا گیا تھا کہ جدید شاعری میں عریانیت کی تبلیغ کی جارہی ہے) رسالہ ایشیا پونا (بابت ماہ اگست ۱۹۴۲ء) میں ایک طویل مضمون شائع کیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے دراصل "عریانیت" اور "الحاد و بیدینی" کے اعتراض کا جواب دینے میں زیادہ توجہ صرف کی ہے یہاں اِس خاص اعتراض اور اس کے جواب پر بحث نہیں ہے البتہ جناب جوش نے ضمناً بلینک ورس (اور نظم معریٰ) پر جس رائے کا اظہار کیا ہے اسکا نقل کرنا یہاں نامناسب نہ ہوگا۔ جوش صاحب فرماتے ہیں۔

"مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ یہ شاعری ہنوز کھردری ہے "بے جوڑ" غیر مترنم اور ژولیدہ و پیچیدہ ہے۔ تسلیم کرنا پڑیگا کہ آج کل کا نوجوان مجبور اور سخت مجبور ہے کہ وہ بلینک ورس ہی کو اپنے افکار کے اظہار کا آلہ بنائے۔ یہ خطا نوجوانوں کی

نہیں اس کے آباؤ اور اصول تعلیم کی ہے کہ وہ اپنی مادری زبان پر قدرت نہیں رکھتا اور فارسی سے قطعی بیگانہ ہوتا ہے جس کے بغیر اُردو زبان آ ہی نہیں سکتی۔"

"اس ناواقفیت اور عدم قدرت کے بعد ظاہر ہے کہ اس کے واسطے بلینک ورس کے سوا اور کوئی دوسری صنف سخن ہے ہی نہیں جسے وہ اختیار کرے" جناب جوش کی یہ نثر آزاد نظم میں اس طرح پیش کی جا سکتی ہے۔

"مجھے یہ بھی تسلیم ہے
کہ یہ شاعری

ہنوز
کھردری ہے
بے جوڑ، غیر مترنم
اور ژولیدہ و پیچیدہ ہے
تسلیم
کرنا پڑے گا
کہ آج کل کا نوجوان

مجبور
اور سخت مجبور ہے

کہ وہ
بلینک ورس ہی کو
اپنے افکار کے اظہار کا آلہ بنائے"

یہ ملحوظ رہے کہ جوش صاحب یہ اعتراض "بلینک ورس" پر کر رہے ہیں جس میں مصرعوں کے ارکان برابر ہوتے ہیں، مقررہ بحر ملحوظ ہوتی ہیں۔ صرف

ردیف وقافیہ کی پابندی نہیں کی جاتی درآنحالیکہ آزاد نظم (FREE VERSE) میں ردیف وقافیہ سے بے نیازی کے علاوہ بحور سے بھی استغنا برتا جاتا ہے اور اس کی پروا نہیں کی جاتی کہ ہر مصرع کے ارکان برابر ہیں یا نہیں، ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی ایک مصرع ایک لفظ پر مشتمل ہوتا ہے جیسے "ایک" اور کبھی کبھی پوری سطر کا ایک مصرع ہوتا ہے۔ اور یہی وہ اعتراض ہے جو مروّجہ بحور کو رکھنے کے حامی آزاد نظم پر عائد کرتے ہیں۔ آزاد نظم کے پرستار اپنے ان مخالفین کو تو یہ کہدیتے ہیں کہ یہ لوگ رجعت پسند ہیں، ان کے دماغ اس قابل نہیں کہ وہ "ترقی پسندی" کی باریکیوں کو دیکھ سکیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ جوش ملیح آبادی صاحب کے اس اعتراض پر انھیں کس خطاب سے سرفراز فرماتے ہیں۔ اپنے اس مضمون میں جوش صاحب نے آگے چل کر یہ فرمایا ہے کہ "باوجود اس کمزوری کے ہم کو ایسی شاعری کی محض اس لئے مخالفت نہ کرنا چاہیے کہ وہ ایک جدت ہے بلکہ ایسے شعرا کی ہمت افزائی کرنا چاہیے۔"

سمجھ میں نہیں آتا کہ جب جوش صاحب ایک چیز کو غلط اور شاعرانہ نااہلی سے تعبیر کر رہے ہیں تو یہ کیوں فرماتے ہیں کہ پھر بھی اس کی ہمت افزائی کئے جائے۔ ایک شخص غلط راستہ پر چل رہا ہو تو کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ ہم اسے ٹوک دیں کہ یہ راستہ صحیح نہیں ہے؟ آخر ہم یہ توقع کیوں قائم کرلیں کہ جو شخص غلط راستہ پر چل رہا ہے وہ آگے چل کر صحیح راستہ پر چلنے لگے گا اور منزل مقصود تک پہونچ جائے گا۔ غلط راستہ پر چلنے والا یقیناً منزل مقصود کو نہیں پا سکتا۔ اب اگر ہم اسے راہ راست نہیں دکھاتے یا اس کی ہمت افزائی کرتے ہیں تو ہم ایک گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں جو ناقابل معافی ہے۔

شاعری میں ہر قسم کے قیود اور پابندیوں کو ترک کر دینے کے بعد جو آسانیاں

ایک شخص کو حاصل ہو جاتی ہیں اُس کے مدنظر ہم اس چیز کے متوقع تھے کہ آزاد شاعر جو خیالات پیش کریں گے وہ واقعی ہمارے لئے "بصیرت افروز" ثابت ہوں گے وہ ہم کو اپنے سماج کی خرابیوں اور کمزوریوں سے روشناس کرائیں گے، ہم کو جدوجہد حیات میں حصہ لینے کی دعوت دیں گے، قوم کو ایک تازہ پیغام عمل دیں گے اور ہم میں روح بیداری پیدا کریں گے۔ مگر آزاد شاعری میں ہم یہ چیزیں تو نہیں پاتے البتہ ایسے نمونے بکثرت ملتے ہیں جن میں نہ تو قوم کو کوئی پیغام دیا جاتا ہے نہ زندگی کی حقیقتوں سے روشناس کرایا جاتا ہے ہاں کسی "عورت کو کم کپڑے پہنے دیکھ کر" اپنی "جنسی بھوک" کا اظہار، یا پنگھٹ پر کسی دوشیزہ کو دیکھ کر اُسے "چھیڑنے" اور "اکیلی پاکر کبھی نہ چھوڑنے" کا چیلنج ضرور ہوتا ہے یا اپنے "فرنگی حاکموں" سے "انتقام" لینے کا یہ انوکھا اور دلچسپ نسخہ پیش کیا جاتا ہے کہ اپنے "ہونٹوں" سے رات بھر کسی برہنہ جسم کے بوسے لیتے رہو (اب یہ "انتقام" حکومت ہند کے ریڈیو ڈپارٹمنٹ میں "ملازمت" کر کے لیا جا رہا ہے) اور یا پھر چند بے ربط اور مہمل فقرے ہوتے ہیں۔ ذیل میں اس قسم کی آزاد شاعری کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کو پڑھئے اور انصاف سے کہئے کہ کیا یہ شاعری اس قابل ہے جس کی تائید اور حمایت میں دوسروں کو جاہل اور رجعت پسند کا خطاب دے دیا جائے۔

۱۔ میراجی کی ایک سطر والی نظم جس کا عنوان ہے "محرومی" اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

میں کہتا ہوں تم سے اگر شام کو بھول کر بھی کسی نے کبھی کوئی دھندلا ستارہ
نہ دیکھا تو اس پر تعجب نہیں ہے، نہ ہوگا۔
ازل سے اسی ڈھب کی پابند ہے شام کی ظاہرا بے ضرر، شوخ ناگن

ابھرتے ہوئے اور لچکتے ہوئے اور اچکتے ہوئے کہتی جاتی ہے۔ آؤ ساتھ دیکھو کہ
میں نے تمہارے لئے ایک رنگین محفل جمائی ہوئی ہے۔
وہ کیا سا ایوان ہے، بر اب جس میں پردے گرے ہیں، وہاں پر جو ہو اُس کو
کوئی نہیں دیکھ سکتا۔
تھیں اس کے پردوں کی ایسے لچکتی چلی جاتی ہیں جیسی پھیلی ہوئی سطح دریا نے
اٹھ کر دھند لکے کی مانند پنہاں کیا ہو فضا کو نظر سے۔
ذرا دیکھو —— چھت پر لٹکے تھے فانوس، اپنی ہر اک نیم روشن کرن سے چھپاتے
ہیں اک بھید کی بات کا گیت جس میں سہری کے آغوش کی لرزشیں ہوں۔
ستونوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ رکتا ہوا اور جھجکتا ہوا چور سایہ بھی کہہ رہا ہے
—— وہ آئے، وہ آئے!
ابھی ایک پل میں یونہی جگمگانے لگے گا یہ ایوان یکسر
ہر اک چیز کیسے قرینے سے رکھی ہوئی ہے۔
میں کہتی ہوں مانو، چلو کیسی محفل سج رہی ہے۔

۳- عبدالمجید کی نظم "ایک سادہ سوال" صفحہ ۱۵۴ پر ملاحظہ ہو۔

۴- ن۔م۔ راشد کی نظم "انتقام" صفحہ ۱۵۰ پر ملاحظہ ہو۔

اور اگر حقیقی شاعری واقعی یہی ہے تو فرقت صاحب یقیناً اسکے امام اور مسلم الثبوت استاد ہیں۔ جو دو ہفتوں میں اس رنگ کی پچاس نظمیں کہہ سکتے ہیں جن میں "ادبی قدریں" ہیں "گہرائیاں" ہیں "جنسی بھوک" ہے "شعور و لاشعور" ہے "پیٹ کا فلسفہ" ہے "جنتا کی آواز" ہے "بورژوا اور پرولتاریت کی کشمکش" ہے اور "ادب برائے زندگی" ہے۔
میں پھر کہوں گا کہ اس کہنے سے میرا یا فرقت صاحب کا مقصد "ترقی پسندوں"

کی مخالفت نہیں ہے۔ دنیا میں کون ایسا شخص ہوگا یا کون ایسا ہوا ہے جو یہ نہ چاہتا ہو کہ ادب، خیالات، طرزِ معاشرت غرضکہ زندگی کے ہر شعبہ میں "ترقی" ہو۔ مگر "ترقی پسندی" کی آڑ میں اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرنا اپنی خود ستائی کرنا اور اگر کوئی اس کی حمایت نہ کرے تو اُسے جاہل اور رجعت پسند کہہ دینا، ادب میں اصلاح کرنے کے بجائے غلط راستہ پر چلنا، اور شاعری نہیں آتی مگر اپنے کو شاعر کہلانا کون سی ترقی پسندی ہے۔ دورِ جدید کے اکثر نوجوان شعرا جو حقیقی معنوں میں "ترقی پسند" ہیں۔ وہ ردیف و قافیہ کی پابندی کرتے ہوئے اردو شاعری کو چار چاند لگا رہے ہیں مگر مشکل یہ آن پڑی ہے کہ "ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی" آزاد شاعری کے نام سے گندی باتیں اور لچر پوچ خیالات، اشعار میں نہیں بلکہ ناموزوں غیر مربوط اور غلط نظم نما نثر میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور اگر کسی طرف سے اعتراض ہوتا ہے تو اس کا فوراً جواب یہ ملتا ہے "یہ ترقی پسندی" ہے تم لوگ کیا سمجھو۔ ضرورت ہے کہ اردو ادب کو ایسے لوگوں کے بے دردہاتھوں سے پامال ہونے سے بچایا جائے اور انھیں بتایا جائے ؏

کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

ایک اصلاحی اقدام

(سید اعظم حسین صاحب اعظم ایڈیٹر روزنامہ سرفراز لکھنؤ)

نظموں کے ذریعے زبان و ادب کو ترقی دینا ایک مستحسن فطری کوشش ہے۔ چنانچہ اُردو ادب کا دامن آج سے بہت پہلے بھی نظموں سے خالی نہیں تھا جس زمانے میں غزل کو انتہائی عروج تھا اس زمانے میں بھی مرثیہ، قصیدہ، مثنوی، شہر آشوب وغیرہ کی شکلوں میں نظم برابر موجود رہی۔ اپنے دور میں نظمیات کی ان شاخوں نے معیاری ترقی حاصل کی۔ اس دور کے بعد مختلف جدید عنوانات کے ماتحت نظمیں معرض وجود میں آنے لگیں۔ محمد حسین آزاد، حالی، شبلی وغیرہ نے ایسی کثیر التعداد نظمیں لکھیں۔ پھر اس شعبے نے اور ترقی کی اور چکبست، اکبر، صفی، اقبال اور جوش کے ایسے صاحبان کمال پیدا ہوئے اور انھوں نے اُردو نظم کو چار چاند لگا دیے نظم کی دنیا میں تنظیم تخیل و سنجیدگی نظر کے لحاظ سے اقبال، اور استعداد شعریت کمال شاعرانہ کے لحاظ سے جوش نے بلند ترین معیار قائم کر دیے ہیں جن تک ہنوز کوئی دوسرا شاعر نہیں پہنچ سکا۔ تاہم احسان بن دانش، اسرار الحق مجاز، ساغر نظامی، اختر شیرانی، آنند نرائن ملّا، جاں نثار اختر، شمس الدین تبسم، سروش طباطبائی، وغیرہم اس شاہراہ کو ایک حد تک طے کر چکے ہیں اور اُن کے کلام سے روح عصر محفوظ ہوتی ہے۔ اصول ارتقا کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ چکبست، اکبر، اقبال اور جوش کا کارواں گزر چکنے کے بعد کوئی اور بھی عظیم الشان کارواں ضرور گزرے گا۔

لیکن کیا وہ کارواں اس روح و پیکر شاعری سے معرّا گروہ پر مشتمل ہوگا

جو اپنے کو ترقی پسند کہنے اور کہلوانے پر خوش ہوتا ہے اور جسے آج کل ریڈیو اور رسالوں کے ذریعے اُچھالنے کی بے انتہا کوشش کی جا رہی ہے لیکن جو استعداد نہ ہونے کی وجہ سے نعمت پرواز سے محروم ہے۔ کیا آج کل کے موزونیت و مطالب سے بیگانہ شاعری کرنے والے کوئی ایسا درخشاں مستقبل رکھتے ہیں جو انھیں میر، غالب، انیس، اقبال، جوش کی صفِ اولیں میں جگہ دلا سکے؟ ہرگز نہیں۔ ان میں اس کی صلاحیت ہی موجود نہیں ہے۔ ان کو فطرت کی طرف سے ویسا فلسفیانہ دل و دماغ، شاعرانہ طغیانِ احساس اور فنکارانہ سلیقۂ بیان حاصل نہیں ہوا ہے جو شاعر کو غالب و جوش بناتا ہے۔ دراصل عطیۂ فطرت کی اسی قلت کا نتیجہ ہے کہ ان افراد نے مجبور ہو کر ایک "غیر شاعرانہ شاعری" کا سہارا ڈھونڈھا ہے۔ اب یہ اور سوال ہے کہ "جو ہو سکے نہ کیوں بشر اس کی ہوس کرے"۔ انسان میں طرح طرح کی کمزوریاں ہوتی ہیں کمزوری کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ انسان اپنے کو شاعر اور بہت اچھا شاعر سمجھنے لگے۔ اعظم گڑھ کے حاجی صاحب اور لکھنؤ کے منطق اتھونوی اپنی شاعری سے متعلق کیا کچھ نہیں سمجھتے۔ اگر اسی مثال کو بڑے پیمانہ پر دیکھنا ہو تو آج کل کے پنجابی رسالوں یا اُن کے منظومات کے مجموعوں پر ایک سرسری نظر کر لیجئے۔

اس جدید شاعری کے دو عناصر نمایاں ہیں، ایک عنصر وہ ہے جس میں کہنے والوں کی ساری کوشش یہ ہے کہ

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ایسوں کے میر کارواں میراجی معلوم ہوتے ہیں۔ اس عنصر کا طرۂ امتیاز

مہمل گوئی ہے۔ وافر الفاظ پر مشتمل ناہموار فقرے ہوتے ہیں جن کے مجموعے کو یہ حضرات نظم کہتے ہیں لیکن اگر شاعری کے لئے الفاظ اور معانی کی تنظیم ضروری ہے تو یہ ہرگز نظم نہیں ہوتی بلکہ اُس انتہائی ذہنی انتشار و پراگندگی کا مظاہرہ ہوتا ہے جو انسان کو آخر کار پاگلوں کی صف میں شامل کر دیتی ہے کہا جاتا ہے کہ دیوانے کی دیوانگی میں بھی ایک نظم ہوتا ہے، اس قول کی صداقت اگر کہیں سے ثابت ہوتی ہے تو یہیں سے کہ آج کل کی شاعری کرنے والے بھی اپنی اوّل درجہ کی مہمل گوئی میں خیالات کا تسلسل سمجھتے ہیں!

جدید شاعری کے حامیوں کا یہ ایک عام پروپیگنڈا ہے کہ وہ اپنی اس شاعری کے ذریعے نوع انسانی کو آگے بڑھانے کی جد و جہد کر رہے ہیں گویا ان کے کلام میں دنیا کے موجودہ سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی نظام کو منقلب کرکے ایک ایسا بہتر و ارفع نظام قائم کرنے کا پیغام دیا جاتا ہے جس میں امیر و غریب، حاکم و محکوم کی تفریق باقی نہ رہ جائے اور ساری دنیا یکساں طور پر خوشحالی و آسودگی کی زندگی بسر کرنے لگے لیکن کیا جدید نظموں میں واقعتاً یہی معیار قائم رکھا جاتا ہے؟ جہاں تک فحش نگاری کا تعلق ہے اس میں ایسے کسی پیغام و معیار کے پیش کئے جانے کا امکان ہی نہیں ہے۔ اب رہ گیا جدید نظموں کا پہلا عنصر یعنی مہمل گوئی سو اس میں بھی کوئی آفاق گیر پیغام نظر نہیں آتا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر یہ نظمیں بے معنی ہو کر کیوں رہ جاتیں۔ ان کے بے معنی ہونے کی وجہ یہی ہے کہ ان کے کہنے والے نظم کا محور صرف اپنی ذات کو قرار دیتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اُس میں خود اپنے دل و دماغ کی غیر اہم الجھنوں اور پریشانیوں کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا اپنی ذات سے متعلق غیر ضروری واقعات و خواہشات

وامکانات کو بے ربط و مبہم طریقے سے پیش کرنا چاہتے ہیں مثلاً ایک شخص بخار کی شدت میں محسوس کرتا ہے کہ اس کا پلنگ اُڑ کر کسی پہاڑ سے ٹکرا گیا جہاں ایک ہُدہُد کا گھونسلہ تھا جس سے وہ ہُدہُد نکل کر اُس کی مزاج پرسی کو آیا اور پھر دونوں وہاں سے اُڑ کر قطب مینار پر آ بیٹھے جہاں ایک گرگٹ پہلے سے بیٹھا ہوا تھا. اور پھر وہ سُرخ گرگٹ اُسے لیکر دریائے جمنا کے اندر گھس گیا جہاں مچھلیوں نے اُس کے سر میں اصغر علی محمد علی کی دوکان کا تیل لگایا وغیرہ وغیرہ۔ اب یہ شخص اس پراگندہ خیالی کو نظم قرار دے کر "ادب لطیف" یا "ادبی دنیا" میں شائع کر دے تو باہم دنیا اس کے معانی و مطالب کیونکر سمجھ سکتی ہے۔ غرض ایک تو داخلی و شخصی غیر اہم و ناقابل التفات موضوعات ہونے کی وجہ سے ان نظموں میں ابہام ہوتا ہے۔ دوسرے ان کے انداز بیان اور طریقۂ اظہار میں بھی ژولیدگی و کاواکی ہوتی ہے جسکی وجہ سے ان کی نظمیں گونگے کا خواب بن کر رہ جاتی ہیں۔

غزل میں غزل کی ٹکنیک سے ناواقف لوگوں کے لئے ابہام ہوتا ہے میر کا شعر ہے ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
سب اُسی زلف کے اسیر ہوئے

ایک بزرگ بیان کرتے تھے کہ ایک انگریز جج کو اسکے مسلمان پیشکار نے ایک دن میر کا یہ شعر سنایا اور سمجھایا۔ دوسرے دن عدالت میں جج کسی ملزم کو سزا دے رہا تھا اُسے دفعتہً یہ شعر یاد آیا اور اُس نے پیشکار سے پوچھا "ول پیشکار وہ کیا بولا تھا۔ ہم تھا، تم تھا، میر تھا اور سب کالی کوٹھری میں بند تھا" بیچارے انگریز جج نے اس شعر کو سمجھنے کی کوشش کی

لیکن وہ اس سے زیادہ نہ سمجھ سکا کہ وہ کالی کوٹھری میں بند تھا لیکن جو لوگ غزل کے مسلمات، زبان اور انداز بیان سے واقف ہیں وہ اس شعر کو پڑھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جدید شاعری والے کہہ سکتے ہیں کہ یہی حال اُنکے کلام کا ہے۔ پہلے اس کی تکنیک بھی سمجھیے اس کے بعد اُس سے لطف حاصل ہو سکتا ہے لیکن اُن کا یہ کہنا بالکل غلط ہے اس لیے کہ غزل کے جو مسلمات ہیں وہ کسی غزل گو کے انفرادی شخصی مفروضات نہیں ہیں بلکہ پورے فارسی و اُردو ادب کے اجتماعی مفروضات ہیں جنھیں اتنی عمومیت و ہمہ گیری حاصل ہے کہ فارسی و اُردو ادب کا ہر طالب علم اُن سے مطلع ہوتا ہے مثلاً جب کہا جاتا ہے کہ "زلف کے اسیر ہوئے" تو اس کے معنی ہر اُردو داں پر واضح ہو جاتے ہیں کہ کسی حسین کے عشق میں مبتلا ہوئے" یا مثلاً جب یہ شعر پڑھا جاتا ہے کہ :-

پہنچے ہیں اُن تک پہنچ جانے والے
تہہ تیغ ہو کر، سر دار ہو کر (آرزو)

تو وہ تمام اُردو داں جو تصوف کے معین و مروج نظریات سے واقف ہیں بآسانی سمجھ جاتے ہیں کہ شاعر کہہ رہا ہے کہ جن کو معشوق حقیقی یعنی خدا تک پہنچنے کی لگن لگ جاتی ہے وہ اس کی قربت ضرور حاصل کرتے ہیں خواہ اس دُھن میں اُنھیں سرمد، منصور، اور دیگر اولیا کی طرح تہہ تیغ ہونا یا دار پر کھنچنا پڑے۔ اگر جدید شاعری والے اپنی نظموں میں اپنے ذاتی مفروضات کو موضوع و مرکز بیان بنانے کے بجائے دنیا کے مسلمہ نظریوں اور فلسفوں کو موضوع و مرکز بناتے تو اُن پر ہرگز کوئی اعتراض نہ ہوتا، مثلاً اگر وہ مارکس یا فرائڈ کے نظریات کا حوالہ دیں تو اس کے لیے اُنکو

کوئی برا نہیں کہہ سکتا بلکہ کوئی اس بنا پر ان کی نظموں کو مبہم بتائے تو یہ اسکی کم علمی ہوگی لیکن جبکہ جدید شعرا ایسا نہیں کرتے بلکہ انھوں نے اپنی شاعری کو اپنی ذات کے غیر اہم و غیر واضح داخلی تصورات میں محدود کرلیا ہو تو پھر اسکے معترض پر کم علمی کا الزام ہرگز نہیں عائد کیا جاسکتا۔ آج کل جدید ادب کے حامیوں کا یہ ایک وطیرہ ہوگیا ہے کہ وہ اپنے ہر معترض کو جاہل و کم سواد بنا دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ معترض نے مارکس، لینن، اینجلس، فرائڈ وغیرہ کو پڑھا ہی نہیں ہے لہذا وہ ہماری شاعری کیا سمجھ سکتا ہے مگر یہ اعتراض اُس وقت کہاں حق بجانب رہ جاتا ہے جبکہ یہ شعراء جدید شاعری میں ان مفکرین کی ترجمانی کے بدلے خود اپنے غیر اہم اور مبہم مفروضات کی ترجمانی کرتے ہیں اور اس طرح شاعری کو ناقابل فہم چیستاں بنا دیتے ہیں۔

ہم ادب برائے زندگی کے نظریہ کے مخالف نہیں ہیں اگر اس نظریہ کا مفہوم یہ ہے کہ ادب میں زندگی کی نامحدود حقیقتوں کی ترجمانی و نقاشی کی جائے لیکن اگر "ادب برائے زندگی" کا مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ پیٹ بھرنے کے لئے روٹی مہیا کی جائے اور بس، جیسا کہ آج کل کے نام نہاد ترقی پسند ادیب گفتگو میں ظاہر کرتے رہتے ہیں تو ہمیں ایسے "ادب برائے زندگی" کو بحیثیت کلیہ کے منظور کرنے سے قطعاً انکار ہے۔

سوال یہ ہے کہ انسان نے جو مختصر و ناقص زندگی پائی ہے جس کی "نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم" اس کو کیونکر استعمال کرنا چاہئے۔ کیا اس کا مصرف محض یہی ہے کہ "کھاؤ پیو اور مگن رہو" یا یہ کہ زندگی کا صحیح استعمال یہ ہے کہ اُسے علوم و فنون کے دائروں کو بڑھاتے رہنے ...... کائنات کے رازہائے سربستہ معلوم کرتے جانے اور اسطرح نوع انسانی کے نقص و بیماری

کو دور کرنے کی جد و جہد کرنے رہنے کے لیے وقف رکھا جائے۔ سہ

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است

تو معتقد کہ زیستن بہر خوردن است

کھانا محض ذریعہ ہے نہ کہ عین مقصدِ زندگی کو قائم رکھنے کے لئے کھانا ضروری ہے مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان محض کھانا کھانے کے لئے زندہ رہے۔ اس کا مقصدِ حیات "ذکر و فکر" کر کے نوع انسانی کے نقائص اور معذوریوں کو گھٹانا ہے اور اُسے ایسی بلند سطح پر لانا ہے جہاں اُس کی حیثیت محفوظ ہو سکے۔

ہمارے قدیم شعراء زندگی کی حقیقتوں کی ترجمانی آج سے کہیں بہتر کرتے تھے۔ شیخ سعدی نے محولۂ بالا شعر میں زندگی کا صحیح معیار پیش کیا ہے سودا کہتے ہیں۔ سہ

سودا اپئے دنیا تو بہر سو کب تک

آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک

حاصل یہی ناکہ، اس سے دنیا ہوئے

بالفرض ہوا یہ بھی تو پھر تو کب تک

اسے توکل کا درس کہنا غلط ہے، شاعر کا حساس و باخبر دل انسان کے بنیادی نقص کو شدت سے محسوس کرتا ہے اور اپنے کو اور دوسروں کو متوجہ کرتا ہے کہ اصل سوال تو یہ ہے کہ "تو کب تک" انسان کی یہ ناپائداری یہ بے بسی دُور ہونا چاہئے۔ ساری جدوجہد اسی مقصد کے لئے کرنا چاہئے نہ کہ دنیا کی آسائشوں اور کھانے پینے کے مزے کے لئے اپنے قیمتی اوقات ضائع کرنا چاہئے۔ انسانی زندگی بے شبہ اپنے نقص کی بناء پر ایک ٹریجڈی ہے

آج کل کے سطحی دل و دماغ رکھنے والے اس ٹریجڈی کی سنگینی سے بچنے کے لئے "کھاؤ پیو اور مگن رہو" کے نظریہ کو مختلف طریقوں سے دُہرا رہے ہیں یہ دراصل اُن کی فراریت ہے۔ وہ شاعر و ادیب جو نبّاض فطرت ہیں جو دردِ انسانی کی تڑپ اپنے دلوں میں رکھتے ہیں ہرگز یہ فراریت اختیار نہیں کر سکتے وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں اور اسلئے وہ "ادب برائے زندگی" کے اُس ناقص نظریہ کو قبول نہیں کر سکتے جو کہ محض شکم پُری اور تن آسانی تک محدود ہے اور جس کے سامنے نوعی ترقی کا کوئی بلند مقصد نہیں ہے۔

بہرحال ہم جدید شعراء کو "ادب برائے زندگی" کے عقیدے سے باز رکھنا نہیں چاہتے "انفرادی غیر اہم ذہنی مفروضات کے اظہار کی کوشش سے یہ کہیں بہتر ہے کہ وہ کسی خاص اجتماعی مقصد کے ماتحت شاعری کریں شرط صرف اتنی ہے کہ شعریت، معنویت قابل قبول حدودِ نظم اور اخلاقی تعمیر کا ضرور لحاظ رکھیں۔ بقول آرنالڈ شاعری "تنقید حیات" ہے مگر اُن شرائط کے ماتحت، جو اس "تنقید حیات" کے لئے "شاعرانہ صداقت" اور "شاعرانہ حسن" کے قوانین نے عائد کر رکھے ہیں یعنی شاعری میں "تنقیدِ حیات" کی جائے مگر لازم ہے کہ وہ "تنقید حیات" شاعرانہ مسلمات اور شاعرانہ محاسن سے خالی نہ ہو اگر شاعرانہ مسلمات و محاسن ہی باقی نہ رہے تو پھر شاعری، شاعری نہیں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر نئے شعراء واقعتًا قدرتِ شاعری رکھتے ہیں تو پھر وہ "تنقید حیات" کے لئے شاعرانہ محاسن سے معرّا ہو جانا کیوں ضروری سمجھتے ہیں وہ اپنے مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر بھلی صحیح معنوں میں شاعری کیوں نہیں کرتے؟ آخر کالیداس، فردوسی، انیس، اقبال اور اکبر نے بھی تو معین مقاصد پیش نظر رکھتے ہوئے شاعری کی اُن مقاصد سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو مگر آج

دنیا اُن کے کمالِ شعری کا اعتراف کرنے پر بہر حال مجبور ہے۔ آپ مارکسی نظریات کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں ضرور کیجیے لیکن اسے پہلے طے کر لیجیے کہ تبلیغ کا ذریعہ آپ نثر کو بنانا چاہتے ہیں یا نظم کو؟ اگر آپ اپنا ذریعۂ تبلیغ نظم قرار دیتے ہیں تو اس نظم کو نظم کے معیار پر رکھئے اور نثر سے ممتاز کیجئے۔ جو اصحاب نظم و نثر میں امتیاز پیدا کرنے پر قادر نہیں ہیں ملک کا کون سا قانون انکو مجبور کرتا ہے کہ وہ شعر ضرور ہی کہیں، وہ اپنے خیالات نثر میں شوق سے ظاہر کریں ہم بھی خیر مقدم کرنے کو تیار رہیں۔

بہر حال یہ تو ہوا نئے شاعروں کا ایک طبقہ، دوسرا طبقہ وہ ہے جو کلام کا معیار فحش گوئی و عریاں نویسی کو سمجھتا ہے اس ضمن میں مخمور جالندھری وغیرہ کے نام خاص طور پر لئے جا سکتے ہیں۔ یہ افراد مرد و عورت دونوں کو اس طرح ننگا مادرزاد دیکھنا اور دکھانا چاہتے ہیں کہ ان کے جسم پر ایک تار بھی نہ ہو، انھیں عریاں کرنے کے بعد وہ ان کے مختلف اعضا کی سختی نرمی نشیب و فراز عمق و سطح کے متعلق ایسا بیباکانہ و بیباکانہ اظہار خیال کرتے ہیں جیسے وہ کسی خاص عالم میں لفظوں کے بدلے کام و دہن سے کام لے رہے ہوں، وہ اپنے ان ناگفتنی حرکات کی راہ میں مذہب اور سماج کو حائل پاتے ہیں اس لئے وہ مذہب اور سماج کو بھی ایک ہی زبان میں ہزاروں گالیاں دے ڈالتے ہیں اور مذہب و معاشرت کے سارے نظام کو توڑ پھوڑ ڈالنے کی تجویز نہ خواہش میں اپنے سر ٹکرائے دیتے ہیں۔ ادبیات میں پہلے بھی ایک صنف ایسی رہی ہے جس سے اُن شاعروں نے جن کے اعصاب پر بقول اقبال عورت سوار تھی اپنے جنسی جذبات کے لئے سامان تسلی مہیا کرنے کی کوشش کی مگر یہ صنف ہمیشہ سے معیوب و مکروہ سمجھی گئی اور سوسائٹی کے نفلت ام میں

اس طرح الگ تھلگ اور چھپ چھپا کر رکھی گئی جس طرح مکانوں میں پاخانے کبھی کسی صاحبِ مکان نے اپنے آنے والے دوست کو اپنے مکان کے پاخانے میں لیجا کر نہیں بٹھایا، یہ اور بات ہے کہ اگر کسی وقت دوست کو اس کے مادّی تقاضے نے مجبور کیا تو وہ پاخانے میں تھوڑی دیر کے لئے تن تنہا جا کر فارغ ہو آیا۔ مگر آج کل کی جدید شاعری والے تو یہ چاہتے ہیں کہ وہ اور اُن کے تمام احباب واعزا بلکہ ساری دنیا ہر وقت پاخانہ ہی میں بیٹھی رہے۔ بھلا صحیح الدماغ انسان اسے کیونکر برداشت کر سکتے ہیں۔ پہلے اگر انفرادی طور پر کوئی عُریاں نویسی کرتا تھا تو اُسے سات پردوں میں چھپاتا تھا جبکہ آج کل اُسے محلِ فخر میں پیش کیا جاتا ہے اور فحش گوئی کی نشر و اشاعت کو حق بجانب ٹھہرایا جاتا ہے۔ زیادہ تر اعتراض اسی طرزِ عمل پر ہے۔

آج کل سے کالج اور یونیورسٹی کے طلبا پنجاب کے ادبی رسالوں میں نام نہاد ترقی پسند ادیبوں کا کلام پڑھ کر اس سے اس لئے متاثر ہوتے جا رہے ہیں کہ ان کے سامنے تصویر کا دوسرا صحیح رُخ موجود نہیں ہے لاتعداد رسالوں کے شور و غل میں اعتدال کی آواز سنائی نہیں دیتی رسالوں پر مستزاد ہے ریڈیو اسٹیشنوں کا مسلسل پروپیگنڈا جن میں نفاق سے انتہا پسند نوجوان بڑی تعداد میں داخل ہو گئے ہیں اور اپنے ہمل گو اور عُریاں نویس دوستوں اور ان کے "محیر العقول" کارناموں کو اُچھالنا دنیا بہترین مشغلہ قرار دے رہے ہیں لہٰذا اپنے نوجوانوں کے ادبی مذاق کو بگڑنے اور شعر و ادب کے غلط معیار کا شکار ہو جانے سے بچانے کے لئے نیز اس طرح اسلاف کے بے نظیر ادبی کارناموں کی قدر و قیمت

اور اعلیٰ فنی خصوصیات باقی رکھنے کے لئے اس کی ضرورت محسوس ہوئی ہے
کہ اصلاحِ حال کی طرف فی الجملہ منظم طور پر متوجہ ہوا جائے۔ چنانچہ یو۔ پی۔
کے اخبارات سرفراز، حقیقت، سرپنچ وغیرہ میں اس طرف جدید شاعری کی
بے راہ روی پر متعدد مضامین شائع کئے گئے ہیں نیز لکھنؤ میں احباب کا
ایک حلقہ سا بن گیا ہے جو تعمیری مقصد کے ساتھ اصلاحی جدوجہد کر رہا ہے
اس حلقۂ ادب کے ایک رکن ہمارے ہر دلعزیز دوست مسٹر غلام احمد فرقت
ہیں جو ذوقِ سلیم کے ساتھ ساتھ فطری زندہ دلی کی روح افزا خصوصیات سے
متصف ہیں۔ وہ ہمیشہ دنیا کی الجھنوں پر ہنستے ہنساتے رہتے ہیں اور مسائل
کو خشک خاموشی سے دیکھ کر اُن کی تلخیوں کو نہیں بڑھاتے چنانچہ حسبِ عادت
انھوں نے نئی شاعری کو بھی دیکھنے کے بعد اپنے لئے تفننِ طبع کا اچھا خاصا
مواد پایا وہ دوستوں کے درمیان اس انوکھی شاعری پر ظرافت و طنز کے
پردے میں تنقیدیں کرنے لگے، مگر چونکہ نئی شاعری کی حمایت میں بعض
پڑھے لکھے اور ذمہ دار افراد بھی پائے گئے اس لئے انھوں نے اس قسم کی
شاعری پر اپنی عادت کے خلاف سنجیدگی سے بھی غور کرنا شروع کیا۔
انھوں نے نئے ادب اور نئی شاعری کو ڈھونڈھ ڈھونڈ کر پڑھا اور انکے
حامیوں کے خیالات کا جائزہ لیا۔ آخر اس سلسلے میں خود انھوں نے طبع زاد
نظم و نثر کا خاصا بڑا مجموعہ تیار کر لیا جس کا مطالعہ گم کردہ راہوں کیلئے
سبق آموز اور صاحبانِ ذوق کے لئے باعثِ تفریح ہے۔

ناانصافی ہوتی اگر اس مواد کو مخصوص احباب تک محدود رہنے
دیا جاتا اس لئے طے پایا کہ اسے شائع کر دیا جائے جس سے نہ صرف صاحبانِ نظر
محظوظ ہوں بلکہ بھولے بھٹکے ہوئے افراد صحیح راستہ بھی پا جائیں۔ مجھے

امید ہے کہ ملک میں اس مجموعے کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور اس کے مطالعے سے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا اس نتیجے تک پہنچ سکیں گے کہ آج جس طرح کے کلام کو "نیا ادب" اور "جدید شاعری" کے خوش آیند ناموں سے پکارا جا رہا ہے وہ در اصل پوچ اور لچر ہے جس میں نہ کوئی جان ہے اور نہ مطلب و معنی۔

آج جدید شاعری کی دونوں قسموں پر جو کہ مہمل گوئی اور فحش نویسی پر مشتمل ہیں تمام مہذب پبلک صدائے نفرین بلند کر رہی ہے۔ نہ صرف ملک کے سنجیدہ جرائد اس کے خلاف پُر زور تنقیدیں شائع کر رہے ہیں بلکہ مختلف شہروں میں عام جلسے کر کے اس شرمناک شعبۂ ادب کے خلاف نفرت و ملامت کی تجاویز منظور کی جا رہی ہیں۔ یہ زیر نظر مجموعہ بھی ایک مستقل نعرۂ ملامت ہے جسے سن کر ان لوگوں کو ہوش آنا چاہیئے جو مہذب دنیا پر ایسی لغو اور گندہ شاعری رسالوں اور ریڈیو کے ذریعہ زبردستی عائد کرنا چاہتے ہیں اور جن سے عاجز آ کر آج ان کو سبق دینے کا تہیہ کر لیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ نام نہاد ترقی پسندوں کے لئے ابھی پہلا نسخہ ہے اگر یہ خاطر خواہ مداوا ثابت نہ ہوا تو ایسے ایسے نہ معلوم کتنے نسخے تجویز کئے جائیں گے۔ اگرچہ یہ شغل حیرت انگیز شائستہ ادبیات کے ماننے والوں کی طبیعت اور مروت کے خلاف ہے مگر اردو ادب اور نوجوانان قوم کو تباہی سے بچانے کے لئے بادل ناخواستہ ایسا کرنا ہی پڑے گا۔ ہم کو احساس ہے کہ گمراہ ادب کو ٹھکانے لگانے کیلئے صالح ادب کو اپنی جگہ سے ایک ذرا نیچے آنا پڑ رہا ہے مگر قومی و ادبی مفاد کے لئے یہ ناگزیر ہے اس لئے بادل ناخواستہ یہ طرز عمل اختیار کیا جا رہا ہے بقول اَرزِ ند۔۔۔

ایمانِ وفا میں شک تھا اُسے ہم کھینچ سے قشقہ بیٹھ گئے
اللہ گناہ معاف کرے کلمہ کافر کو پڑھاتا ہے!

اس صدائے بیزاری کی تہہ میں ایک اپیل بھی چھپی ہوئی ہے جو اُن نوجوان شاعروں سے کی جاتی ہے جن میں نسبتاً صلاحیت موجود ہے اور وہ اگر "فیشن پرستی" کے تقاضے سے مقابلہ کرکے اپنے کو غلط راستے سے ہٹا لیں تو اُن کی شاعری کا مستقبل درخشاں ہو سکتا ہے۔ ان اصحاب میں فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، علی جواد زیدی، مخدوم محی الدین، احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے نام خاص طور پر لئے جا سکتے ہیں۔ ہمیں علی سردار جعفری اور علی جواد زیدی کی اُن نظموں کو سُننے کا موقع ملا ہے جن میں وزن و قافیہ کا لحاظ رکھا گیا ہے اور یقیناً اُن کی ایسی نظمیں بہت قابلِ قدر ہیں، اگر یہ صاحبان اپنی شعری صلاحیت کو انھیں صحیح حدود کے اندر ترقی دیں تو وہ دنیائے شعر و سخن میں بڑی ناموری حاصل کر سکتے ہیں۔

آخر میں ہم ایک بار پھر اس امر کو واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارا اور ہمارے حلقۂ احباب کا مقصد اس اصلاحی اقدام سے یہ ہرگز نہیں ہے کہ شعر و سخن میں جدت و تنوع سے کام لیا ہی نہ جائے اور اُردو شاعری جس منزل پر ہے وہیں اُسے روک دیا جائے۔ شاعری پھر اس میں بند نہیں رکھی جا سکتی، روانی و بالیدگی اس کی فطرت میں داخل ہے اور اگر زبان جغرافیائی و تاریخی حالات کی بنا پر اپنی موت آپ نہیں مر جاتی تو پھر اس کی شاعری کا ترقی پذیر رہنا ناگزیر ہے۔ ہماری اس تنقید سے اس قدامت پرست طبقہ کو خوش نہ ہونا چاہئے جو اُردو کی کائنات صرف غزل کو سمجھتا ہے، محض قدامت کے افکار کو سینے سے لگائے رہنا

چاہتا ہے۔ اور ہر جدید کلام سے صرف جدید ہونے کے جرم میں تعصب برتتا ہے۔ اس طبقے کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس اقدام کے ذریعے اسکی ترجمانی یا حمایت کی جا رہی ہے اور وہ اپنی بوسیدہ قدامت پرستی کی بقا کیلئے ہمارے حلقے سے کچھ مدد حاصل کر سکے گا۔ جہاں تک اصول اور بنیادی نقطۂ نظر کا تعلق ہے ہمارے اور ترقی پسندوں کے درمیان بہت کم اختلاف ہے۔ زیادہ تر اختلاف طریقۂ کار اور تفصیلات میں ہے۔ اگر اختلاف کو وزن کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمیں جتنا اختلاف جدید ترقی پسندوں سے ہے اتنا ہی اختلاف رجعت پسندوں سے بھی ہے۔ ہمارا پیغام دونوں ہی کو ہے کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹیں اور اعتدال کے نقطے پر آئیں کہ "امر خیر" یہی ہے۔

اردو شاعری کے موجودہ دور کی تنقید

(مولانا سید اختر علی صاحب تلہری)

۲۹ر اکتوبر کے سرفراز میں محترمی جناب احتشام حسین صاحب پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی کا ایک مراسلہ عنوان بالا سے شائع ہوا ہے۔ اس فاضلانہ مراسلہ میں علمی حیثیت سے موجودہ دور کی نظمیہ شاعری کی اہمیت واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لائق مراسلہ نگار نے اس ضمن میں بعض ایسی باتیں کہی ہیں جن کے متعلق کچھ گزارشیں پیش کرنا مسئلہ زیر بحث کی تنقیح کیلئے ضروری ہیں مسئلہ کے مختلف پہلو اپنی اہمیت کے لحاظ سے تفصیلی بحث چاہتے ہیں مگر ایک روزنامہ کے محدود کالم اس کی گنجائش نہیں رکھتے اس لئے مختصر طریقہ پر مسئلہ کے بعض خاص خاص حصوں پر ذیل کی سطروں میں اظہار خیال کیا جائے گا۔

وزن اور شعر

فاضل مراسلہ نگار نے زندگی اور زندگی کے آئینہ دار مظاہر کے متعلق جو تغیر کا نظریہ پیش کیا ہے اُسے بعینہ تسلیم کرنے کے بعد بھی اُن نتائج سے جو شاعری کے متعلق اخذ کئے گئے ہیں مجھے اختلاف ہے۔ فاضل نامہ نگار نے تغیر کی ذہنی و معاشی و نفسی وجہیں ظاہر کرنے کے بعد تحریر فرمایا ہے کہ بحر، وزن، اور قافیہ سب کچھ انسانوں نے بنایا ہے۔ وہی اس کو بدل بھی سکتے ہیں۔ یہ چیزیں نہ الہامی ہیں اور نہ شاعری کی راہ میں حائل ہوتی ہیں؟ بالفعل قافیہ کو چھوڑئیے۔ اس کی نوعیت دوسری ہے۔ وزن کو لیجئے۔

اس کے متعلق یہ کہنا کہ "اسے انسانوں نے بنایا ہے" کچھ زیادہ موزوں پیرایۂ بیان نہیں ہے۔ اس مقام پر یہ کہنا مناسب ہے کہ وزن کا انکشاف زبان کے فطری ارتقا کے سلسلے میں اضطراری طور پر ہوا ہے۔ اب اسے الہامی کہا جائے یا کچھ اور۔ اسے قافیہ وغیرہ جیسی مصنوعی چیزوں میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے لفظوں میں اسے یوں سمجھئے کہ انسان نے جب بولنا سیکھا اور اس کیفیت نے ارتقائی منزلیں طے کیں تو اس میں ایک ایسی دبی ہوئی حس ابھرنا شروع ہوئی جس کا موضوعِ عمل ان بولوں کے باہمی ربط کی دیکھ بھال تھا۔ اس دیکھ بھال میں اس کی نگاہوں کے سامنے تناسب و توازنِ اصوات کی شکل میں اس باہمی ربط کے وہ مخصوص عنوان بھی آنے لگے جن سے اس حس کو ایک گنگناتی ہوئی لطیف لذت محسوس ہوتی تھی۔ اسی انسانی حس کی دریافت کی ہوئی تناسب و توازنِ اصوات کی شکلیں اصلاح میں وزن سے تعبیر کی گئیں۔ جو عروضی اوزان رائج ہیں وہ اسی حس کے استقرا کا نتیجہ ہیں۔ میری اس بحث کو یہ امر اور زیادہ قوت پہونچاتا ہے کہ جن افراد میں یہ حس تناسب اصوات بیدار ہو انھیں رسمی طور سے مروجہ عروضی اوزان کے جاننے کی ضرورت نہیں ہو۔ خود فاضل مراسلہ نگار نے اپنے مکتوب میں یہ لکھا ہے کہ "مولانا روم" نے فاعلاتن فاعلات کو جانے بغیر حیرت خیز مثنوی لکھ ڈالی"۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مخصوص تناسب کی صورتیں جمالیاتی نقطۂ نظر سے اپنا ایک مستقل وجود رکھتی ہیں جن کا یہ جاگی ہوئی حس خود ادراک کر لیتی ہے۔ انسانی ذہن ان کی تخلیق نہیں کرتا۔ وزن کے وجود کی نوعیت کی تعبیر میں یہ ضروری تعبیر شعر کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور کر سکتا ہے۔

وزن کی نوعیت کے ذہن نشین کرنے کے بعد اس پر غور کی ضرورت ہے

کہ شعر کیا ہے اور وزن سے اُسے کیا تعلق ہے؟

ان لوگوں سے بحث نہیں جو شعر کو "ملفوظی حدود" سے آگے لے جا کر جذبات میں تحریک پیدا کرنے والے مناظر تک کو شعر قرار دیتے ہیں یا پھر ذرا اس عموم سے نیچے ہٹ کر ہر "کلام مخیل" کو جس سے انبساطِ نفس یا انقباضِ نفس پیدا ہوتا ہے شعر بتاتے ہیں۔ یہ اصطلاح کا اختلاف ہے "لا مشاحۃ فی الاصطلاح" جو لوگ شعر کی ان اصطلاحات سے جو غالباً اُس کے مجازی استعمالات کی مختلف صورتیں ہیں یا پھر مفہوم شعر کی ارتقائی منزلوں کی نشانیاں ہیں متاثر ہیں وہ قافیہ کیا وزن کیا شعر کو ملفوظی حدود سے بھی آگے لے جا سکتے ہیں۔ بحث اُن لوگوں سے ہے جو اُن اثر انگیز ملفوظی حقیقتوں کو جن کی باہمی ترکیب میں "لطیف تناسب اصوات" پایا جاتا ہے شعر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شعر کے اس مفہوم کی حقیقت میں وزن داخل ہے اسے کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے جب کہ اس مفہوم کی تعیین و تشخیص کے لئے مخصوص تناسب اصوات کا وجود "فصل" ممیز تمییز دینے والے کی حیثیت رکھتا ہے جو اُسے اُس دوسرے کلام سے الگ کرتا ہے جس میں یہ مخصوص تناسب اصوات نہیں پایا جاتا۔ ایسی حالت میں یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ "شعراء نے وزن کے وجود کو اپنی آسانی کے لئے جزوِ شاعری بنا لیا" بلکہ اس کے برخلاف حقیقت واقعہ تو یہ ہے کہ وزن شعر کے اس اصطلاحی مفہوم کی ماہیت میں داخل ہے جس کے بغیر شاعری کا تحقق ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے پاس جو اوزان موجود ہیں وہ استقرا کا نتیجہ ہیں اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وزن کی اور شکلیں نکل نہ سکیں لیکن جو شکلیں بھی نکلیں گی اُن میں وہ بولتا ہوا گنگناتا ہوا نغماتی

تناسب اصوات ضرور پایا جائے گا جو رائج بحروں میں پایا جاتا ہے۔ اگر یہ مخصوص پُر ترنم تناسب اصوات نہیں پایا جاتا تو پھر نثر کے بولتے ہوئے شگفتہ ٹکڑوں کو شعر کی اصطلاحی حدود سے کیونکر خارج کیا جا سکے گا۔ اُردو میں وزن وغیرہ سب ایران و عرب سے آئے ہیں۔ عرب میں شعر کا ذخیرہ جن جن تناسبِ اصوات کی شکلوں میں تھا اُن کا خلیل نے استقرا کیا اور انھیں علمی حیثیت دے کر مختلف بحروں میں منضبط کر دیا۔ ایرانیوں نے انھیں اوزان میں سے اپنے مذاق موسیقی کی مناسبت سے کچھ وزنوں کو اپنے لئے مخصوص کر لیا۔ اُردو میں بھی انھیں اوزان کی کم و بیش پابندی کی گئی تاہم نشاط انگیز مخصوص تناسب اصوات کو منطقی حیثیت سے انھیں مروجہ اوزان میں محدود رہنے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر تناسب اصوات کا احساس کرنے والی حس دوسری شکلوں میں بھی اس لطیف کیفیت کو پاتی ہے تو وہ ضرور نغمہ و آہنگ کی دنیا کو اس سے روشناس کرنے کا حق رکھتی ہے لیکن یہ حس کبھی کبھی دھوکا بھی کھا سکتی ہے اور خصوصیت سے اُن لوگوں کے یہاں جنھوں نے اس سلسلے میں سابق کے تجربوں سے بے نیازی ہی کو تجدد سمجھ لیا ہے۔ ایسے لوگ اس زبان کے نغمہ و آہنگ کے مزاج سے صحیح طور پر باخبر نہیں ہوتے۔ انھیں اس کے زیر و بم کی لطافتوں کا احساس نہیں ہوتا یہ صلاحیت اُسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ اس حس کے انکشافی تجربوں نے جن اوزان کو دریافت کیا ہے اُن کی ضربیں ہمارے ذوقِ نغمہ کی نبض میں پہلے پورے طور سے محسوس ہو لیں ایسی حالت میں ہر شاعر و غیر شاعر کو یہ حق دینا کہ وہ اوزان میں جس طریقہ سے چاہے کتر بیونت کرے شعری دنیا کے لئے خطرہ سے خالی نہیں ہے یہ جمہور کا دور سہی، عوام کا دور سہی اور تہذیب تمدن

کی شکست و ریخت میں بھی ان کا ہاتھ سہی تاہم مخصوص علوم میں مخصوص فنون میں "ماہرین EXPERTS کے مخصوص حقوق نظر انداز نہیں کئے جاسکتے۔ اس جماعت ماہرین اس جماعت اشراف کے حقوق مخصوص پر عوام کا، جنتا کا حسد کی نظریں ڈالنا خواہ مخواہ کی زبردستی ہے۔ جمہور و عوام سے پوری ہمدردی کے بعد اس صورتِ حال کو ہمیشہ برداشت کرنا پڑے گا اب خواہ اسکے لئے کورذوقی کے جھونپڑے سے نکل کر خوش ذوقی کے عالیشان ایوان ہی کی طرف مڑنا پڑے۔ غرضکہ اس تمام بحث کے بعد نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ منطقی حیثیت سے یہ تو بالکل صحیح ہے کہ موجودہ اوزان استقراء کا نتیجہ ہیں اور اس لئے نئے اوزان کے انکشاف کی گنجائش نہیں ہے تاہم اسی کے ساتھ یہ ماننا بھی ناگزیر ہے کہ شاعری کے ذخیرہ میں محض نئے اوزان کے انکشاف سے کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ اس کے ذیل میں حقیقی شاعرانہ قوتوں کا اظہار نہ ہو۔ اس کے لئے شدتِ احساس اور پھر اس شدتِ احساس کے اظہار کے لئے لفظوں میں اتنی ہی سکت ہونا چاہئے۔ اگر یہ بات نہیں تو پھر ایسی شاعری، شاعری نہیں، شاعری کے ساتھ تمسخر ہے۔

اس نئی اور آزاد شاعری کے علمبرداروں کی طرف سے اب تک جو ذخیرۂ شعری مہیا کیا گیا ہے وہ سچ تو یہ ہے کہ طفلانہ ٹھٹھول سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس میں شعریت کی تلاش بیکار ہے۔ اس میں نہ تو کہیں شدتِ احساس ہی کی تڑپ محسوس ہوتی ہے اور نہ کہیں اس میں عمیق تفکر ہی کروٹ لیتا دکھائی دیتا ہے۔ اکثر مقامات پر ترکیبوں میں جھول ہے لفظوں میں تنافر۔ کہیں کچھ سطحی اور پیش پا افتادہ اور کہیں غیر واضح و مبہم غیر مربوط خیالات ہیں جو ٹوٹی پھوٹی بحروں کی موجوں پر بے غایت طریقے سے بہتے چلے جاتے ہیں۔

اس قسم کی نظمیہ شاعری کو جو شعریت کے ساتھ حقیقت میں ایک قسم کا مذاق ہے جب سنجیدہ عنوان سے سنجیدہ ادیبوں کی طرف سے سنجیدہ لفظوں میں سراہا جاتا ہے تو واقعی تکلیف ہوتی ہے۔ اس قسم کی غیر مربوط نظموں میں نئے نقادوں کی طرف سے نہایت اہتمام کے ساتھ "آزاد تسلسل" کا مزعومہ وصف پیدا کیا جاتا ہے مگر اس قسم کے "آزاد تسلسل" کے نمونے "شعر طلب" دنیا کے سامنے رکھنے کے بجائے کسی "نفسیاتی معمل" میں رکھے جائیں تو غالباً زیادہ فائدہ کی بات ہوگی کیونکہ وہاں ان آزاد تسلسل کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے غیر مربوط خیالات کے پیش کرنے والوں کا نفسی تجزیہ ہو سکے گا اور اس طرح فرائڈ کے نفسیاتی نظریوں کے لئے کچھ اور مفید کڑیاں دستیاب ہو سکیں گی۔

نفسی حیثیت سے اس قسم کی نظموں کی جو اہمیت بھی ہو مگر شاعری کے لحاظ سے تو انھیں اُس وقت تک اہمیت نہیں دیجا سکتی جب تک کہ اُن میں وہ کیف نہ پایا جائے جو حسنِ مواد اور حسنِ صورت کے لطیف امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سے غالباً کسی کو اختلاف نہوگا کہ مواد وصورت کا ہر امتزاج محض اس بنا پر قابلِ پسندیدگی نہیں ہو سکتا کہ وہ جدید ہے بعینہٖ اُسی طرح جس طرح نفسِ قدامت کی وجہ سے مواد وصورت کے ہر امتزاج کو پسند نہیں کیا جا سکتا۔

اسی کے ساتھ اس کے بھی ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ لازمی نہیں ہے کہ اس طلسماتی دنیا میں جو تغیر بھی جنم لے وہ مفید ہی ہو۔ بہت سے تغیرات مہلک ہوتے ہیں۔ آپ خواہ ان تغیرات کو "تاریخ اور وقت" کا پیدا کیا ہوا بتائیں اور خواہ اُن کا سیلاب ہماری خواہشوں سے نہ رُک سکے تاہم ہمارا فرض یہ ضرور ہے کہ جن تغیرات کو ہم تباہ کن سمجھ رہے ہیں اُن کے

خطرات سے دنیا کو آگاہ کرتے رہیں تغیرات کا خالق آپ شوق سے تاریخ اور وقت کو قرار دیں لیکن بہر حال یہ چیزیں بے شعور ہیں ایسی حالت میں ان کی تغیراتی رفتار ٹھیک بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی۔

مواد اور صورت کے ہر امتزاج کے ساتھ رواداری برتنے کی تائید ہمارے محترم دوست نے اس پہلو سے کی ہے کہ "ہم بدلنے والے کو کیوں روکیں اگر وہ ہمیں تسکین نہ دے سکا تو اُس نے کچھ دوسرے لوگوں کو ضرور تسکین دی ہے" یہ استدلال کسی طرح قابل قبول نہیں ہے کیونکہ اس استدلال کو قبول کیا جاتا ہے تو پھر ہر بُری سے بُری چیز کے ساتھ رواداری کو مستحسن ثابت کیا جا سکتا ہے کیونکہ کونسی وہ چیز ہو گی جس سے کچھ لوگوں کی تسکین نہ ہو سکتی ہو؟ اس نظریہ پر تو کہیں بھی عمل نہیں ہو رہا ہے اور نہ ہو ہی سکتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں مارکسی فلسفہ بھی اس نظریہ کی جو بظاہر شکست خوردہ ذہنیت کا نتیجہ ہے ہمت شکنی ہی کرتا ہے۔ اس سلسلے میں فاضل مقالہ نگار نے یہ بھی مشورہ دیا ہے کہ "قدیم ادب اور ادبی روایات سے دلچسپی لینے والے حضرات جب جدید ادب کے تغیرات پر رائے زنی کریں تو اس کا ضرور خیال رکھیں کہ تغیرات ذہنی نہیں ہوتے ہیں مادی ہوتے ہیں۔ حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں اور مخصوص حالات مخصوص قسم کے تغیرات ضرور پیدا کرتے ہیں۔" غالباً ان کا مقصد یہ ہے کہ شعر و ادب میں جو یہ تغیرات پیدا ہو رہے ہیں وہ موجودہ مادی تغیرات کا نتیجہ ہیں اس لئے اُن پر رائے زنی بہت سنبھل کر کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے فاضل دوست اس کا اطمینان رکھیں کہ ہم اس نظریہ کو تسلیم کرتے ہیں کہ مادی حالات ذہنی تغیرات پیدا کرتے ہیں لیکن اس ترمیم کے ساتھ کہ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اولاً کسی ذہن میں کسی مخصوص مادی حالت کی

وجہ سے تغیر پیدا ہوتا ہے اور پھر یہ ذہنی تغیر دوسرے مادی تغیرات پیدا کرتا ہے۔ بہرحال ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ اقتصادی و تمدنی و معاشرتی حالات کے بدلنے کی وجہ سے بہت سے ذہنوں میں خیالات کا رُخ بدل رہا ہے اور اُن کی شاعری میں ان بدلے ہوئے خیالات کا عکس مل رہا ہے تاہم اس کے ساتھ بھی یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ ہر جگہ یہ عکس جاذب نظر نہیں ہے بعض دماغوں نے ان بدلے ہوئے خیالات کا شاعری میں جو چربہ اُتارا ہے وہ بہت ہی بھدا اور بدقوارہ ہے۔ آزاد شاعری اسی نوعیت کی چیز ہے۔ مخصوص حالات نے اس کے علمبرداروں میں جو مخصوص قسم کے تغیرات پیدا کئے ہیں وہ شاعری کے نقطۂ نظر سے تباہ کن ہیں۔ یہ مخصوص تغیرات مخصوص حالات اور مادی تغیرات کا نتیجہ ہی مگر ان مخصوص تغیرات میں ان کی مخصوص ذہنی و حسی و شاہدانی صلاحیتوں نے جو اور تغیرات پیدا کئے ہیں اُن کے نتائج کی طرف سے کیونکر چشم پوشی کی جا سکتی ہے۔

آزاد شاعری کے بعض نمونے

آج کل کی نئی شاعری کے نقیبوں میں ن۔م راشد، ڈاکٹر تاثیر، میراجی فیض احمد فیض، اور محمود رجا للندھری وغیرہ ہیں اس شاعری کے تابناک نمونے فیض کے یہاں کم ہیں اگرچہ وہ اس کی پر نقش فریادی کے دیباچہ میں کچھ ندامت سی محسوس کرتے نظر آتے ہیں لیکن ان کی میراجی کے یہاں افراط ہے۔ ن۔م راشد درمیانی درجہ میں ہیں۔

فیض کی ایک نظم ہے۔

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے

بول زباں اب تک تیری ہے
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

اگرچہ نقش فریادی کے لائق مقدمہ نگار ن۔م۔ راشد نے ان "جواہر پاروں" کے متعلق فرمایا ہے کہ "احساس کی تلخی ان اشعار میں اپنی پوری شدت پر ہے یہاں تک کہ فیض کے ذہن میں بسی ہوئی موسیقی بھی اس تلخی کو مٹا کر ان الفاظ کو ایک تغزل میں تبدیل کرنے کی ہمت نہیں رکھتی" مگر حقیقت یہ ہے کہ ان چند لفظوں کے مجموعہ میں شعریت کا کوسوں بھی نشان نہیں ہے۔ اگر یہ شعر ہیں تو پھر

دندان تو جملہ در دہان اند   چشمان تو زیر ابروان اند

کس طرح سے کیوں شعر نہیں اگر احساس کی تلخی شعریت کے گلے پر اس طرح چھری پھیر سکتی ہے تو پھر ایک شاعر کو احساس کی تلخی سے پناہ مانگنا چاہیئے۔

اس نظم میں اور ٹکڑے تو خیر جیسے ہیں ویسے ہیں البتہ "جسم و زباں" کا ٹکڑا تو شاعر کے حسنِ مذاق کا خاص طور سے آئینہ ہے۔

فیض کی ایک دوسری نظم ہے۔

پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں
راہ رو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ

سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں آئے گا

نئی شاعری کے مداح فیض کی اس نظم کو "حسین اور انتہا درجے کی اثر آفریں" قرار دیتے ہیں اور اسے شاعری کی "بہت بڑی تخلیق" سمجھتے ہیں یہ اپنا اپنا خیال ہے بہرحال کچھ ہو نظم میں ابہام ہے۔

اسے پڑھ کر یہ پتا نہیں چلتا کہ یہ شاعر کے "سیاسیات میں الجھے ہوئے کسی لمحے کی پیداوار" ہے یا پھر کسی ایسی طوائف کے چلتے پھرتے خیالات کا عکس ہے جو تماشبینوں کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے اکتا گئی ہے اور آخر میں اس کا خیال اس مرکز پر آ کر ٹھہر گیا کہ اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔

شاعر کا اصلی مقصد کیا ہے؟ وہ بہرحال ابہام کے پردہ میں مخفی ہے۔ اس نظم میں کیا حسن ہے اور کیا انتہا درجے کی اثر آفرینی ہے؟ اس کے اندازے کے لئے کسی خاص ذوق کی ضرورت ہے۔ ایک طوائف کا کسی تماشبین کے انتظار میں تھک جانا اور اپنے "بے خواب کواڑوں کا مقفل کر لینا" "حسین تخیل" ہے اور "انتہا درجے کا اثر آفریں خیال" ہے تو اس سے اتفاق نہیں یہ خیال ایک عامیانہ خیال ہے۔ اور جس طرح سے نظم ہوا ہے اثر سے خالی ہے۔ البتہ اگر کوئی قادر الکلام شاعر اس موضوع کو اظہار خیال کے لئے منتخب کر لیتا تو آپ دیکھتے کہ اس میں کتنا اثر آ جاتا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ کسی وجہ سے [illegible] کی الجھنوں کا جہاں کہیں معمولی نشان بھی مل جائے تو دوسری چیزوں سے

قطع نظر کرتے ہوئے اسے بہتر شاعری سمجھ لیا جائے۔ اس نظم میں تاروں کے غبار کا بکھرنا" اچھی تشبیہ ہے۔ مگر اس کے بعد تو سب زبردستی کی باتیں ہیں۔ یہ بات بھی قابل اظہار ہے کہ یہ نظمیں فیض کی ہیں جو نسبتہً سلجھا ہوا کہتے ہیں اور بعض اُن کی نظمیں قابل تعریف بھی ہیں لیکن ن۔م راشد اور میراجی کی شاعری کی دنیا اور رہی۔

ن۔م راشد کی شاعری کے متعلق "ماورا" کے مقدمہ نگار کرشن چندر کا خیال ہے کہ "فنی نقطۂ نگاہ سے راشد ایک صحیح باغی شاعر ہے۔ اُس کا تخیل ہمیشہ موروثی زبان کے الفاظ اُن کے معانی، اسالیب بیان، بندشوں اور ترکیبوں کو توڑتا، پگھلاتا۔ انھیں نئے سانچوں میں ڈھالتا، نئی صورتیں دیتا اور اُن میں سے نئے مطالب کشید کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔" خود ن۔م راشد نے بھی ماورا کی اکثر نظموں کے متعلق دیباچہ میں دعویٰ کیا ہے کہ ان میں "ہئیت اور فکر کے لحاظ سے قدیم راہوں سے انحراف کیا گیا ہے۔"

اس میں تو شک نہیں کہ ن۔م راشد کی شاعری کا بیشتر حصہ ادب و شعر سے بغاوت کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے سابق کے تمام لسانی و ادبی تجربوں سے چشم پوشی کی کوشش کی ہے اور اس طریقہ سے انھوں نے روایتی دنیا سے قطع تعلق کرنا چاہا ہے گر اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اُن کی زبان اُن کا تخیل سب گونگے کا خواب ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ اپنے خیال میں روایتی زبان کے الفاظ اُن کے معانی، اسالیب بیان۔ بندشوں کو توڑتے پگھلاتے۔ انھیں نئے سانچوں میں ڈھالتے نئی صورتیں دیتے اور اُن میں سے نئے مطالب کشید کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر حقیقت میں یہ سب فریب نظر ہوتا ہے۔ اس توڑ پھوڑ کے بعد اگر بالفرض کچھ نئے مطالب ملتے ہیں تو وہ بیشتر الجھے ہوئے مبہم بلکہ بسا اوقات بے معنی مہمل۔ شعر و ادب کی روایتی دنیا سے بغیر سوچے سمجھے

اس خواہ مخواہ کی بغاوت کا نتیجہ یہی نکلنا چاہئے تھا۔ شعر و ادب کی روائتی دنیا سے وابستگی بڑی حد تک ضروری ہے۔

آپ کی ایک نظم ہے "خودکشی"۔

کر چکا ہوں آج عزم آخری
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
رات کو جب گھر کا رُخ کرتا تھا میں
تیرگی کو دیکھتا تھا سرنگوں
منہ بسورے۔ رہگذاروں سے لپٹتے سوگوار
گھر پہونچتا تھا میں انسانوں سے اکتایا ہوا
میرا عزم آخری یہ ہے کہ میں کود جاؤں ساتویں منزل سے آج
آج میں نے پالیا ہے زندگی کو بے نقاب الخ

اس نظم میں مرکزی خیال کا پتا چلانا اور پھر اُس کی تدریجی منزلوں کا سُراغ لگانا آسان نہیں ہے۔ کسی "مجذوب کی مستانہ گفتاری" کی یہ بہترین مثال ہے۔ مانا کہ زندگی ایک ہرزہ کار عشوہ ساز محبوبہ ہے اور اُسکی سفاکیاں دیکھکر آپ خودکشی پر آمادہ ہیں مگر ساتویں منزل سے کودنے کے کیا معنی۔ کیا ساتوں آسمان یاد آگئے؟ مگر خیال بھٹکتے بھٹکتے بھی اس طرف کیوں پہونچا یہ تو روائتی دنیا سے شدید ترین وابستگی ہے۔ شائد ساتویں منزل سے بلندی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے مگر پھر آٹھویں منزل کیوں نہیں۔ بارھویں منزل کیوں نہیں؟ یہ آخر ساتویں منزل کیوں؟ اس نظم کا یہ مصرع تو بہت ہی دلکش ہے۔

جی میں آتی ہے لگا دوں ایک بیباکانہ جست" اُس دریچے میں سے جو جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کوئے و بام کو۔ اس میں کس قدر شعریت ہے۔ کس قدر زندگی کی ترجمانی ہے؟ ترقی پسند شاعر و نقاد ہی اسے بتا سکتے ہیں حقیقت میں اس قسم کی بحیثیت نظم کے کوئی کل درست نہیں ہے۔ ن۔ م راشد کی ایک دوسری نظم ہے "انتقام" وہ ترقی پسند حلقہ میں خاص طور سے پسند کی جاتی ہے اُس کا کچھ حصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

اُس کا چہرہ اُس کے خد و خال یاد آتے نہیں
اک شبستاں یاد ہے
اک برہنہ جسم آتشداں کے پاس
فرش پر قالین قالینوں پہ سیج
دھات اور پتھر کے بت
گوشۂ دیوار میں ہنستے ہوئے
اور آتشداں میں انگاروں کا شور
اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم
میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جس سے ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام
وہ برہنہ جسم اب تک یاد ہے

سبحان اللہ کس قدر پاکیزہ جذبہ ہے؟ کس قدر لطیف تخیل ہے؟ ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام کس خوبصورت عریاں طریقہ سے لیا گیا ہے؟ مردانہ حوصلوں کا یہ کتنا اعلےٰ مصرف ہے؟ شاعر کے خیال میں غالباً یہ "مکمل آزادی"

کا صحیح تخیل ہے۔ معلوم نہیں ہندوستانیوں کو اس برہنہ انتقام کے برہنہ جذبہ پر شاعر کا ممنون ہونا چاہئے یا نہیں؟ میں تو یہی کہوں گا کہ اگر ایک شاعر کے تخیل کا یہی حاصل ہے کہ وہ اس قسم کی نظموں کو تخلیق کرے تو پھر شاعری کی دنیا میں بہت سوچ سمجھکر قدم رکھنا چاہئے "اجنبی" عورت کی بھی کم و بیش یہی کیفیت ہے۔

میراجی کے یہاں آزاد نظم کے شاہکار بہت ہی افراط سے ملتے ہیں انہوں نے پرانی شاعری کی ہیئت اور روح دونوں سے بغاوت پورے طور سے کی ہے سنگِ آستاں میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

پکڑ کر ہاتھ میں تجھی کو اس دھرتی کے جنگل میں
اسی خلوت کے محل میں
ترے دل میں جگا دوں گا میں اپنی گرم آہوں سے
اسی نغمہ کو جو سویا ہے تیرے جسم کے محبوب تاروں میں

اس نظم کی ہیئت ایک حد تک قابلِ برداشت ہے مگر وہ تو کبھی کبھی ایک مصرعہ دو لفظوں کا کہتے ہیں اور دوسرا مصرعہ پوری ایک سطر کا اور کبھی دو سطر کا۔

اُن کے خیالات کی لہروں کا تو پوچھنا ہی نہیں۔ کہاں سے اٹھتی ہیں؟ کیونکر اٹھتی ہیں؟ کہاں جاتی ہیں؟ اس کا جاننا آسان نہیں ہے۔ یہ ہے نئی اور آزاد شاعری اب اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس شاعری میں بدلے ہوئے خیالات کا عکس مل رہا ہے تو کہنا پڑے گا کہ یہ عکس کہیں سے بھی دلفریب اور جاذبِ نظر نہیں ہے۔ یہ تو اتنے بھدے عکس ہیں کہ انھیں دیکھکر بدلے ہوئے حالات سے بھی نفرت ہونے لگتی ہے موجودہ شاعری کا یہ سب سے خراب نتیجہ ہے۔

اس مقام پر پہونچکر اپنے سنجیدہ ترقی پسند احباب سے یہ پوچھنے کو جی

چاہتا ہے کہ ہمارے یہ نئے شاعر جن خیالات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں اُن کیلئے اب تک کے دریافت کئے ہوئے اوزان اور شاعری کی موجودہ صورتیں کیوں کافی نہیں؟ نئی شاعری کے نمونوں کو دیکھکر تو یہ خیال خواہ مخواہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک زمانہ کے تجربہ سے فائدہ اٹھاکر اوزانِ عروضی اور دوسری شرطوں کی پابندی جو لازم کی گئی ہے اُس کے بار کو ان نوخیز شاعروں کی سہولت پسندی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لئے وہ اپنی اس کمزوری کو بغاوت کے پردہ میں چھپاتے ہیں میں یہ نہیں کہتا کہ درست کرنے اوزان کے سُروں سے ہمارے ساتھ کی ضیافت نہ کی جائے جس طرح ایک بحر کے ہوتے ہوئے دوسری بحریں پرانے زمانہ میں اختراع ہوگئیں اُسی طرح اب بھی یہ عمل قاعدہ اور قانون کے ماتحت ہو سکتا ہے مگر گذارش یہ ہے کہ اس اختراع کے جواز کے لئے یہ جو کہا جاتا ہے کہ جدید خیالات کا بار مروجہ اوزان نہیں سنبھال سکتے تو یہ بات ضرور قابل غور ہے۔ مروجہ اوزان اور شاعری کی مروجہ صورتوں کا جدید خیالات کے اظہار کے لئے ناکافی ہونے کا افسانہ تو بہت سنا گیا ہے مگر اب تک کوئی استدلالی تحریر اس مسئلہ کے متعلق نظر سے نہیں گزری۔ یہ بحث لفظوں کے خوبصورت الٹ پھیر اور نئی نئی اصطلاحوں کے استعمال سے طے نہیں ہو سکتی۔ ضرورت ہے کہ منطقیانہ طریقہ سے مستدل عنوان پر یہ بتایا جائے کہ یہ اوزان نئے خیالات کا بوجھ کیوں نہیں سنبھال سکتے۔ ان میں کون سا وہ نیا خیال ہے جو مروجہ اوزان میں مروجہ شکلوں میں ادا نہیں ہو سکتا؟

یہ بات بھی دریافت طلب ہے کہ اب تک ترقی پسند نقادوں کی طرف سے یہ کہا جاتا تھا کہ شاعری کو عوام سے قریب ہونا چاہئے۔ کل کی بات ہے مجنوں گورکھپوری غالب وغیرہ کی شاعری کے متعلق یہ فرما چکے ہیں کہ ان سے صرف

چند افراد لذت یاب ہو سکتے ہیں عوام کے لئے جنتا کے لئے ان میں کوئی کشش نہیں۔ نظیر اکبر آبادی کی اسی عام پسندی کی وجہ سے تعریف کی جاتی تھی مگر اب جدید شاعری کی خاص خصوصیت ابہام بتائی جا رہی ہے۔ مادرا کے ایک لائق مقدمہ نگار کرشن چندر نے صاف صاف اپنے مقدمہ میں لکھا ہے "مشرق اور مغرب کی جدید شاعری بہت حد تک مبہم اور ناقابل فہم ہے" ہمارے محترم دوست نے بھی معاشرت سیاست ادب کی الجھنوں کو بتا کر اسی ابہام کی طرف اشارہ کیا ہے کیا ان باتوں سے یہ اخذ کیا جائے کہ اب جدید تنقیدی مذاق دوسری کروٹ لے رہا ہے اور اب شاعری کو عوام سے قریب لانے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی؟ ظاہر ہے کہ جب وہ خواص اور تعلیم یافتہ افراد کے لئے مبہم اور ناقابل فہم ہے تو پھر جنتا کے لئے کیا قابل فہم ہو سکتی ہے۔ یہ عذر کہ ایک شاعری جنتا کیلئے ہے دوسری خواص کے لئے مانا جا سکتا تھا مگر پھر غالب وغیرہ پر اعتراض اُس کے ابہام کی وجہ سے کیوں ہے؟

خیر یہ تو ایک ضمنی سوال تھا اصل بحث تو یہ ہے کہ علوم کے پیچیدہ ہو جانے سے شاعری کے ابہام کی کوئی معقول توجیہ نہیں ہو سکتی۔ جو صحیح مذاق رکھنے والے شاعر ہیں وہ ان الجھنوں کے باوجود اپنے لئے سیدھے راستے ڈھونڈ لیتے ہیں۔ اس قسم کے عذر پیش کرنا اپنے عجز طبع کا ثبوت دیتا ہے۔

جدید شاعری کسوٹی پر!

نواب خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی

نوشتہ بماند سیہ بر سپید۔ صفحۂ قرطاس پر کلکِ حیات بخش جو حروف لکھدیتی ہے ان کی عمر انسانوں اور نسلوں سے بدرجہا زیادہ ہوتی ہے۔ آج فردوسی و سعدی نہیں شاہ نامہ اور گلستاں موجود۔ میر و مرزا نہ رہے کلام رہ گیا۔ لکھنے والا ہاتھ ختم ہو جاتا ہے۔ لکھا رہ جاتا ہے اور اسی سے اُس دَور اور اُس دَور کے رجحانات کا پتہ چلایا جاتا ہے۔

پس نقادانِ ادب اور ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ نقوش چھوڑ جائیں جو ان کے ناموں کی صحیح آئینہ داری کر سکیں۔

دیوانے کب نہیں ہوئے اور کہاں نہیں ہوئے لیکن اگر انہیں فرزانہ تسلیم کر لیا جائے تو اس دور کے اہلِ شعور کی عقلِ سلیم پر حرف آئے گا۔ ادب میں بھی کچھ تو دیوانے پیدا ہو لے ہیں اور کچھ بن جاتے ہیں اول الذکر مکلف نہیں ہاں آخر الذکر قابلِ تعزیر ضرور رہیں آج بھی آزاد شاعری کے دلدادہ انہی دو ٹکڑیوں میں منقسم کئے جا سکتے ہیں کچھ تو وہ ہیں جو بھلے بُرے صحیح غلط کے امتیاز سے بہرہ مند نہیں اور کچھ ایجادِ بندہ اگرچہ گندہ کے تحت یہ عفونت پھیلا رہے ہیں۔

اس وقت بھی کوئی صوبہ ایسا نہیں ہے جو چند بے بہرہ شاعر نہ رکھتا ہو اور بزرگوں سے سنا ہے کہ دورِ اسلاف بھی ان عجائبات سے خالی نہ تھا فی زمانہ پنجاب میں جناب امام دینا کا چرچہ ہے تو دلّی میں استاد بلالی بقول خود جانشین غالب چغتائی قبیلہ کے فرد فرید زمین سخن پر مطلق العنانی کے ساتھ حکومت فرما رہے ہیں

اور سننے میں آیا ہے کہ بدایوں میں خیر سے ایک جوڑا پلا ہوا ہے لیکن اس اہام دینی اور بلالی طبقہ میں اور ہمارے آزاد طرز غریب کے شعرا کے گروہ میں یہ فرق ہے اول الذکر بحر بے کراں میں خود غوطہ زن رہتے ہیں اور یہ دوسرے خضر راہ بن اسے آب حیات بتا دوسروں کو بھی ڈبکی دینی چاہتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ آزاد شعرا اپنا لکھا چھوڑ جائیں گے اور اس ناہموار خامہ فرسائی کو شعر کا درجہ عطا فرما دیں گے تو آنے والی نسلیں سمجھینگی کہ دور زیر نظر میں اس بدلگامی قلم کو بھی شعر کہا جاتا تھا۔ محولۂ بالا غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے لازم آتا ہے کہ بابانگ دہل اعلان کر دیا جائے کہ اہل نظر اس خامہ کاری کو شعر نہیں مانتے تاکہ ہماری نسل اور ہمارے دور پر بات نہ آئے اور ہمارا شعورِ شعری اخلاف کی نظر میں قابل مضحکہ نہ بن جائے۔ بنا برایں جناب غلام احمد صاحب فرقت کی اس کوشش کو میں سعی مستحسن تصور کرتا ہوں۔

بندہ نواز زبان میں ہر لفظ ایک خاص معنی و مفہوم کا حامل ہوتا ہے اور اگر ان مقررشدہ معانی کا احترام نہ کیا جائے تو زبان زبان نہ رہے اور ہم اپنا مافی الضمیر اس کے توسل سے ایک دوسرے تک پہنچا نہ سکیں۔ مثلاً ایک خاص صنف سخن کو ہم مستزاد کہتے ہیں پس جوں ہی یہ لفظ زبان پر آتا ہے مقابل سمجھ جاتا ہے کہ ہمارا مدعا کیا ہے اب اگر کوئی صاحب کہیں کہ ہم تو اس لفظ کو مسدس کے لئے استعمال کریں گے کسی کا کاپی رائٹ تو ہے نہیں نہ یہ لفظ ان معنی میں رجسٹرڈ شدہ اور فرض کیجئے یہ وبا عام ہو جائے ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق الفاظ جن معنی میں چاہے استعمال کرنے لگے تو جناب تصور فرمائیں کہ اس عالم قیل و قال کا کیا حال ہوگا اور یہ حیوان ناطق کس دہاڑے کو پہنچ جائے گا۔ بس یوں سمجھئے کہ بولنے والے تو درکنا رخود زباں لب خشک لئے آب آب کرتی مرجائے گی اور کوئی

حلق میں پانی نہ ٹپکائے گا۔

مدعا ہمارا یہ ہے کہ لفظ "شعر" مدتوں سے ایک خاص صنف سخن کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جس کی حدود مقررہ ہیں اب اس لفظ کو کسی اور صنف کیواسطے استعمال کرنا کسی حالت میں مناسب نہیں۔

لفظ "شعر" کا اطلاق متفقہ طور پر کلام موزوں و باقافیہ پر ہوتا ہے شاید کوئی صاحب فرمائیں کہ خواہ وہ بے معنی ہی کیوں نہ ہو سو عرض یہ ہے کہ کلام معنی کا مفہوم لئے ہوئے ہے اس لئے اس اعتراض پر راقم کو کلام ہے۔

بعض شعرائے طرز غریب کا یہ فرمانا ہے کہ شعر کی محولہ بالا تعریف عروضیوں کی ہے اس کے جواب میں امراء القیس کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

آذُود القوافی عنّی زیاد زیاد غلامٍ غویّ جزادا

ترجمہ۔ میں آتے ہوئے قوافی کو یوں ہٹاتا ہوں جیسے کوئی شریر چھوکرا ٹڈیوں کو مار مار کر ہٹاتا ہے۔ یہ شعر پہلے عروض سے تقریباً تین سو سال پہلے کہا گیا ہے۔ شاعر آمد قوافی کو آمد شعر کے مترادف قرار دے رہا ہے۔ اسی حقیقت کے مدنظر شعر کی اس واحد تعریف کو جس میں قافیہ جزو لاینفک ہے عروضیوں کی تعریف کہنا عدم علم کی دلیل ہے۔

دور کیوں جائیے آپ کی اپنی زبان کا یہ محاورہ اس امر پر استدلال کرتا ہے کہ شعر کے واسطے قافیہ لازمی ہے۔ ہم کہتے ہیں قافیہ تنگ ہے۔ مراد اس سے یہ ہوتی ہے کہ کام بن نہیں پڑتا۔ اس محاورہ کا پہلا لفظ بتا رہا ہے کہ یہ دنیائے شعر سے پیدا ہوا ہے اور پھر عام زبان میں مقبول ہو گیا۔ عقابِ تخیل پر شکستہ ہے محاورہ میں نہیں آیا بلبل طبع منقار زیر پر ہے زباں زدِ خلائق نہ ہوا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس اچھوتی تانتی سے قبل نہ صرف شعرا بلکہ خواص

عوام سب قافیہ کو شعر کا جز ولاینفک سمجھتے اور مانتے تھے۔ اس لئے کہ کوئی قول اس وقت تک ضرب المثل نہیں بن سکتا جب تک کہ تمام قوم اسے قبول نہ کرے۔

قافیہ کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ نہ صرف اسے شعر کا جز ولاینفک مانا گیا ہے بلکہ آپ کے اکثر و بیشتر ضرب الامثال با قافیہ ہیں کہ مکرینوں میں یہ حسن بیان موجود۔ پہیلیوں میں یہ نظر آئے نثر تک مقفیٰ اور مسجع لکھی جائے۔

اب سوچنا یہ ہے کہ ان تمام حقائق کے پیش نظر جو ہمارے جدت پسند معدودے چند احباب جو ترک قافیہ پر کمر بستہ ہیں اور کسی عنوان عقل سلیم سے کام لے کر صراط مستقیم پر آتے ہی نہیں اس کا باعث کیا ہے۔

میں عرض کردوں گا کہ قافیہ تنگ ہے۔ اسپ طبع لنگ ہے۔ ذوق سلیم دست زیر سنگ ہے۔ نظم کی قیود کے تحت اپنے خیالات کے اظہار پر دسترس نہیں بحریں رد کر شناوری دکھا نہیں سکتے اس لئے سات سمندر پار سے بے بحر شاعری لائے ہیں اور اس کو قوم پر نازل کرنا چاہتے ہیں۔

کچھ بیجا نہ ہوگا اگر ہم ساتھ کے ساتھ اس آزاد شاعری کی بابت۔ جو اہل مغرب کے خیالات ہیں ان سے قارئین کرام کو آگاہ کرتے چلیں۔

بلینک ورس کے باب میں انسائکلوپیڈیا برٹینکا میں درج ہے۔

In the middle ages end Rhyme held the field without rival. It was not until the inention of Blank verse that Rhyme found a

modern rival. Certain forms of poetry are almost inconceiveable without Rhyme. In the very day of Elizabathian literature a serious attempt was made in England to reject Rhyme altogether and to return to the quantitative measures of the ancients. The prime mover in this heresy was a pedantic Grammarian of Cambridge, Gabriel Harvey [1545-1630] for a short time he actually persuaded no less melodious a poet than Edmund Spenser to abandon Rhyme and adopt a sys-

tem of accented hexa meters.

From 1576-1579 the genius of Spenser seems to have been obscured by this error of *taste*, but he shook it off completely when he composed the Shepherds Callender.

Thomas Campion in a tract published in 1602 advocated the omission of Rhyme from hybrical poetry.

By dint of prodigious effort he produced some unryhmed Odes, which were not without charm, but best critics of the time such as Daniel, repudiated innovation.

یہ ہیں خیالات اس حسینہ کی بابت اُس ملک والوں کے جہاں اسنے جنم لیا
ایک طرف اس کو غیر مستحسن بدعت قرار دے رہے ہیں دوسری جانب اس کے
علم بردار کو کتاب زدہ نیم دیوانہ علاوہ بر ایں سپنسر اس صنف سخن کو کچھ عرصہ
کے لئے اختیار کر لینے کو صراط مستقیم سے بھٹک جانا تصور کرتے اور کہتے ہیں
کہ اس بد مذاقی کی بنا پر اس کی فن کاری اور قابلیت ماند پڑ گئی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ جس زبان میں قوافی کی کمی ہو اس میں یہ بے قافیہ شاعری
بہ اکراہ روا رکھی جا سکتی ہے لیکن جس زبان کے خزانہ اس دولت سے معمور ہوں
وہاں اس شاعری کا گذر نہیں۔ بعض حامیان طرز غریب یہ بھی فرماتے ہیں کہ
تخیلات ترقی کرتے جاتے ہیں ہم آج جن بلندیوں پر جاتے ہیں وہاں قوافی
لنگ ہو جاتے ہیں۔ موجودہ عنوانات اور خیالات ان قیود کے پابند نہیں رہ سکتے۔

صحیح کہ تخیلات بام ترقی پر پہنچ رہے ہیں تاہم اس کے یہ معنی نہیں کہ
حسن بیان کو بالائے طاق رکھ دیا جائے۔

جناب ان کے اصول کے تحت زمانہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ترقی کر رہا
ہے۔ خیالات اوج پر ہیں تخیلات عروج پر۔ پس اس شاہین بلند پرواز کے پاؤں
میں زنجیر ڈالنا مناسب نہیں۔ نیز پر پرواز کو مقراض قوافی کی قطع و برید کی نذر
کرنا زیب نہیں۔ کیا احقر اس ضمن میں اتنا دریافت کرنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ
آیا صرف خیالات ترقی کر رہے ہیں زبان جہاں تھی وہیں ہے۔

بندہ پرور انسانی ترقی کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ تخیلات کے ساتھ
ساتھ انسانی زبان بھی ترقی کرتی چلی گئی۔ تاکہ ذہنی امور کو منظر عام پر لائے
دل کی بات زبانوں تک آئے۔ ایک کا مدعا بہ احسن طریق دوسرے تک پہنچائے
نظام عالم کچھ اس درجہ مربوط ہے کہ یہاں محض ایک چیز ترقی نہیں کرتی۔ ہر شے

متوازی چلتی ہے۔ ہمارے تخیلات ابتدائے آفرینش سے اب تک ترقی کرتے رہے اور زبان اہلِ زبان کا ساتھ دیتی رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ عجزِ طبع کے بہانے ٹٹولے جاتے ہیں۔ ناچ نہ جانیں آنگن ٹیڑھا۔ اپنا مدعا صحیح طریقہ سے ادا کرنے پر عبور نہیں۔ دستور بدلنے کی فکر میں ہیں جن کی طبائع فطرتاً تنگ ہیں وہ شاہد بیان کو بامِ مرصع سے اُتار کر خاک نشیں کرنا چاہتے ہیں اپنے ذاتی نقص کی بنا پر مملکت ادب کو نقصان پہونچانے کے درپے ہیں فرمایا جاتا ہے کہ تخیل ترقی کر رہا ہے ما ورائے قیود کر دو۔ ہم کہتے ہیں کہ تخیل ترقی کر رہا ہے تو ذریعہ اظہار تخیل بھی ترقی کر رہا ہے۔ ابتدا میں تخیل بھی عریاں تھا ذریعۂ اظہار بھی معرّا۔ اب مشاطۂ شعور وعقل نے ایک کو جامۂ تہذیب سے آراستہ کیا دوسرے کو مرصع ومقفیٰ۔ جب تک دماغ انسانی کام کرتا رہے گا زندگی کی ہر شے دوش بدوش منازلِ ارتقا پر پہونچتی رہے گی۔ نیز باشعور دنیا کے پلیٹ فارم پر اسی کی بات سنی اور سمجھی جائے گی جس کا دماغ اور زبان ساتھ ساتھ چلے۔ اور جو اس فطری نعمت سے محروم ہوں گے ان پر "من چہ می سرایم وطنبورہ من چہ می سراید" کا لیبل لگا کر زینت دہ طاقِ جہل کر دیا جائے گا۔

فرقت صاحب نے یہ نظمیں نہیں لکھی ہیں بلکہ آزاد شعراء کو آئینہ دکھایا ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ ان بزرگوں پر اس آئینہ کا کیا اثر ہوگا۔ لیکن ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ہر نظم اپنی جگہ آزاد شاعری کا خاکہ بھی ہے نمونہ بھی۔ مثلاً چٹخارے ملاحظہ کیجئے یقین جانئے اگر یہ معلوم نہ ہوتا کہ یہ طنز کیا گیا ہے؟ تو خادم اس کو کسی آزاد شاعر کے کج دماغ کا نتیجہ سمجھتا۔ اس شاعری میں ایک یہ خاص لطف ہے کہ جتنی سمجھ سے بالاتر اور مفہوم سے بے بہرہ ہو اتنی ہی

اچھی۔ اس کے جواز میں یہ ارشاد ہوتا ہے کہ ماحول کا انتشار ہمیں ایسا لکھنے مجبور کرتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ پھر ازراہِ کرم جناب اسے شعر نہ کہیں دیوانہ بڑ کہیں۔ لفظ شعر کو کیوں غلط استعمال کر کے اس صنفِ سخن کی توہین کی۔

فرقت صاحب کی "برف آسا" بھی خوب گرما گرم ہے نیز "نوحہ خوان" بھی اس محروم ردیف و قافیہ "بے بحرہ" شاعری پر آنسو ٹپکا رہا ہے۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

آزاد شاعری ـــــ کدھر؟

(مسٹر بشیر احمد علوی بی، اے ناظر کاکوروی)

اُردو شاعری میں اُن لوگوں کی فہرست جنھوں نے کسی نہ کسی طریقہ سے رسمی اور عارضی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کبھی بھی زیادہ طویل نہیں رہی ہے گو بلینک ورس یا آزاد شاعری کا چرچا ہندوستان میں عرصہ تک رہ چکا ہے لیکن یہ انصاف سے دور ہے اگر اس امر کا اظہار نہ کیا جائے کہ "بلینک ورس" قسم کی شاعری میں شاعرانہ احساسات بدرجہ کمال موجود تھے صوری و معنوی خصوصیات میں کوئی فرق نہ آیا تھا نظم کے فطری تاثر اور لطافت میں بھی کوئی تبدیلی جائز نہ رکھی گئی تھی صرف فرق یہ تھا کہ مروجہ علم عروض کے خلاف علم بغاوت بلند کیا گیا تھا گو متقدمین نے شعر کے لئے قافیہ ردیف اور بحر کو زیور تصور کیا تھا لیکن یورپ کی اندھی تقلید میں ہندوستان کے نوجوان طبقہ میں بھی آزادی کی لہر پیدا ہوئی اور اس ناسمجھ طبقہ نے اُردو شاعری میں بھی خود ساختہ شعری انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن آج یہ سب کو معلوم ہے کہ اس جماعت کو جو بہت ہی مختصر تھی اس کو اپنی کوششوں میں مطلق کامیابی نہ ہوئی۔

اُردو غزل گوئی کی ابتدا یہ صحیح ہے کہ فارسی اتباع سے ضرور ہوئی لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا شاعروں کی کھوئی اور سوئی ہوئی جماعت میں اُس ذہنی انقلاب کی دبی ہوئی چنگاریوں نے دفعتًا بھڑک کر اُردو شاعری کو ترقی کی

شاہراہ عام پر کھڑا کر دیا اور آج یہ سب کو معلوم ہے کہ نئے ماحول اور نئی فضا میں (گو حقیقتاً یہ مشکل تھا) پرورش پا کر اُردو شاعری نے اپنا میدان وسیع کر لیا اور اپنے دامن سے تقلیدی دھبہ کو جلد دور کر کے زندہ زبانوں میں شمار ہونے کے قابل ثابت کر دیا۔ گذشتہ زمانہ میں اکثر شعراء نے صنائع و بدائع کے کثرت استعمال اور تراکیب و اضافات کی زیادتیوں سے اپنی غزلوں کو دقیق اور مبالغہ آمیز بنا کر چیستاں کی حیثیت دیدی لیکن ایسے شاعروں کی قدر نہ ان کے زمانہ میں ہوئی اور نہ آج ہو رہی ہے اُردو کی خوش نصیبی ہے کہ دورِ حاضرہ کے مشاہیر شعراء نے غزل کے محدود دائرہ کو بہت وسیع کر دیا ہے اور موجودہ اُردو شاعری جس نہج پر جا رہی ہے وہ ہر آئینہ صوری و معنوی حیثیات سے بہت بلند ہے۔

دورِ حاضر میں ہندوستان کے مردم خیز "جواہر ریز اور گوہر بیز" صوبہ پنجاب سے جس قسم کی آزاد شاعری کا انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس کے تیور دوسرے ہیں اور رنگ سخن کچھ اور ہی ہے اس قسم کی شاعری کی ترویج و اشاعت میں پنجاب کی رعایت سے "پنج شاعر" (پروفیسر فیض احمد فیض میراجی، ن م راشد، مجمور جالندھری اور ڈاکٹر تاثیر) کا بڑا ہاتھ ہے ان پانچوں سواروں نے باقاعدہ ایک جدید شاعری کا مدرسہ قائم کیا ہے جس میں نہ فن عروض کی ضرورت ہے نہ ردیف و قافیہ کی تلاش اور نہ بحروں کے لئے سرگردانی یہ پانچوں سوار مروجہ اُردو شاعری سے بیزار ہو کر (یا تھک کر) نئی شاعری کی طرف متوجہ ہوئے ہیں یہ واقعہ ہے کہ اس شاعری میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی جس وقت چند ناموزوں فقرے کسی جگہ جمع کر دیئے گئے

یہ "پنچ شاعری" شروع ہوگئی اس انقلابی شاعری کے لئے یہ ضروری ہے کہ چند چھوٹے بڑے جملوں کو اس طرح پیش کر دیا جائے کہ کانوں کو بھلا معلوم ہو اور جذبات میں ہیجان پیدا ہو جائے لیکن ان نقروں میں آپس میں مطلق ربط نہ ہونا چاہئے ان "پنچ شاعروں" میں (پنشاعروں میں نہیں!) ن م راشد اور میراجی کی شاعری میں ان کے معاصرین کے مقابلہ میں بظاہر یہ فرق ہے کہ ان کی شاعری نثر کا اچھا نمونہ ہے اور یکسر ابہام لیکن شاعرانہ لطافتوں سے شکر ہے کہ ان کی شاعری کو کوئی علاقہ نہیں مخمور جالندھری کی شاعری انکے معاصرین کے مقابلہ میں نسائی جذبات اور احساسات کے بیدار کرنے میں بڑی ممد اور معاون ثابت ہوتی ہے۔ مخمور بذاتہ بہت جری ہیں وہ موجودہ رسم و رواج کی کورانہ تقلید کو مطلق پسند نہیں کرتے بلکہ تہذیب و تمدن کے مقررہ حدود سے بھی بے نیاز ہو کر اپنی شاعری میں آرٹ کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں (خواہ کسی بڑے طبقہ کی نگاہیں ان کی اس عام آزاد خیال اور قواعد رسمیہ سے بے نیازی کو دیکھکر زمین میں گڑ جائیں) وہ تو "ادب برائے زندگی" (قسم) کی شاعری "صحیح آرٹ" کے طریقہ سے پیش کرتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر تاثیر کی شاعری اپنے معاصرین کے مقابلہ میں سب سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے وہ بہکتے کم ہیں لیکن "کہنے" کے مقابلہ میں "کر گزرنے" کے زیادہ قائل ہیں اور سیاسی اصطلاحات سے کام لینا خوب جانتے ہیں اور یہی انکی شاعری کا ماحصل ہے فیض کی شاعری ایک دوسرے ہی رنگ پر جا رہی ہے انکی شعلہ نوائی انقلاب کے تیز دھارے میں بہی چلی جا رہی ہے لیکن شکر ہے کہ فیض کی شاعری میں آرٹ کے نمونے نظر نہیں آتے۔

جہاں تک ہم نے غور کیا ہے اس خود ساختہ (بزعم خود ترقی پسند) انقلابی پنج شاعروں کی جماعت میں چند مخصوص الفاظ و محاورات محفوظ کر لیے گئے ہیں کہ جن کو اگر وہ استعمال نہ کریں تو انکی شاعری آرٹ کا نمونہ نہیں کہی جا سکتی ان پنج شاعروں کی کوششوں کو شاعری کہنا حقیقتاً لفظ شاعری کی توہین ہے کیونکہ اُن کی (پنج شاعروں کی) شاعری یکسر ابہام اور خالص نثر ہوتی ہے ہر شاعر سماج کا رونا روتا ہے اور ہنگامی اور اعصابی کیفیات کو پیدا کرکے آزاد نگاری اور فحاشی کا حق ادا کرنے کی کوشش میں سرگرم رہتا ہے اور شاعرانہ کمالات میں ندرت اور تازگی پیدا کرنے کے لئے "تشریح الابدان" کا سبق دہرایا جاتا ہے مروجہ آداب اور شرم و لحاظ کو دور کرکے اس گمراہ کن طبقہ کی شاعری میں "لچک"۔ "رجائیت"۔ "نفسیاتی محسوسات" اور "جنسی آسودگی" پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ہر وہ شخص جو چند مہمل اور بے ربط جملوں کو جمع کرسکتا ہے۔ آرٹسٹ تسلیم کرلیا جاتا ہے اور یہ سچ ہے کہ اس شاعری میں بڑی "خوبیاں" ہیں اول تو طبیعت ہر وقت موزوں رہتی ہے دوسرے چھوٹے بڑے جملوں پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا تیسرے جو وقت قلم اٹھایا اور کچھ بے تکی باتیں لکھ دیں وہ آرٹ کا ایک نمونہ تسلیم کرلیا جاتا ہے۔

ابھی حال میں پنجاب کے مشہور ترقی پسند شاعر ن۔ م راشد کا ایک مجموعۂ کلام "ماورا" کے نام سے شائع ہوا ہے (جو اس جماعت نشر و اشاعت کی وجہ سے انجیل کی حیثیت رکھتا ہے) اس مجموعہ میں ایک سے ایک "جواہر ریزے" موجود ہیں جنکی نظیر فی زمانہ مشکل سے ملے گی آپ بھی ان ادبی شہپاروں میں سے ایک پارہ سنئے جو "گناہ" کے نام سے موسوم ہے۔

آج پھر آ ہی گیا
آج پھر رُوح پردہ چھا ہی گیا
دی مرے گھر پہ شکست آ کے مجھے
آج پھر آ ہی گیا
ہوش آیا تو ہیں دہلیز پہ افتادہ تھا
خاک آلودہ و افسردہ و غمگین و نزار
پارہ پارہ تھے مرے رُوح کے تار
آج پھر آ ہی گیا

روزنِ در سے لرزتے ہوئے دیکھا ہیں نے
خرم و شاد سرِ راہ اُسے جاتے ہوئے
سالہا سال سے مسدود تھا یارانہ میرا
اپنے ہی بادہ سے لبریز تھا پیمانہ میرا
اس کے لوٹ آنے کا امکان نہ تھا
اس سے ملنے کا بھی ارمان نہ تھا
پھر بھی وہ آ ہی گیا

کون جانے کہ وہ شیطان نہ تھا
بے بسی میرے خداوند کی تھی

ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ اس قسم کی شاعری کا مفہوم کیا ہے اگر

اس قسم کی شاعری کو سختی سے نہ روکا گیا تو ایک دن متعدی صورت اختیار کر کے وہ ہندوستان میں ایک شرمناک اور قابل نفرت انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کرے گی کیونکہ اس خطرناک مرض کے جراثیم ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے میں بڑی تیزی سے نشو و نما پا رہے ہیں جس کے استیصال کی فوری ضرورت ہے۔

اس شاعری کی ابتدا ایک لفظ سے ہوتی ہے اور بقول "جلال ملیح آبادی" کے ایک لفظ سے شروع ہو کر اس قدر بڑھتی ہے جیسے الف لیلیٰ کے کسی قصہ کی سُرخی مثلاً "جانا شہزادے کا بیچ باغ کے اس پریوش کے پانا سوتے ہوئے اس شوخ کو اور سرہانے کی چھڑی پائنتی اور پائنتی کی چھڑی سرہانے کرنا" یہ اس شاعری کے عروجی مصرعے ہوتے ہیں جو شروع ایک لفظ سے ہوتے ہیں مثلاً ایک لفظ جیسے "گل" اب دوسرا مصرع ہوگا "ایک گل" اور تیسرا ہوگا "ایک گل تھا" چوتھا "ایک گل تھا خموش" پانچواں "صحرا میں ایک گل تھا خموش" اب یونہی جب یہ شاعری عروج پر پہنچے گی تو دسواں یا چودھواں مصرع یقیناً یوں ہوگا۔

اندھیری رات کی پرچھائیوں کا زیر و بم ——— اللہ ری تاریکی

اس عروج کے بعد جب رو بہ زوال ہوگا تو یوں ہو جائے گا

وہ سایہ کہ جو ٹھہرا تا ہے صحن باغ گلشن پر
مری آواز کی نا نوں کی محفل ہو گئی رسوا
نہ جانے دل گرجتا ہے مرے پہلو میں اب کیونکر
گرج سے جس کی گونجا کوہ و صحرا
اٹھا ایسے میں مطرب ساز اپنا

بہت ہے روح لرزاں
یہ گلشن کی ہوائیں
اور سازِ زندگی
میرا

بر واین دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

اس شاعری کا آشیانہ اس قدر بلند ہے کہ عقل کا اتنی بلندی پر پہونچنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے ایک نظم عرض ہے اسے سمجھنے کی کوشش کیجئے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی عجوبہ روزگار ترکیبوں سے بھی لطف اٹھائیے اس کی سرخی ہے "اونٹ کا خواب" یعنی ایک اونٹ کسی قدر زیچوں والا "معصوم خوا" کھڑے کھڑے سوتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔

خواب ایک اونٹ نے دیکھا اک روز
کہ پکڑ کر نکیل
ایک چوہا لئے جاتا ہے کسی بل میں مجھے
لال انگارہ ہیں آنکھیں اس کی
خوں کبوتر سے سفید
اور پھر بل کا کیا
سیکڑوں اونٹوں نے حصار
اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے تلوار تفنگ
چھڑ گئی خوب ہی جنگ

وہ نہیں دور وہ کہسار پہ ہلکا سا غبار
نعرۂ جنگ سے کانپا اکبار
وہ خنک جوش و خروش
ایک چوہے نے مگر
کھینچ کر ماری جو تلوار اس کو
سر مرا کٹ کے گرا
اونٹ مغلوب ہوئے قید کیا چوہوں نے
میرے مرنے کی خبر
لیڈی اوٹنی کو ہوئی
سرسراہٹ سی ہوئی
دل میں مرے
اور پھر اشک نکل آئے کٹے سر سے ادھر
اونٹنی رونے لگی
میری جب آنکھ کھلی
دیکھتا کیا ہوں
کہ میری گاڑی
ایک جنگل میں خموش
مضمحل اور رکی
دیر سے کھیت کے باہر ہے کھڑی
میں نے سوچا کہ نہ جائیگا کہیں بھی آقا
گاڑی تب لیکے ہوا میں مفرور

میری منزل بھی کڑی
ابھی جنگل سے بہت دور تھا میں
کیسا مضحک تھا یہ خواب
رات کی رات وہاں لیٹ رہا
پھانک کر خاک گذرگاہوں کی
لیڈی اونٹنی کی بھی سنتے چلیے
وہ بڑھائے ہوئے منزل پہ قدم
پاؤں تھے تند ہواؤں سے بھی تیز
شوخ اداؤں سے بھی تیز
خواب تھا خواب تھا سارا جھوٹا
اونٹ تھا کوئی نہ کوئی چوہا

وقت نہیں ہے ورنہ ان پنج شاعروں[1] کے اور بھی اعلیٰ نمونے آپکے سامنے پیش کئے جاتے سخت ضرورت ہے کہ اس قسم کی شاعری سے ہمارے نوجوانوں کے دماغوں کو محفوظ رکھا جائے .... یہ واقعہ ہے کہ صحیح معنوں میں یہ اُردو کے ساتھ دشمنی ہے مبئی میں جوان بخت جواں سال خان بہادر راجہ محمد امیر احمد خاں والیٔ محمود آباد کی صدارت میں اس فحش نگاری اور آزاد خیالی کی سختی سے مخالفت کی گئی ہے اور لکھنؤ میں بھی مشہور خوش گو شاعر

---

[1] افسوس ہے پروفیسر فراقؔ صاحب کے یہاں ان شاعروں کا کلام نہ مل سکا، ساقی، ہمایوں ادب لطیف، نیا ادب وغیرہ اس جدید شاعری کی ترویج اشاعت میں بہت مشہور ہیں لیکن افسوس ہے کہ مجھکو مطلق اور نمونے نہ مل سکے اگر کچھ نمونے شامل کر دیئے جائیں تو مضمون مفید ہو جائیگا۔ "ناظر"

سیّد آل رضا صاحب رضاؔ کی صدارت میں ترقی پسند طبقہ کی طرف سے عریانت اور فحاشی کی ترویج کرنے والوں پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرچکے ہیں۔ اس سے یہ امید قوی ہے کہ اس ترقی پسند "ونج شاعر" طبقہ کی ہمتیں یقیناً پست ہو جائیں گی لیکن یہ کافی نہیں ہے ایک متحدہ ادبی قومی محاذ قائم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس وبا کو جلد سے جلد دور کیا جاسکے۔

آزاد نظم

از پروفیسر ڈاکٹر عندلیب شادانی

اجنبی عورت

ایشیا کے دور افتادہ شبستانوں میں بھی
میرے خوابوں کا کوئی روماں نہیں
کاش اک دیوارِ ظلم
میرے اُن کے درمیاں حائل نہ ہو
یہ عماراتِ قدیم
یہ خیاباں، یہ چمن، یہ لالہ زار
چاندنی میں نوحہ خواں
اجنبی کے دستِ غارت گر سے ہیں
زندگی کے اِن نہاں خانوں میں بھی
میرے خوابوں کا کوئی روماں نہیں
کاش اک "دیوارِ رنگ"
میرے اُن کے درمیاں حائل نہ ہو!
یہ سیہ پیکر، برہنہ راہ رَو
یہ گھروں میں خوبصورت عورتوں کا زہر خند
یہ گذرگاہوں پہ دیو آسا جواں

جن کی آنکھوں میں گرسنہ آرزوؤں کی لپک
مشتعل، بیباک مزدوروں کا سیلابِ عظیم!
ارضِ مشرق! ایک مبہم خوف سے لرزاں ہوں میں
آج ہم کو جن تمناؤں کی حرمت کے سبب
دشمنوں کا سامنا مغرب کے میدانوں میں ہے
اُن کا مشرق میں نشاں تک بھی نہیں

(ن۔م۔ راشد)

گذشتہ چند سال کے اندر اُردو ادب میں ایک نئی چیز کا اضافہ ہوا ہے لے "آزاد نظم" کہتے ہیں۔ اس کا ایک اعلیٰ نمونہ اوپر درج ہے۔ یہ چیز ہماری ایجاد نہیں، یورپ کی پیداوار ہے۔ ہم نے تو حسبِ معمول صرف نقالی کی ہے۔ آزاد نظم جنگِ عظیم سے پہلے فرانس میں پیدا ہوئی، فرانس سے امریکہ گئی، امریکہ سے انگلستان پہونچی اور وہاں سے ہندوستان میں آئی۔ فرانسیسی زبان میں اسے "ور لیبر" (VERS LIBRE) کہتے ہیں۔ انگریزی میں "فری ورس" (FREE VERSE) اسی کا لفظی ترجمہ ہے۔ اور "فری ورس" کا لفظی ترجمہ "آزاد نظم" ہے۔

جنگِ عظیم کے بعد سے یورپ اور امریکہ میں "فری ورس" کو مقبولیت حاصل ہونی شروع ہوئی۔ اور اس وقت تو وہاں اس کی ہردلعزیزی کا یہ عالم ہے کہ اُس نے پرانی وضع کی باضابطہ نظم کو تقریباً بے دخل کر دیا ہے۔ کسی شئے کو سمجھانے کے لئے ضروری ہے کہ اُس کی جامع اور مانع تعریف کی جائے لیکن "اس صنفِ شعر کی کوئی قطعی تعریف ابھی تک معین نہیں ہوئی ہے۔ دراصل اسکی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ سوائے استثنا کے اور کسی طریقے سے اسکی تعریف کرنا

دشوار ہے۔ روایتی قافیہ، بحر اور وضع کو ترک کر کے اس میں صرف "آہنگ" (cadence) کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ "فری ورس" کی بنیاد اس نظریہ پر قائم ہے کہ شعر کا دار و مدار مضمون پر ہے، اس کی وضع پر نہیں۔[1]

آزاد نظم چونکہ "فری ورس" کی نقل ہے اس لئے مناسب ہے کہ اس کی اصل یعنی فری ورس کے متعلق چند ضروری باتیں بیان کر دی جائیں تاکہ آزاد نظم کے مختلف پہلوؤں کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ فری ورس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس میں کئی بحروں کا امتزاج ہوتا ہے۔ دوسری وہ جس میں بحر سرے سے ہوتی ہی نہیں۔ لیکن ایک بات دونوں میں مشترک ہے وہ یہ کہ کوئی فری ورس بھی کسی خاص نمونے کے مطابق نہیں ہوتی۔

"فری ورس کی صنف میں ایسی نظمیں کافی مقدار میں موجود ہیں جو حقیقی معنی میں نظمیں کہلانے کی مستحق اور مطالعہ کے قابل ہیں لیکن یہ حقیقی نظمیں، اگر غور سے انکا مطالعہ کیا جائے تو باضابطہ نظموں سے چنداں مختلف نہیں ہیں۔ فرق ہے تو صرف اسی قدر کہ وہ کسی بحر میں نہیں لکھی گئیں۔ فری ورس کو در اصل نظم اور نثر کی درمیانی کڑی سمجھنا چاہئے فری ورس کا بیشتر حصہ ایک باآہنگ نثر ہے اُسے اس طرح چھاپا جاتا ہے کہ آہنگ نمایاں رہے۔ میری ڈتھ (MERVDITH) وغیرہ کی نثر میں اس قسم کے ٹکڑے موجود ہیں جو فری ورس سے کسی طرح مختلف نہیں، چنانچہ پروفیسر لونگسٹن لوز (LIVINGSTON LOWES) نے ان ادیبوں کے کلام سے نثر کے ٹکڑے نکال کر اور فری ورس سے اُس کا مقابلہ کر کے دکھا دیا کہ دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فری ورس اپنی وضع کے لحاظ سے کوئی نئی چیز نہیں۔ اور جو لوگ اسے نظم

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ فری ورس۔

سکتے ہیں وہ نظم کے معنی کو اس حد تک وسیع کر دیتے ہیں جو اب تک عام طور پر نثر کے مفہوم میں شامل رہے ہیں۔ؔ

فری ورس لکھنے والوں میں بعض کا قول ہے کہ فری ورس کے متعلق انکا کوئی معینہ نظریہ نہیں ہے۔ پرانی وضع کی باضابطہ نظم کے نمونے اُن کے نزدیک تشفی بخش نہیں جب وہ اپنے شدید جذبات کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو محض اپنی طبیعت کی رہنمائی میں اُن کے اظہار کے لئے کوئی سی وضع اختیار کر لیتے ہیں اور جوں جوں آگے بڑھتے جاتے ہیں آہنگ کو اپنی ہنگامی تحریک کے مطابق بدلتے جاتے ہیں۔

دوسری جماعت کا خیال ہے کہ فری ورس اپنی مخصوص صفات کیساتھ ایک وضع معین رکھتی ہے۔ اور انھوں نے وہ اصول بھی بیان کئے جن پر فری ورس کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ امریکی شاعرہ مس ایمی لوول (AMY LOWEL) اس گروہ کی خاص نمائندہ ہیںؔ۔ وہ فرماتی ہیں کہ اس قسم کی نظم کو فری ورس کے بجائے "نظم باآہنگ" (candenced verse) کہنا زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ فری ورس کے لکھنے والے آزادی کے جویا نہیں بلکہ وہ ایک سخت تر نظام چاہتے ہیں۔

فری ورس کے لکھنے والوں میں سے بعض نے توازن اور تناسب کی ضرورت پر بہت زور دیا ہے۔ اب رہی فری ورس کے بندوں کی ساخت تو اس کا سمجھنا ذرا دشوار ہے لیکن اس کے مشابہ ایک چیز (PSALMS) میں مل سکتی ہے۔

لہ THE NATURE OF ENGLISH POETRY BY L.S.HARRTS, P 126.

ک Contemporary American Literature by Manly & Rickert, page 56.

جملے لمبائی میں چھوٹے بڑے ہوتے ہیں لیکن سب کا اتار چڑھاؤ ایک ہی انداز پر رکھا جاتا ہے۔ فری ورس کچھ تو باضابطہ نظم کی طرف سے بے رغبتی کی بنا پر وجود میں آئی اور کچھ اس عقیدے کی بنا پر کہ ہماری دنیا بڑی سرعت کے ساتھ تبدیل ہو رہی ہے لہذا نئے ذرائع اظہار کی ضرورت ہے۔ فری ورس کے حامی کہتے ہیں کہ باضابطہ نظم خلوص اظہار کے راستے میں معین ہونے کے بجائے ایک رکاوٹ ہے۔ جو شخص قافیہ تلاش کرتا ہے اور اپنے الفاظ کو ایک خاص بحر میں "فٹ" کرنا چاہتا ہے وہ اکثر اپنے مصرعوں میں غیر ضروری الفاظ بھر دیتا ہے۔ یہ لوگ ملٹن اور شیکسپیر کی بہترین نظموں میں بھی اس قسم کی کوتاہیاں ثابت کرتے ہیں۔

فری ورس لکھنے والوں میں سے ایک جماعت کا دعویٰ ہے کہ ہمیں بعض نئی کیفیات کا اظہار مقصود ہے اور کسی پرانی وضع کی باضابطہ نظم میں اسکی گنجایش نہیں بعض ان سے بھی دو قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری روزانہ زندگی کا آہنگ (Rythm) بدل گیا ہے چنانچہ دور حاضر کی "جاز" اور "بیلٹ" (Jazz & Ballet) قسم کی موسیقی میں اس نئے آہنگ کی گونج پائی جاتی ہے۔ لہذا اگر نظم کو زندگی کے ساتھ کوئی قریبی علاقہ رکھنا ہے تو نظم میں بھی اس کا موجود ہونا ضروری ہے۔

فری ورس میں جہاں خرابیاں ہیں وہاں خوبیاں بھی ہیں، مثلاً:

(۱) کلام میں تعقید نہیں ہونے پاتی کیونکہ جملوں کی ترکیب اکثر و بیشتر نثر کے مطابق رہتی ہے۔

(۲) قافیہ کے لزوم سے نجات مل جاتی ہے۔

(۳) مقررہ لفظوں، فقروں اور تشبیہوں کے استعمال کی ضرورت باقی نہیں رہتی، جو باضابطہ نظم کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔

(۴) کلام حشو وزوائد سے پاک ہوتا ہے۔ کہنے والے کو جو کچھ کہنا ہو وہی کہہ سکتا ہے۔ کوئی لفظ "برائے بیت" استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

(۵) مضمون کی طرف توجہ مرکوز رہتی ہے۔

اب فری ورس کی چند موٹی موٹی خامیاں بھی سن لیجئے۔

(۱) بحر کی وجہ سے کلام میں جو زور اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے فری ورس اس سے محروم رہتی ہے۔ بحر کی وجہ سے سننے والے میں کلام کی پذیرائی کی ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بحر الفاظ کو ایک نیا زور اور نیا حسن بخشتی ہے اور سننے والے پر اس کا ایک خاص اثر ہوتا ہے۔ فری ورس میں یہ بات نہیں۔

(۲) فری ورس میں اس امر کا کچھ پتا نہیں چلتا کہ مصرعوں پر کس طرح زور دیا جائے۔ مصرعوں کو ترتیب سے پڑھنے والے کو یہ تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس مقام پر ٹھہرنا اور کس مقام پر آواز کو پست کرنا چاہئے لیکن خود مصرع کے اندر اس قسم کی کوئی علامت موجود نہیں ہوتی۔

(۳) باضابطہ نظم کے مقابلے میں فری ورس کو آہنگ کے ساتھ پڑھنا بہت دشوار ہے۔ ہر شخص کو اس کے آہنگ کا پتہ ہی نہیں چلتا۔

(۴) فری ورس کا سب سے بڑا عیب وہ چیز ہے جو بظاہر اُس کا حسن نظر آتی ہے فری ورس میں شاعر اور اُس کے واسطۂ اظہار کے درمیان کسی قسم کی کشمکش کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہ کشمکش ہی وہ چیز ہے جسے ہمارے فارسی اور اردو کے اساتذہ نے "جگر کاوی" سے تعبیر کیا ہے اور جس کی بدولت کلام کو چار چاند لگ جاتے ہیں جب ہم اعلیٰ درجہ کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ "نمونہ" شاعر کے راستے میں حائل ہونے کے بجائے عام طور پر اُسے کامل اور مکمل اظہار میں مدد دیتا ہے۔

یہ خیال غلط ہے کہ کوئی نظم پوری کی پوری شاعر کے دماغ میں موجود ہوتی ہے

تاکہ اُسے کسی قالب میں ڈھال دیا جائے یا بزور اس میں ٹھونس دیا جائے۔ درحقیقت جب تک عمیق جذبات الفاظ سے چھوتے نہیں اور وزن سے مس نہیں کرتے اسوقت تک نظم شاعر کے دماغ میں پیدا ہونا شروع ہی نہیں ہوتی۔ بحر کوئی سانچا نہیں ہے کہ نظم کو اس میں بھر دیا جائے۔ بلکہ وہ نظم کی ساخت میں شاعر کی ایک عملی شریک کار رہے شاعر کے مزاج کی حالت اور اس کا شدید احساس یہ دونوں مل کر نظم کے لئے بحر اور وضع معین کرتے ہیں اور پھر ان دونوں کی مدد سے نظم وجود میں آتی ہے۔ آیئے اب ان مقدمات کی روشنی میں اُردو کی فری ورس یعنی آزاد نظم کا جائزہ لیں۔

آزاد نظم شروع سے آخر تک کسی ایک بحر میں تو نہیں لکھی جاتی لیکن عموماً اس میں جا بجا کسی ایک ہی بحر میں متعدد مصرعے موجود ہوتے ہیں۔ عام اصول اس کا یہ ہے کہ لکھنے والا کسی بحر کا ایک سالم رکن انتخاب کر لیتا ہے اور ہر سطر یا مصرع میں اگر اُسے مصرع کہا جا سکے، اسی رکن کی تکرار ہوتی ہے۔ رکن کی تکرار ہر سطر یا مصرع میں برابر نہیں ہوتی اس لئے مصرعے لمبائی میں چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔ کوئی مصرع صرف ایک رکن کا ہوتا ہے کسی میں دو یا تین کسی میں چار یا پانچ، اور کسی میں پندرہ بیس رکن بھی ہوتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہر مصرعے کے خاتمہ پر ایک مزاحف رکن کا استعمال کیا جاتا ہے بعض اوقات دو مختلف بحروں کے دو دو رکن، سالم یا مزاحف کو باہم ملا کر ایک رکن قرار دیا جاتا ہے۔ یہ باتیں مندرجہ ذیل مثالوں سے اچھی طرح سمجھ میں آ جائیں گی۔

"سنگِ آستاں" از میراجی

(۱) سکھا نغمہ محبت کا، مجھے محسوس کرنے دے	مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن
(۲) جوانی کو	مفاعیلن
(۳) ہے نغمہ جنہیں ہموار بندھنا تھیں تار و نکی حرکت سے	مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن۔

(۴) میں اسے آؤ نگا ہستی کو مجسّم شکل کی صورت — مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن۔
(۵) انھیں تاروں کو خوابوں سے جگا دے — ″ ″ ″
مجھے اے رات کے ساقی — ″ ″
(۶) مجھے معلوم ہیں باتیں — ″ ″
(۷) وہ باتیں جو اچھوتی ہیں، پرانی ہیں — ″ ″ ″

آپ نے دیکھا کہ ہر سطر (یا مصرع) ″مفاعیلن″ کے آہنگ پر ہے چھٹی سطر میں دو بار، ساتویں میں تین بار، پہلی، تیسری اور چوتھی میں چار بار اور پانچویں میں پانچ بار ″مفاعیلن″ کی تکرار ہے پہلی، تیسری اور چوتھی (نیز ساتویں) سطریں باضابطہ مصرعے ہیں۔ ″مفاعیلن″ بحر ہزج کا رکن سالم ہے۔ سالم اس رکن کو کہتے ہیں جس میں تغیر نہ ہوا ہو۔ اور جب اس میں کوئی تغیر ہو جائے تو اُسے مزاحف کہتے ہیں مثلاً مفاعیلن جب مفاعِلُن، فاعلُن یا مفاعیل کی صورت اختیار کرے تو اُسے رکنِ مزاحف کہیں گے۔

″خودکشی″ از ن م راشد

آتا جاتا ہوں بڑی مدت سے میں — فاعِلاتُن۔ فاعِلاتُن۔ فاعِلُن۔
ایک عشوہ ساز وہرزہ کار محبوبہ کے پاس — فاعِلاتُن۔ فاعِلاتُن۔ فاعِلاتُن۔ فاعِلُن۔
اس کے تختِ خواب کے نیچے مگر — ″ ″ فاعِلُن۔
آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو — ″ ″ ″
تازہ و رخشاں لہو — ″ فاعِلُن

″فاعلاتن″ بحرِ رمل کا رکن سالم ہے اور ″فاعلن″ رکن مزاحف۔ مندرجہ بالا مثال میں ہر سطر کے آخر میں رکن مزاحف آیا ہے۔ شروع سے آخر تک پوری نظم میں وزن کا یہی اُصول پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ پہلی چار سطریں بحرِ رمل میں باقاعدہ مصرعے ہیں۔

ہم ابھی بیان کر چکے کہ بعض اوقات آزاد نظم کی ایک سطر (یا "مصرع") اتنی طویل ہوتی ہے کہ اُس میں ایک رکن کی پندرہ بیس مرتبہ تکرار ہوتی ہے۔ مثلاً میرا جی کی ایک نظم "محرومی" کا انھیں کے بقول ایک "مصرع" ہے :-

"تم آؤ تو گونج اٹھے تنہائی دالان میں آنے جانے کی آہٹ سے ہنگامہ پیدا ہو لیکن مسہری کے آغوش کی لرزشوں میں تھیں اس کا احساس بھی ہونے پائے تو ذمہ ہے میرا"

اس "مصرع" میں بیس مرتبہ "فعولن" کی تکرار ہوتی ہے۔ مگر اتنے لمبے مصرعے شاذ و نادر ہی لکھے جاتے ہیں۔

آزاد نظم میں اگرچہ وزن کا صرف اسی قدر لحاظ رکھا جاتا ہے کہ اسکی ہر سطر میں کسی ایک رکن کی غیر معین تکرار ہوتی ہے مگر اس کے باوجود آزاد نظم لکھنے والے اس ادنیٰ سی ذمہ داری سے بھی پورے طور پر عہدہ برآ نہیں ہوتے اور جا بجا ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ اصولاً سطروں (یا مصرعوں) کی تقسیم اس طرح ہونی چاہئے کہ وزن کے لئے جو رکن اختیار کیا گیا ہے وہ ٹوٹنے نہ پائے۔ ورنہ کلام کا سارا آہنگ کہ اُسی پر یہ ساری عمارت کھڑی ہے، یکسر فنا ہو جائے گا چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

"بے بسی" از انجم رومانی

(۱) وہ مری شمع کہن	فاعلاتن فعلن
(۲) اپ ہوتا ہے تصور کے دھندلکوں میں	فعلن۔ فعلاتن
چراغاں جس سے	فعلاتن۔ فعلن۔
(۳) اور یہ قہقہۂ نو	فاعلاتن۔ فعلاتن

اصولاً تیسری سطر کا آخری رکن "فعلن" ہونا چاہئے تھا کیونکہ ہر سطر کو اسی پر

تمام ہونا چاہیے۔ مگر "فعلاتن" ہو گیا۔

"ایام گذشتہ" از ضیا فتح آبادی

مجھے بیتے ہوئے ایّام پھر کیوں یاد آتے ہیں　　　مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن
محبت کے وہ لمحے، ہاں وہی لمحے　　　〃　〃　〃　〃
جنھیں ہم زیں سمجھتے ہیں جہاں والے　　　〃　〃　〃　〃
مگر جنکے تصور سے لرز جاتا ہے دل میرا　　　〃　〃　〃　مفاعیلن
محبت کے وہ ہیبتناک لمحے،　　　〃　〃　مفاعی،

پوری نظم کا آہنگ "مفاعیلن" ہے لیکن مندرجہ بالا بند کی آخری سطریں مفاعیلن کے بجائے صرف "مفاعی" ہی رہ گیا۔

"محرومی" از میراجی

میں کہتا ہوں تم سے اگر شام کو بھول کر بھی کسی نے کبھی کوئی دھندلا ستارا نہ دیکھا تو اس پر تعجب نہیں ہے نہ ہوگا۔"

اس نظم کا ہر "مصرع" فعولن کی تکرار سے بنا ہے لیکن اس "مصرع" میں۔

مسہری کے آغوش کی لرزشوں کا مجھے خواب بھی اب نہ آئے گا۔

آخری رکن فعولن کے بجائے مفاعیلن ہو گیا۔

"ناکام" از ظہیر الدین ایم اے

پہلا بند: خاموش سی، بے ضرر سی لڑکی — معصوم سی بھولی بھالی — تو جانتی ہے کہ تجھ میں کتنی طاقت ہے جان کو روندنے کی۔

پوری نظم مفعول. مفاعلن فعولن. یا مفعولن. فاعلن فعولن کی تکرار پر مبنی ہے لیکن چوتھے بند کا آخری مصرع۔

جس میں افلاک کی گردشوں سے، مجھ کو عافیت اور پناہ ملتی۔ میں یہ آہنگ قائم نہ رہ سکا۔

اگر اس طرح ہوتا۔ " افلاک کی گردشوں سے جس ہیں، مجھ کو امن و پناہ ملتی " تو صحیح ہو سکتا تھا۔ پہلے بند کا دوسرا " مصرع " بھی محلِ نظر ہے۔

غرض آزاد نظموں میں اس قسم کی خامیاں اکثر دیکھنے میں آتی ہیں۔

آزاد نظموں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ عام طور پر سمجھ میں نہیں آتیں۔ انگریزی فری ورس کا تو صرف پڑھنا ہی دشوار ہے۔ اُردو کی آزاد نظم کا سمجھنا بھی سہل نہیں۔ کم سے کم راقم الحروف جیسا متوسط درجہ کا لکھا پڑھا آدمی تو انھیں آسانی سے نہیں سمجھ سکتا۔ آزاد نظم کے لکھنے والوں میں جو لوگ دوسرے اور تیسرے درجہ کے ہیں اُن کا کلام تو سمجھ میں آ بھی جاتا ہے لیکن جو لوگ صفِ اوّل میں کھڑے ہیں اُن کا کلام جب تک وہ خود یا انھیں کی جماعت کا کوئی دوسرا شخص اس کی تفسیر نہ کرے، سمجھا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ ن۔م۔ راشد کی نظم " زنجیر " کے صرف ایک پہلے بند کی تشریح کے لئے۔ (اور وہ بند یہ ہے۔ " گوشۂ زنجیر میں — اک نئی جنبش ہویدا ہو چلی۔ سنگِ خارا ہی سہی، خارِ مغیلاں ہی سہی — دشمنِ جاں، دشمنِ جاں ہی سہی — یہ بھی تو شبنم نہیں — یہ بھی تو مخمل نہیں، دیبا نہیں، ریشم نہیں) میراجی کو پورا ایک صفحہ سیاہ کرنا پڑا اور پھر بھی مطلب واضح نہ ہو سکا تو پندرہ سطر کا ایک مکالمہ ترتیب دینا پڑا۔ بایں ہمہ بات جہاں تھی وہیں کی وہیں رہی (دیکھو " ادبی دنیا " لاہور، جنوری ۱۹۴۲ء صفحہ ۴۵)

افسوس ہے کہ جگہ کی کمی اجازت نہیں دیتی کہ مثال کے لئے متعدد دوسری نئی نظمیں نقل کر کے واضح کیا جائے۔ پھر بھی نمونے کے طور پر ہم ایک نظم ضرور پیش کریں گے۔

" سنگِ آستاں " از میراجی

" سکھا نغمہ محبت کا، مجھے محسوس کرنے دے — جوانی کو — ہے نغمہ جن میں خوابیدہ، انھیں تاروں کی حرکت سے — میں لے آؤں گا ہستی کو مجسم شکل کی صورت

— انھیں تاروں کو خوابوں سے جگانے دے مجھے، لے رات کے ساقی! — دکھانے دے مجھے جلوہ تاروں کے الجھنے کا — اسی منظر کو لے آؤں گا میں پھر اپنے نگاہوں میں — جو ہے باقی — جو آویزاں ہے ابتک وقت کی دیوی کے آنچل میں "

"پکڑ کر ہاتھ میں نجھی کو اس دھرتی کے جنگل میں — اسی خلوت کے محمل میں — ترے دل میں — جگا دوں گا میں اپنی گرم آہوں سے — اسی نغمہ کو جو سویا ہے تیرے جسم کے محبوب تاروں میں "

"مجھے معلوم ہیں باتیں — وہ باتیں جو اچھوتی اور پرانی ہیں — مگر نادان ہیں جذبے — ارادہ ہے کہ لے کر آج ان جذبوں کو میں تاریک غاروں میں — بنوں گا ہم سفر تیرا "

"چل آ! رنگین کہانی کو — شروع عشق کی منزل سے لے بھاگیں — اسے اس رات کے پہلے اندھیرے میں — وہاں پر ال کے پہونچا دیں — جہاں ہے گوہر مقصود پوشیدہ نگاہوں سے — سہانی گرم آہوں میں "

نظم کا عنوان دیکھکر قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اسمیں یا تو "سنگِ آستاں" کی تعریف (مدح نہیں) کی گئی ہوگی، یا سنگِ آستاں سے تعلق رکھنے والی دوسری چیزوں کا ذکر ہوگا۔ یا شاعر نے اپنے محبوب یا مرشد کے سنگِ آستاں سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہوگا۔ لیکن پوری نظم کو تین مرتبہ پڑھنے کے بعد بھی یہ پتا نہیں چلتا کہ نظم کا سنگِ آستاں سے کیا تعلق ہے۔ پہلے بند میں رات کے ساقی سے خطاب کیا گیا ہے معلوم نہیں کہ رات کا ساقی کون شخص ہے۔ اور وہ کوئی شخص ہے یا خود رات سے مراد ہے۔ پھر اُس رات کے ساقی کو حکم دیا گیا ہے کہ "سکھا نغمہ محبت کا" یہ خود ایک انوکھی بات ہے۔ ساقی کا کام شراب پلانا ہے نغمہ سکھانا نہیں نغمہ تو مطرب سکھا سکتا ہے۔ دوسرے بند میں شاعر صاحب کسی نجھی یا پکھیرو کو ہاتھ میں پکڑ،

خلوت کے محل میں در آتے ہیں اور مخاطب کے جسم کے محبوب تاروں میں جو نغمے سوئے ہوئے ہیں انھیں بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بھید اب بھی نہ کھلا کہ آپ کا مخاطب کون ہے۔ آیا وہی رات کا ساقی، یا سنگِ آستاں یا کوئی اور تیسرے بند میں نادان جذبوں کو ساتھ لے کر شاعر صاحب تاریک غاروں میں اپنے مخاطب کے ہم سفر بننا چاہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخاطب کوئی تاریک غاروں میں بسنے والی مخلوق ہے۔ چوتھے بند میں عشق کی رنگین کہانی کا ذکر ہے اور رات کے پہلے اندھیرے کا بھی۔ ظاہر ہے کہ عشق کی رنگین کہانی رات کے پہلے اندھیرے ہی میں مکمل ہوتی ہے۔ یہ تو سب کچھ ہوا مگر "سنگ آستاں" بیچارے کا پھر کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں رہ گیا۔

جیسا کہ ہم ابتدا ہی میں بیان کر چکے ہیں آزاد نظم ہماری ایجاد نہیں۔ ہمنے تو حسب معمول صرف نقّالی کی ہے۔ اس لئے اس کے موجدوں یعنی یورپ اور امریکہ والوں نے اس کی حمایت میں جو کچھ کہا ہے وہی ہم بھی اُردو کی آزاد نظم کی حمایت اور پابند نظم کی مخالفت میں دُہراتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ فرماتے ہیں:-

"بات یہ ہے کہ ادب کے اُس وقت کے تصوّر میں جب کہ ہماری بلند ترین شاعری ردیف وقافیہ کی قید میں تخلیق ہو سکی اور آج کے تصور میں بنیادی فرق پیدا ہو چکا ہے۔ اس وقت شاعری کا مقصد زندگی کی عکاسی یا خلوص، سوچ سمجھ اور سیدھے سادے طریقے سے اس کی مشکلات کا حل ڈھونڈنا نہیں بلکہ دماغی عیّاشی اور تفریح تھا۔"

یہ خیال کسی ایک فرد کا نہیں بلکہ اُس پوری جماعت کا ہے جو وزن اور قافیہ کی مشکلات سے بھاگ کر آزاد نظم کی سہولتوں کے دامن میں پناہ لینی چاہتی ہے

"سبحان اللہ" سے زیادہ اس نادر علمی تحقیق کی داد نہیں دی جا سکتی، مگر اس کی جانچ ضرور کی جا سکتی ہے۔ دعوے کے تین حصے ہیں۔

(۱) پرانی شاعری زندگی کی عکاسی نہیں کرتی۔

(۲) پرانی شاعری میں خلوص نہیں۔

(۳) پرانی شاعری زندگی کی مشکلات کا حل تلاش نہیں کرتی۔

ضمناً یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ بحر و قافیہ سے محروم نئی شاعری میں یہ سب خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

"پرانی شاعری زندگی کی عکاسی نہیں کرتی" اس سے فاضل موصوف کا غالباً یہ مطلب ہے کہ جو مسائلِ حیات آج ہمیں درپیش ہیں اُن کا ذکر اور اُنکا حل پرانی شاعری میں موجود نہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ جو مسائل اس وقت موجود ہی نہ تھے اُن کے متعلق شعرا کو کچھ سوچنے اور کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی، سرمایہ دار اور مزدور کی جنگ اس وقت شروع نہیں ہوئی تھی۔ جمہوریت نے استبداد اور شہنشاہیت سے ایسی ٹکر نہیں لی تھی۔ پھر میر و سودا، میاں نظیر اکبرآبادی، غالب مومن، ذوق، ناسخ و آتش، انیس و دبیر، اور داغ و امیر کیونکر ان مسائل کو موضوعِ سخن بناتے۔ لیکن اگر زندگی کی عکاسی سے یہ مراد ہے کہ اُس دور میں زندگی کیونکر گذر رہی تھی۔ آدابِ معاشرت کیا تھے۔ تہذیب کے اصول و آئین کیونکر برتے جاتے تھے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں لوگ کس طرح دلچسپی لیتے تھے کیا کھاتے تھے، کیا پہنتے تھے، کیونکر رہتے سہتے تھے۔ کیا مشاغل تھے۔ تفریحات کے کیا کیا سامان تھے۔ داد و ستد کے طریقے کیا تھے۔ شادی غمی کی رسمیں کیا کیا تھیں۔ لوگوں کے اخلاق و اطوار کیسے تھے۔ جنسی معاملات میں اُن کے خیالات کیا تھے۔ حیات بعد الممات کے عقیدے کا اُن کی عملی زندگی پر کیا اثر پڑتا تھا۔

روحانی اور مادی ترقیوں کے متعلق ان کا نقطۂ نظر کیا تھا۔ اگر ان امور کے اجمالی اور تفصیلی تذکرے کو زندگی کی عکاسی کہا جا سکتا ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ پرانی شاعری (جس میں غزلیں، قصیدے، مثنویاں، مرثیے، قطعے، رباعیاں واسوخت اور نظم کے دوسرے تمام اقسام شامل ہیں) اُس دور کی زندگی کی اچھی طرح عکاسی کرتی ہے۔

رہا دوسرا اعتراض کہ پرانی شاعری میں خلوص نہیں، تو یہ بھی نرا دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ غزل کی شاعری میں نقالی زیادہ اور اصلیت کم ہے مگر بالکل مفقود نہیں۔ ورنہ کیا سبب ہے کہ کسی اُستاد کا کوئی اچھا شعر سُن کر اہلِ ذوق تڑپ اٹھتے ہیں اور سر دھننے لگتے ہیں۔ خلوص کے بغیر کلام میں یہ تاثیر پیدا ہو ہی نہیں سکتی کہ شعر تیر و نشتر کی طرح کلیجے میں اتر جائے اور سننے والا دل تھام کر رہ جائے۔ درحقیقت ہماری شاعری کے ہر دور میں خلوص کے ساتھ لکھنے والے بہت کم اور نقال زیادہ گذرے ہیں۔ خود آج بھی یہی حال ہے۔ عیش و عشرت کے گہواروں میں دن چڑھے تک خواب نوشیں کے مزے لینے والے، مزدور اور کسان کی بدحالی پر نظمیں لکھتے ہیں۔ پھر ایسے لوگ جو سرمایہ دار کے معنی فقط مالدار اور مزدور کے معنی مٹی ڈھونے والا سمجھتے ہیں، جو معاشیات کے ابتدائی اصول سے بھی واقف نہیں، وہ بھی محض دوسروں کی تقلید میں مزدور اور سرمایہ دار کو موضوعِ سخن بناتے ہیں اور ان نقالوں کی تعداد حقیقی شاعروں سے کہیں زیادہ ہے۔ کیا ایسے ہی لکھنے والے ہماری زندگی کی گتھیوں کو سلجھا سکتے ہیں اور ہماری گوناگوں خصوصاً اقتصادی اور جنسی مشکلات کا حل ڈھونڈ سکتے ہیں؟

میری عزیز بہن ڈاکٹر رشید جہاں نے جو ہندوستان کی ایک انتہا پسند

کمیونسٹ اور اُردو کی مشہور افسانہ نگار ہیں، دورِ حاضر کے ایک مشہور شاعر کے متعلق مجھے لکھا کہ "بھائی، میں نے آپ کے مزدور شاعر کی نظموں کے دونوں مجموعے پڑھ ڈالے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان نظموں میں خلوص کا تو کہیں پتا بھی نہیں۔ عموماً جوش کی نقالی کی ہے۔ شاعر کا مطمحِ نظر اور اس کی ساری جدوجہد کا مقصد صرف اتنا ہے کہ "میں بورئے پر پیدا ہوا قالین پر مروں گا۔"

دورِ حاضر کے بیشمار شعرا جو محض دوسروں کی دیکھا دیکھی فقط اپنی نظموں میں سرمایہ دار کے دشمن اور مزدور کے دوست بن گئے ہیں، خود ہی خلوص سے بیگانہ ہیں۔ پھر اُن کی نظموں میں خلوص اور خلوص سے پیدا ہونے والی تاثیر کہاں سے آئے۔

وقت نے جیسے جیسے کروٹیں لیں اور زندگی میں گوناگوں انقلابات رونما ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ قدرتی طور پر ہمارے میلانات اور رجحانات بھی بدلتے گئے۔ چنانچہ ہر دور کے رجحانات کا اثر معاصرانہ شاعری میں صاف طور پر نظر آتا ہے۔ یہی نئے رجحانات تھے جنھوں نے غزل کی باگ نظم کی طرف موڑ دی اور آزاد، حالی، اور اسمٰعیل کو پیدا کیا۔ ان کے بعد اکبر آئے۔ پھر اقبال سب پر چھا گئے۔ اب جوش اور اُن کے ہمنواؤں کا دَور ہے۔ ان لوگوں نے جو کچھ کہا ہے وہ بحر اور قافیہ کی قید کے ساتھ ہی کہا ہے۔ مشکل سے مشکل فلسفیانہ نکات، نادر سے نادر شاعرانہ لطائف، نازک سے نازک حکیمانہ باتیں، جو ہماری زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہیں۔ "پابند نظم" ہی میں انتہائے حسن کے ساتھ بیان کی ہیں۔ انھیں کبھی یہ شکایت نہیں ہوئی کہ اظہارِ خیال کے لئے "پابند نظم" ایک ناقص واسطہ ہے۔ نہ انھیں کبھی نظم معرّا یا نظم آزاد کے دامن میں پناہ لینی پڑی۔

اقبال اگر آزاد نظم کے حامیوں کی طرح پابند نظم کی پابندیوں کو اپنی راہ میں حائل پاتے تو یقیناً وہ انھیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیتے۔ اور آزاد نظم کہنے والوں میں سب سے پیش پیش ہوتے۔ نہ صرف اس لئے کہ قدرت نے انھیں شاعرانہ دل و دماغ اور شاعرانہ اہلیتیں عطا کی تھیں بلکہ انھیں دنیا کو ایک پیغام پہونچانا تھا۔ اور پیغام پہونچانے کے لئے سب سے زیادہ مؤثر طریقہ اختیار کرنا ہی دانشمندی کی بات ہے۔ اقبال نے سب سے زیادہ مؤثر طریقہ ہی اختیار کیا اور دنیا جانتی ہے کہ وہ طریقہ آزاد نظم نہیں۔

ہمارے شاعروں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو صرف متشاعر ہیں یعنی طبیعت موزوں پائی ہے۔ نظم کر سکتے ہیں لیکن خیالات اُن کے پاس نہیں۔ اس لئے وہ نقالی پر مجبور ہیں۔ دوسرے وہ جو شاعرانہ طبیعت رکھتے ہیں، خیالات اُن کے پاس موجود ہیں لیکن نظم میں انھیں خوبصورتی کے ساتھ بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ تیسرے وہ جنھیں مبدء فیاض نے اعلیٰ درجہ کے تخیل کے ساتھ ساتھ بہترین قسم کی قدرتِ اظہار بھی عطا کی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے خیالات کو رنگینیوں سے معمور، موسیقی میں ڈوبی ہوئی، سراپا حُسن نظموں کی شکل میں پیش کر سکتے ہیں۔ درحقیقت یہی وہ لوگ ہیں جو ایک حقیقی شاعر کی حیثیت سے احترام کے مستحق ہیں۔ دوسرے گروہ میں وہ لوگ شامل ہیں، جو آزاد نظم میں بہترین قسم کے شاعرانہ اور حکیمانہ خیالات کا اظہار کرتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ صرف دوسرے درجہ کے لوگ ہیں۔ پہلی صف میں جگہ نہیں پا سکتے رہ گئی متشاعروں کی جماعت تو اُن سے تعرض کرنا محض بے سود ہے۔ ان کا کلام عموماً ان سے پہلے مرجاتا ہے۔ اور کبھی کبھی اُن سے کچھ زیادہ عمر پاکر گوشۂ گمنامی میں جا سوتا ہے۔

اُردو میں آزاد نظم کے لکھنے والے، آزاد نظم کی برتری ثابت کرنے کے لئے وہی دلائل پیش کرتے ہیں جو نری درس کے مغربی حامیوں سے انھیں ملے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بحر اور قافیہ کی پابندیاں مضمون کا خون کر دیتی ہیں اسکے علاوہ نئی زندگی اور نئے حالات نے کچھ ایسے نئے خیالات اور نئے جذبات ہمیں دیئے ہیں جن کے لئے ایک نئے واسطۂ اظہار کی ضرورت ہے پابند نظم کا سانچا ان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں باتیں کبھی تو خود فریبی کے لئے اور کبھی عالم فریبی کے لئے کہی جاتی ہیں درحقیقت یکسر سراسر خلاف ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ یہ لوگ پابند نظم میں حسن و خوبی کے ساتھ اظہارِ خیال پر قادر نہیں اور اپنی اس کوتاہی کو چھپانے کے لئے خود پابند نظم ہی کو ناکارہ ثابت کر دینا چاہتے ہیں۔ وہی مثل ہے کہ ناچ نہ جانوں آنگن ٹیڑھا۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ ایک قادر الکلام شاعر ہر قسم کے خیالات کو بحر اور قافیہ کی قید کے ساتھ نہایت حسن و خوبی سے نظم میں ادا کر سکتا ہے۔ اور کسی بڑے مشاق ناظم کا تو ذکر ہی کیا، خود راقم الحروف جسے سال میں دو چار شعر لکھنے کا اتفاق مشکل ہی سے ہوتا ہے ایک آزاد نظم کو پابند نظم میں تبدیل کر سکتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ خیالات میں کوئی خاص تغیر نہ ہونے پائے اور نظم کا مجموعی حسن نسبتاً بڑھ جائے۔ ذیل کی مثال سے قارئین کو کسی حد تک اس امر کا اندازہ ہو سکے گا کہ یہ دعویٰ بے دلیل نہیں۔ آزاد نظم کے لکھنے والوں میں میراجی ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی ایک نظم ہے "سنگِ آستاں" پہلے ہم اسے وزن سے آراستہ کرتے ہیں۔

سنگِ آستاں

سکھا نغمہ محبّت کا، مجھے محسوس کرنے دے
جوانی کو
ہے نغمہ جن میں خوابیدہ انھیں تاروں
کی حرکت سے
میں لے آؤں گا ہستی کو مجسّم شکل کی صورت
انھیں تاروں کو خوابوں سے جگا لے
دے مجھے اے رات کے ساقی!
دکھانے دے مجھے جلوہ ستاروں کے اُلجھنے کا
اسی منظر کو لے آؤں گا میں پھر سے
نگاہوں میں
جو ہے باقی
جو آویزاں ہے اب تک وقت کی
دیوی کے آنچل میں

مجھے اے رات کے ساقی، سکھا نغمہ محبّت کا
(اور اس کے کیف میں) محسوس کرنے دے جوانی کو
ہے نغمہ جن میں خوابیدہ انھیں تاروں
کی حرکت سے
میں لے آؤں گا ہستی کو مجسّم شکل کی صورت
انھیں سوئے ہوئے تاروں کو خوابوں
سے جگانے دے
دکھانے دے مجھے جلوہ ستاروں کے اُلجھنے کا
اسی منظر کو لے آؤں گا میں پھر سے
نگاہوں میں
جو آویزاں ہے اب تک وقت کی
دیوی کے آنچل میں

پکڑ کر ہاتھ میں تجھ کو اس دھرتی کے
جنگل میں
اسی خلوت کے محل میں
ترے دل میں

پکڑ کر ہاتھ میں تجھ کو اس دھرتی کے
جنگل میں
اسی خلوت کے محل میں، ترے (رمز آشنا)
دل میں
جگا دوں گا میں اپنی گرم آہوں سے
وہی نغمہ

جگا دوں گا میں اپنی گرم آہوں سے
اسی نغمہ کو جو سویا ہے تیرے جسم کے مجوب
تاروں میں

جو خوابیدہ ہے تیرے جسم کے مجوب
تاروں میں

مجھے معلوم ہیں باتیں
وہ باتیں جو اچھوتی اور پرانی ہیں
گرنادان ہیں جذبے
ارادہ ہے کہ لیکر آج ان جذبوں کو میں
تاریک غاروں میں
بنوں گا ہم سفر تیرا

وہ باتیں جانتا ہوں میں جو سرتاسر
اچھوتی ہیں
اچھوتی بھی، پرانی بھی، مگر نادان ہیں
جذبے
ارادہ ہے کہ لیکر ساتھ ان نادان جذبوں کو
بنوں گا آج تیرا ہم سفر تاریک غاروں میں

چل آ! رنگیں کہانی کو
شروع عشق کی منزل سے لے بھاگیں
اسے اس رات کے پچھلے اندھیرے میں
وہاں پر مل کے پہونچا دیں

(نہ لا اب دل میں کچھ وسواس) آ!
رنگیں کہانی کو
(چرا کر) ابتدائے عشق کی منزل سے
لے بھاگیں
اور اس شب کے اندھیرے میں وہاں پر
مل کے پہونچا دیں
جہاں ہے گوہر مقصود پوشیدہ نگاہوں سے

جہاں ہے گوہر مقصود پوشیدہ نگاہوں سے   سہانی گرم آہوں میں (محبت کی پناہوں میں)
سہانی گرم آہوں میں

لیجیے بحر کا مرحلہ تو طے ہوگیا۔ اب صرف قافیہ کی منزل باقی ہے۔ پابند نظم کیلئے میں نے بالقصد وہی بحر اختیار کی ہے جس میں آزاد نظم کے بعض مصرعے پہلے سے موجود تھے۔ آزاد نظم میں بعض مصرعے نہایت پھسپھسے ہیں اور ان کی بندشیں نہایت سُست ہیں۔ مفہوم بھی الجھا ہوا ہے اور کہیں کہیں "فی بطنِ شاعر" کا مصداق۔ مگر انھیں جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے تاکہ الفاظ میں بھی تغیر نہ ہونے پائے۔ یہی خیالات اگر نظم ہونے سے پہلے میرے دماغ میں موجود ہوتے اور میں انھیں نظم کرتا تو موجودہ نظم کے مقابلہ میں اُس نظم کا حُسن ہزاروں درجہ زیادہ ہوتا۔ اب اس معرّا نظم کو قافیہ کا زیور بھی پہنا دیں اور دیکھیں کہ اس آرائش سے اس کے حسن میں کچھ اضافہ ہوتا ہے یا نہیں۔ نمونے کے لئے صرف دو ہی بندوں کی تبدیلی ہیئت پر اکتفا کی۔

آزاد نظم

سکھا نغمہ محبت کا، مجھے محسوس کرنے دے
جوانی کو
ہے نغمہ جن میں خوابیدہ انھیں تاروں کی حرکت سے
میں لے آؤں گا ہستی کو مجسم شکل کی صورت

پابند نظم

سکھا دے نغمۂ الفت مجھے اے رات کے ساقی
کہ میں بھی کر سکوں محسوس کیفیت جوانی کی
جونہیں وہ تار چھیڑے میں نے، جو نغموں کی ہیں بستی
مجسم ہو کے تیرے سامنے آجائیگی ہستی

انھیں تاروں کو خوابوں سے جگانے
دے مجھے اے رات کے ساقی!
دکھانے دے مجھے جلوہ ستاروں کے
الجھنے کا
اسی منظر کو لے آؤں نگاہیں پھیرنے کا ہوش میں
جو ہے باقی

جو آویزاں ہے اب تک وقت کی دیوی
کے آنچل میں

انھیں سوئے ہوئے تاروں کو خوابوں سے
جگانے دے
مجھے جلوہ ستاروں کے الجھنے کا دکھانے دے
اسی منظر کو واپس کھینچ لاؤں گا میں
اک پل میں
جو آویزاں ہے اب تک وقت کی دیوی
کے آنچل میں

پکڑ کر ہاتھ میں پنچھی کو اس دھرتی کے
جنگل میں
اسی خلوت کے محل میں
ترے دل میں
جگا دوں گا میں اپنی گرم آہوں سے
اسی نغمے کو جو سویا ہے تیرے جسم کے
محبوب تاروں میں

پکڑ کر ہاتھ میں پنچھی کو اس سنسار
کے بن میں
اسی خلوت سرائے معرفت یعنی
ترے من میں
جگا دوں گا میں اپنی گرم آہوں سے
وہی نغمہ
جو تیرے جسم کے محبوب تاروں میں
ہے خوابیدہ

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ پابند نظم ہر طرح کے خیالات کے اظہار کی صلاحیت رکھتی ہے۔ چنانچہ دورِ حاضر کے بہترین نظم گو شعرا کا کلام اس کا قطعی ثبوت ہے۔ ایسی کون سی بات ہے جو ہمارے معاصر شعرا نے پابند نظم کے ذریعہ بیان نہیں کی۔ آزاد نظموں کا اگر جائزہ لیا جائے تو اُن میں کوئی ایسی نئی چیز نہیں ملتی جو اس دور کی پابند نظموں میں موجود نہ ہو۔ یا اُسے پابند نظم میں ادا نہ کیا جا سکتا ہو۔ لاہور کا رسالہ ادبی دنیا اس نئی تحریک کا سب سے بڑا علم بردار ہے۔ چنانچہ اس میں آزاد نظمیں بالالتزام شائع ہوتی رہتی ہیں۔ لہٰذا ادبی دنیا کے گذشتہ چالیس پچاس نمبروں میں جن لوگوں کی آزاد نظمیں شائع ہوئی ہیں ان سب کے کلام کی ایک مختصر فہرست (نظم کا عنوان اور اس کے چند ابتدائی، درمیانی، یا آخری ٹکڑے جن سے مضمون کی نوعیت کا اندازہ ہو سکے) ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔ تاکہ قارئین کو اچھی طرح اندازہ ہو جائے کہ آزاد نظموں میں، جہاں تک مضمون کا تعلق ہے کوئی بھی اچھوتا پن نہیں۔

"ایامِ گذشتہ" ضیا فتح آبادی ایم اے

مجھے بیتے ہوئے ایام پھر کیوں یاد آتے ہیں — محبت کے وہ لمحے، ہاں وہی لمحے — جنھیں زریں سمجھتے ہیں جہاں والے — مگر جن کے تصور سے لرز جاتا ہے دل میرا۔

"نیا کھیل" انجم رومانی

درِ احاطۂ مسجد سنا رہا ہے پرانی کہانیاں مجھ کو — وہیں ہم اپنا نیا کھیل کھیلا کرتے تھے — ہمیں جو ایک نئے دوست نے سکھایا تھا — دو ایک دن کے لئے شہر سے وہ آیا تھا۔

"دو رنگ" ابوالفضل صدیقی

اے تنکاری دوست تو دراصل ہے روحِ روانِ زندگی ـــ آگا گلنے والی بند قیں تری ـــ ہیں ترے منہ میں کبھی حیوان کبھی انساں کی کچی بوٹیاں ...... آہ یہ تیری دورنگی زندگی۔

"دائرے" جگن ناتھ آزاد

دائرے بنتے چلے جاتے ہیں تا حدِ نظر ـــ اجلے اجلے، دھندلے، دھندلے مٹتے مٹتے دائرے۔

"شارعِ امید" احمد ندیم قاسمی

لیجیے ختم ہوئی محفلِ شب ـــ پھول گلدانوں میں کملائے ہوئے ـــ لیکن اے روحِ حزیں ـــ تو نے کیوں ایک پھریری سی لی ـــ دیکھ کر دُور دہ خاموش سڑک کی شمعیں۔

"طلب" محمد راشد فضلی

یہ کیوں جاننا چاہتی ہو، یہ کیوں پوچھتی ہو؟ ـــ بنی کیوں ہو دشمن مری ...... اور اپنی؟ ـــ ہوسناکیاں اُف تمھارے بدن کی ـــ مجھے چاہتا ہے، مجھے مانگتا ہے۔

"چور" شریف کنجاہی

آپ کی بیوی سہیلی ہیں مری ـــ اور انھیں ملنے کو آجاتی ہوں ـــ میں کوئی آپ کی خاطر تو نہیں آتی ہوں ـــ ورنہ گھونگھٹ نہ نکالوں ہرگز ـــ یہ مگر سچ ہے کہ جب آپ کے گھر آتی ہوں ـــ آپ اس وقت اگر گھر پہ نہ ہوں ـــ بیشتر بیٹھی ہی رہتی ہوں میں باتیں کرتی۔

"اثرِ خواب" ش۔م اقبال

میں پھرا کرتا ہوں شاموں کے دھندلکوں میں اُداس اور حزیں ـــ جب

فضاؤں میں بچھے ہوتے ہیں غمگین سائے — انھیں شاموں کے دھندلکوں میں کہیں — منتشر ہیں مرے رومانوں کے آثار حسیں۔

"تھرے رنگ" "اکھری لہر" فضل حسین کیف

اسی اک سوچ میں ہو جائے مجھے دن رات تمام — چشم پرآب لئے — دل بیتاب لئے — عشق کے ساز کی مضراب لئے — میرے غم خانے میں بکھرائے ہوئے دوش پہ بال — آئے گی بھی کہ نہیں۔

"سگرٹ" سلام مچھلی شہری

نقاب نقرئی سے تو — کسی دوشیزہ کی انگشت سحرا فروز کی صورت — ابھی نکلا ہے .... میں تجھ کو جلاتا ہوں — کبھی ایسا بھی ہوتا ہے — کہ بیڑی بھی نہیں ملتی — ہمیشہ کیا مجھے دھیان رکھے گا — مرا ساتھی — مرے اسکول کا ساتھی۔

"رات سے خطاب" محمد ذو النورین

رات میں تجھ پر نثار — تیری خاموشی میں میرے دل کی آوازیں بلند۔

"تمنائیں" سعد احمد اعجاز

کاش میں جب ایک رات — شدتِ غم میں نکل جاتا کہیں بستی سے دور — تو مرے خوابوں کی رنگیں کہیں آتی وہاں — چاندنی کے نور کا باریک سا آنچل لئے۔

"خودکشی" ن۔م۔راشد

میرا عزم آخر یہ ہے کہ میں — کود جاؤں ساتویں منزل سے بھی — آج میں نے پالیا ہے زندگی کو بے نقاب۔

"نامعلوم سرزمیں کا سفر" تابش صدیقی

مسکراتے ہوئے تاروں کے شبستانوں سے کس نے جھانکا یہ مجھے رات کی خاموشی میں — بربط کاکشاں پر کس نے — غم میں ڈوبا ہوا اک نغمۂ الفت گایا — اور غمِ عشق کو بیدار کیا۔

"دو دن کا پیار" نسیم محمود مخمور

یہ دل وحشی مرا — طائر آوارہ تھا اس کو قفس کی کیا خبر — سادگی کا، تیری معصومی کا، عفت کا گناہ — آہ یہ دو دن کا پیار — مجھ سے اب مت پوچھ تو، جب میں نے کیا سمجھا تجھے — اب مگر دو دن کے بعد — توڑ ڈالا ہائے کس کمبخت نے سارا فسوں۔

"ناکام" ظہیر الدین ایم۔ اے

خاموش سی، بے ضرر سی لڑکی معصوم سی بھولی بھالی تو جانتی ہے کہ مجھ میں کتنی طاقت ہے جان کو روندنے کی — تو جانتی ہے کہ تجھ کو مجھ سے الفت نہیں اور نہ میری پروا — پھر چھوڑ دو دل جہاں کو لیکن — کس آس پہ میں رہوں گا زندہ۔

"ملاقات" ساقی

شاہراہِ زندگی پر یونہیں ہم تم تھے ملے — جیسے دو پتے لچکتی شاخ سے ٹوٹ کر گر جائیں سطحِ آب پر — زندگی اب زندگی ...... ہاں ہاں یہ ظالم زندگی — جس کی طوفاں خیزیوں سے ایک موج تند و تیز — لے گئی تم کو بہا کر میری آنکھوں سے کہیں دور۔

دیکھ لیا آپ نے یہ ہیں وہ آزاد نظمیں جن میں زندگی کی مشکلات کا حل پیش کیا گیا ہے۔ اور یہ ہیں وہ اچھوتے اور انوکھے خیالات جو آزاد نظم لکھنے والوں کے بقول پابند نظم کے ذریعے ادا نہیں کئے جا سکتے۔ ہاں یہ ماننا پڑے گا کہ

خیالات میں ندرت وتازگی ہو یا نہ ہو، عنوانات میں جدت ضرور ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بحر اور قافیہ کی پابندیاں شاعر کے لئے مشکلات پیدا کر دیتی ہیں لیکن یہ پابندیاں بے وجہ نہیں لگائی گئی ہیں۔ ان کی بدولت مضامین اور الفاظ کا حسن بدرجہا بڑھ جاتا ہے اور کلام میں زور پیدا ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار کرنا کہ قافیہ کلام میں ترنم اور موسیقی پیدا کر دیتا ہے اپنی کور ذوقی اور نادانی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ قافیہ کی موسیقیت کا اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہو گا کہ گیت، ٹھمری، اور دادرے وغیرہ جو صرف گانے کے لئے لکھے جاتے ہیں اور جن کا ادبی حیثیت سے کوئی پایہ نہیں، ان میں قافیہ لازمی طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ بلکہ ان چیزوں میں وزن پر اتنا زور نہیں دیا جاتا جتنا قافیہ پر دیا جاتا ہے۔ دو تین مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

دادرا:۔ پیا دیکھے بہت دن بیتے۔ جیا رابُھائے، برہا ستائے پیا دیکھے
بہت دن بیتے۔
آ دن کہہ گئے، آجہوں نہ آئے، سونی سیج موہے ڈرائے۔ رام
پیا سے بیگ لائے۔
پیا آؤ۔ درس دکھلاؤ۔ جیرا لبھاؤ، رجھاؤ۔ ہم ہارے موہن
تم جیتے۔ پیا دیکھے بہت دن بیتے۔

ٹھمری:۔ بیّاں نہ پکڑ موری مُرکی کلائی لے بیّاں نہ پکڑ موری مُرکی کلائی لے
کر پکڑت موری چوڑی مسکائی رے ״ ״ ״ ״ ״
ارج برج موری ایک نہ مانی ״ ״ ״ ״ ״
کرشن پیا کی میں ڈیت دہائی لے ״ ״ ״ ״ ״

ملہار:۔ رُوم جھوم بدروا برسے۔

اُن بن جیا را ترسے ۔ ردم جھوم بدروا برسے
جلت پُروائی سوم سنانا نانا نا جھنگروا بولے جھوم جھنانا نانا نا
اونچی اٹریا بچھوا بولے جلت کنگورا کرکے ۔ ردم جھوم ....

قافیہ کی وجہ سے شاعر کو غزل اور قصیدے میں جن مشکلات کا سامنا ہوتا ہے وہ نظم کی دوسری اقسام میں پیش نہیں آتیں ۔ کیونکہ ایک بیت کے لئے صرف دو ہم قافیہ لفظوں کا تلاش کر لینا کچھ ایسی دشوار بات نہیں ہے ۔ اور جو شاعر اتنا بھی نہ کر سکے اُسے شعر کہنے ہی کی کیا ضرورت ہے ۔ وہ دوسرے مفید کاموں میں اپنا وقت خرچ کر سکتا ہے ۔ رہ گیا وزن کا معاملہ تو یہ کچھ ضرور نہیں کہ ہم پرانی بحروں ہی میں نظمیں لکھیں ۔ ہم اپنی ضرورت اور پسند کے مطابق نئی بحریں ایجاد کر سکتے ہیں ۔

بحر کے سلسلے میں چند باتیں خصوصیت کے ساتھ قابل غور ہیں ۔ انھیں نظر انداز کر دینا گویا اپنے ملکی اور قومی خصوصیات اور اپنے قدرتی میلانات کو بہ جبر مٹانے کی کوشش کرنا ہے ۔ عربوں نے جب ایران کو فتح کیا تو اُن کا اثر ایران کے ہر شعبۂ زندگی پر چھا گیا ۔ ایران کا مذہب بدل گیا ۔ اسکی معاشرت میں تغیر ہو گیا ۔ اس کی زبان کچھ سے کچھ ہو گئی .... اس کا رسم الخط تبدیل ہو گیا ۔ اس کی شاعری میں انقلاب آ گیا خلیل ابن احمد بصری پہلا شخص ہے جس نے عربی عروض کے قواعد کو مرتب کیا ۔ اُس نے کل پندرہ (۱۵) بحریں معیّن کی تھیں ۔ اس کے بعد ایک بحر کا اور اضافہ ہوا ۔ اسی عروض کو ایرانیوں نے اختیار کیا لیکن ان سولہ (۱۶) بحروں میں سے چار کو اپنے ذوق اور میلان کے مطابق نہ پا کر ترک کر دیا اور اُن کے بجائے تین بحریں خود ایجاد کیں ۔ اس طرح بحروں کی مجموعی تعداد اُنیس (19) ہو گئی ۔ ہمارا فن عروض وہی ہے جو ایرانیوں

کا ہے لیکن اُنیس[۱۹] بحروں میں سے کل گیارہ ہی بحریں اُردو میں رواج پا سکیں وجہ اس کی ظاہر ہے کہ جو بحریں ہماری طبائع کے مناسب اور موافق تھیں وہ مقبول ہوئیں۔ باقی کو ترک کر دیا گیا۔ لیکن ساتھ ہی ہندی کی کئی بحریں بھی اُردو میں رواج پا گئیں۔ اور یہ ایک بالکل قدرتی بات تھی۔ موجودہ دور میں بحروں کی نئی نئی شکلیں ظہور میں آ رہی ہیں۔ ان میں سے جنھیں ہماری طبیعتیں قبول کر لیتی ہیں وہ مروّج ہو جاتی ہیں۔

اس تمام تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ مشرق اور مغرب کی طبائع اور اُن کے میلانات میں بڑا فرق ہے اور یہ فرق صرف شاعری ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ہے۔ انگریزی حکومت کے اثر سے ہم انگریزی بولنے لگے ہمارا طرزِ معاشرت انگریزی ہو گیا۔ مردوں نے سوٹ پہنا ٹائی لگائی۔ غرض بہمہ جہت انگریز بن گئے لیکن اس کے باوجود ہماری عورتوں کو ساری کے بجائے میموں کا سایہ پہنا کوئی نہ سکھا سکا۔ صرف اس لئے کہ ہماری طبائع نے اس لباس کو کسی طرح قبول نہیں کیا۔ یہی حال شاعری میں بحر اور قافیہ کا ہے یہ شئے ہمارے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے۔ ایک ہزار برس سے زیادہ ہو گئے کہ عرب، ایرانی اور ہندستانی بحر اور قافیہ کی پابندی کے ساتھ شعر کہتے ہیں۔ گاؤں کی ایک جاہل چھوکری بھی جب گنگناتی ہے تو اُس کے گیت میں قافیہ ضرور موجود ہوتا ہے۔ پھر یہ چیزیں صرف اُردو ہی کے لئے مخصوص نہیں ہندوستان کی ہر زبان کی شاعری اور گیتوں میں بحر اور قافیہ موجود ہے یورپ اور امریکہ میں اگر فری ورس کو مقبولیت حاصل ہو گئی تو اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ہندوستان میں بھی آزاد نظم ہر دل عزیز ہو جائے گی۔ تجربہ کے طور پر ٹیگور نے اس میدان میں طبع آزمائی کی تھی مگر

اُن کی سعی مشکور نہ ہوئی اور اُن کی آزاد نظموں کی طرف کسی نے ذرا بھی التفات نہیں کیا۔ اس لئے یہ توقع کرنا کچھ بیجا نہ ہوگا کہ ہماری شاعری کبھی بحر اور قافیہ کو ترک نہ کرسکے گی۔ یہ ہمارا فطری میلان ہے۔ ہمارے یہاں آزاد نظم پابند نظم کے مقابلہ میں ہرگز فروغ نہیں پاسکتی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ آزاد نظم محض ایک بیکار چیز ہے اور اسے ترک کر دینا چاہئے۔ نہیں۔ آزاد نظم اُردو ادب میں ایک مفید اضافہ ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے سے ہمیں بہت سے اچھے اچھے خیالات مل رہے ہیں۔ آزاد نظم کے اجراء سے پہلے یہ صورت تھی کہ شاعر طبع لوگ جو قادر الکلام ناظم نہیں تھے اور اپنے قابل قدر خیالات کو نظم میں ظاہر نہیں کرسکتے تھے وہ ان قیمتی جواہر پاروں کو اپنے ساتھ ہی دنیا سے لے جاتے تھے۔ اب یہ رکاوٹ باقی نہیں رہی۔ مگر آزاد نظم لکھنے والوں کا یہ دعویٰ کہ وہ کچھ ایسی چیزیں پیش کررہے ہیں جو پابند نظم میں کسی طرح ادا نہیں ہوسکتیں محض بے بنیاد ہے۔ اس کے علاوہ ہر شاعر سے یہ توقع کرنا کہ وہ اپنی شاعری میں مسائل حیات کا حل پیش کرسکے گا سراسر زبردستی ہے ع

ہر کسے را بہر کارے ساختند

مسٹر جناح پکے مسلمان ہیں مسلمانوں کے مسلم لیڈر بھی ہیں لیکن اس کے باوجود انھیں دارالعلوم دیوبند کا شیخ الحدیث مقرر نہیں کیا جا سکتا۔

عام انسانوں کی طرح شاعروں کے میلانات بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اقبال اور ٹیگور دونوں ہی ایشیا کے بزرگ ترین شاعر ہیں۔ دونوں ہی کا کلام دنیا کی بہترین شاعری کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے۔ پھر بھی دونوں کا میدان الگ الگ ہے کیونکہ اُن کے فطری میلانات یکساں

نہ سکے۔ اسی طرح کوئی شاعر صرف منظر نگاری کر سکتا ہے، کوئی عظمت رفتہ کا مرثیہ لکھ سکتا ہے۔ کوئی سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے فراقیہ اشعار کہہ سکتا ہے کوئی جنگی ترانے اور قومی رجز تیار کر سکتا ہے۔ کوئی مزدوروں کے شور و فریاد سے سرمایہ داروں کے محلوں میں زلزلہ ڈال سکتا ہے۔ لیکن یہ سب کام کسی ایک شخص کے کرنے کے نہیں ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ ہم ہر شخص کو آزادی کیساتھ اس کے فطری میلان کے مطابق شاعری کرنے دیں۔ کوئی خاص مطالبہ اُس سے نہ کریں۔ صرف اسی صورت میں قدر اوّل کی چیزیں پیدا ہو سکتی ہیں ورنہ آرڈر دے کر نظمیں لکھوائی جائیں گی تو انکی حیثیت طرحی غزلوں سے زیادہ نہ ہوگی۔

نیا شعر و ادب

از پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

رشید صدیقی صاحب اُستاد اُردو، مسلم یونیورسٹی کے مرتبہ ادب و انشا رسے کون واقف نہیں، اُن کے ایک تازہ خطبۂ صدارت (کانفرنس گزٹ سے منقول) کا اقتباس ذیل یقیناً بڑی قدر اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

حضرات! اب میں تھوڑی دیر کے لئے اُن دوستوں سے مخاطب ہونا چاہتا ہوں جو اردو شعر و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ یہ لوگ ہماری زبان ہمارے ادب، اور ہماری روایات کے محافظ ہی نہیں، اس کی پرورش کرنے والے اور پروان چڑھانے والے ہیں۔ آیندہ نسلوں کی ذہنی پرداخت میں ان کا بڑا حصّہ ہوگا۔ یہ کام بہت بڑا اور بڑی ذمہ داری کا ہے۔ اس لئے کہ شعر و ادب ہمارے جذبات کا ذمہ دار ہی نہیں ہوتا اُن کا محرک بھی ہوتا ہے لیکن اُردو شاعری اور اُردو ادب کا جو رنگ ڈھنگ عام طور پر آج نظر آرہا ہے وہ پُرمعنی بھی ہے اور اندیشہ ناک بھی۔ پُرمعنی اس اعتبار سے کہ اس میں زمانہ کا رنگ جھلک رہا ہے اور اندیشہ ناک یوں کہ ؎

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتست

جو لوگ کبھی خیالی دنیا میں تصورات سے کھیلتے یا اُن میں گم رہتے تھے، آج واقعات کی دنیا میں "سیل بے پناہ" سے دوچار ہیں "غم روزگار" نے اب

"غمِ عشق" کی جگہ لے لی ہے۔ اور "غمِ جاناں" اب "آلامِ روزگار" کو آسان بنانے سے قاصر ہے۔ زندگی کے نت نئے مسائل نے نئی واماندگیاں پیدا کردی ہیں جب زندگی کے آشوب سے دوچار ہونے کی ہمت یا صلاحیت باقی نہیں رہتی تو انسان اپنی درماندگی ہی کو حاصلِ حیات سمجھنے لگتا ہے۔ اسی نوعیت کے آشوب نے ایران کی شاعری میں تصوف کا عنصر داخل کردیا تھا۔ اس وقت تک مذہب کا عمل دخل کافی تھا اس لئے مذہب اپنے مقام سے اُترا تو تصوف پر آکر ٹھہرا۔ ہندوستان میں خالص اسلام کا عمل دخل برائے نام ہی تھا، اور جو کچھ تھا وہ بھی ایک طرح کے مخلوط تصوف کے پیرایہ میں۔ اور یہ تصوف عملاً مذہبی پاجیوں کی جائے پناہ یا ایک مقدس معذرت بن کر رہ گیا تھا۔ جنگِ عظیم سے کچھ عرصہ پہلے سے زندگی کی ہر جہت میں مادیت و عقلیت کی بہت کچھ کارفرمائی نظر آنے لگی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ اب جو نئی زندگی کا آشوب آیا تو اس نے تصوف، مادیت، اور عقلیت سب کا شیرازہ بکھیر دیا۔ اور اس کی جگہ فسق و فحاشی نے لے لی، فسق و فحاشی دراصل رذائلِ نفس کی غلبہ زائی ہوتی ہے۔

حضرات! ہمارے دوستوں کو "طعنۂ نایافت" سننے کی تاب نہ رہی تو اپنے کو کھو دینا ہی اپنا کارنامہ قرار دینے لگے۔ بندھنوں سے آزاد ہونا اچھی بات ہے لیکن ہر چیز کو ہر بندھن سے آزاد کرنا آزادی نہیں بداعمالی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج کل کی بیشتر شاعری اور افسانوں میں زندگی کے جن ڈراؤنے یا گھناؤنے پہلوؤں کو مزے لے لے کر اور وجد میں آآکر پیش کیا جارہا ہے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے جن بیباک و شرمناک اصول اور طریقوں کی تبلیغ کی جارہی ہے وہ کسی کے لئے باعثِ فخر نہیں ہے میں اقرار کرتا ہوں کہ ہماری زندگی میں یہ ڈراؤنے اور گھناؤنے واقعات

ملتے ہیں۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ شاعر اور ادیب ان چیزوں سے متاثر بھی ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں اس کا بھی قائل ہوں کہ علم الامراض سے ماہر اور معالج اور شاعر و شاعری یا پیغمبر اور اُس کی کتاب میں فرق مراتب بھی ہے۔ ہمارے شعرا اور ادیب معائب و مصائب کو نہ معقول طور سے پیش کرتے ہیں نہ اُن کی صحیح چارہ سازی کرتے ہیں۔ شدید اور مزمن امراض کا علاج سستی مسکرات سے صرف عطائی ہی کرے گا اور اپنی کوڑھ اور غلاظت کو اُچھالنے والا کوڑھی اور اگھوری کہلائے گا۔ تو کیا اب شاعر، ادیب، اور آرٹسٹ کوڑھی یا اگھوری ہی ہونے پر اکتفا کریں گے اور اسی پر فخر کریں گے یا شاعر و ادیب اور آرٹسٹ کے مقامات کچھ اور بھی ہیں۔ یہاں میں اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اس شاعر اور آرٹسٹ کے سامنے سر خم کرنے کیلئے تیار ہوں جو کوڑھ یا غلاظت کی صحیح اور مکمل تصویر کھینچے۔ میں تو اُس شاعر اور آرٹسٹ سے پناہ مانگتا ہوں جو اپنی نہاد اور اپنے عمل کے اعتبار سے کوڑھی یا غلیظ ہو۔ یا کوڑھ اور غلاظت میں لذت محسوس کرے۔

حضرات! کمیونزم یا اشتراکیت کی تقلید یا تبلیغ اب اس درجہ عام اور مقبول ہے کہ اس کے خلاف کچھ کہنا جہالت، قدامت پرستی اور دولت دوستی کا مرادف سمجھا جاتا ہے۔ بایں ہمہ میں اشتراکیت کا قائل نہیں ہوں قطع نظر اور ان باتوں کے میں نے اس کا جو کچھ مظاہرہ اُردو شعر و ادب میں دیکھا ہے اس سے مجھے زندگی سے زیادہ کمیونزم گھناؤنی معلوم ہونے لگی ہے۔ کمیونزم نے خدا، عورت، اور دولت کی طرف خاص توجہ کی ہے اور ان تینوں کے بارے میں جو کچھ تعلیم ہے اس سے عام طور پر ہم اور آپ کم و بیش واقف ہیں۔ بیشتر اسی کی کارفرمائی ہمارے جدید شعر و ادب میں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ

اگر خدا یا اس کا تصور مانے جانے کے لائق نہیں ہے تو مذاق اڑانے کے لئے
بھی موزوں نہیں ہے۔ اور عورت کو مظلوم و مجبور نہ ہونا چاہئے تو اس کو
شاعر، آرٹسٹ یا مزدور کے شہوانی جذبات کی تسکین کا وسیلہ بھی نہ سمجھنا
چاہئے اور افلاس کا تنہا علاج قتل و غارت گری بھی نہیں ہے۔ یہ بات
میری سمجھ سے باہر ہے کہ خدا کے تصور ہی سے کوئی شخص انحراف کرے۔ اگر
ایسا ہے تو پھر زندگی کی اعلیٰ قدریں کوئی بنیادی حیثیت یا منزلت نہیں
رکھتیں۔ عورت کا مصرف اگر صرف تسکین شہوت ہے جیسا کہ میں جدید ادب
میں دیکھتا ہوں تو میرے خیال میں عورت سے زیادہ لغو تصور نصف سے زیادہ
اشرف المخلوقات کا نہیں ہے۔ دولت اور افلاس دونوں کی فراوانی بری
لیکن قتل و غارت گری کی تبلیغ بھی کوئی مبارک فعل نہیں ہے۔ ان امور کو دیکھتے
ہوئے میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اشتراکیت .... کہیں اور
نہیں تو ہمارے جدید شعر و ادب میں رذائل نفس کو ابھارتی ہے۔ اور اس کا
اثر سب سے زیادہ اُن لوگوں پر پڑ رہا ہے جو انسانی محاسن سے یا تو سرے سے
آشنا ہی نہیں کرائے گئے ہیں یا ان میں کسی نہ کسی سبب سے ان کا فقدان ہے۔
میں اپنے اہلِ قلم دوستوں سے پوچھتا ہوں کہ یہ کہاں کا اور کیسا انقلاب ہے کہ
غریب کے پاس روزی نہ ہو تو آپ کی ہدایت کے مطابق وہ ڈاکہ ڈالے، آگ
لگائے، اور جان دیدے اور آپ کے پاس کھانے کو نہ ہو تو مصاحبت کی
روٹی کھائیے، مفت کی شراب پیجئے، انقلاب کے شعر کہئے، از کار رفتگی کا
ماتم کیجئے، اور عورت پر تان توڑئیے۔

حضرات! دراصل ابھی ہمارے شعر و ادب کو وہ اونچا درجہ نصیب
نہیں ہوا جو مغربی شعر و ادب کو صدیوں پہلے سے حاصل ہے۔ یہاں

ھنے والوں میں مقابلہ و مسابقت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ آج تفریحاً لکھنے لگے، کل یقیناً مشہور ہو گئے اور آج ہی جیل خانے بھیج دیئے گئے تو پھر فوراً عالی نور۔ رات گزارنے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ شاعر السموات یا ادیب الدہر اور خدا جانے اور کیا کیا کہلائے جانے لگے۔ جہاں شہرت اتنی سستی اور سہل الحصول ہو وہاں خون پانی ایک کرنے کی ضرورت ہی کیا یہ ہماری بے توجہی اور کم نصیبی ہے کہ مختلف اصناف شعر و ادب کے اعلیٰ نمونے نہ لکھنے والوں کے سامنے ہیں نہ پڑھنے والوں کے سامنے۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں لکھنے پڑھنے یا عجیب و غریب خطاب دینے یا اختیار کرنے والوں کا مذاق شعر و ادب کیا ہوگا۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ جس نے جس سے بڑھ کر "فسق و فواحش" لکھ دیا وہی ہمارا سب سے محبوب اور مقبول شاعر اور ادیب بن گیا۔ فسق و فواحش یوں کہ یہ موضوع سستے اور سنسنی پیدا کرنے والے ہوتے ہیں اور ادنیٰ استعداد یا معمولی فکر و فرزانگی کے لوگوں کے بس کے ہی نہیں بلکہ ان کے لئے اپنے اندر بڑی کشش رکھتے ہیں۔ یہاں ایک نکتہ اور قابل لحاظ ہے۔ ہماری سرزمین میں "تہلکہ انگیز" حادثات کم پیش آئے اور پیش بھی آئے ہیں تو طویل وقفوں کے بعد۔ وسیع زراعتی ملک ہے۔ لوگ پڑھے لکھے کم، تن بہ تقدیر زیادہ۔ حکومت میں عوام کو بہت کم دخل، اور عوام سے حکومت بے نیاز۔ جو کچھ پیدا کیا اس میں پیداوار کم اور لاد زیادہ حصہ میں آئی۔ عام زندگی کا رنگ و ڈھنگ کچھ اس قسم کا رہا۔

کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے
کہا خیر بہتر ہے منگوائیے

اور اتفاق سے اکّا دکّا ہمارے آپ جیسے نکل آئے تو اُن کا تیور یہ ہے۔ ع

کپڑے کے عوض بدلتے تھے رنگ

یہ رزق شرعی عشق طبعی، جیئے تو استغفر اللہ مرے تو الحمد للہ۔ غرض یہاں .... مختلف ہمسایہ اقوام کو ایک دوسرے سے چوکنا اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے کا مسئلہ کبھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ چنانچہ زندگی و معاشرت کی وہ نفسیاتی گتھیاں اور تقدیر انسانی کی وہ نازک اور آزمائشی گھڑیاں جو یورپ والوں کو ہمیشہ و ہر لحظہ پیش آتی رہتی ہیں اور مردانہ وار اُن سے عہدہ برآ ہوتے رہتے ہیں، ہم ہندوستانیوں کو کبھی پیش نہ آئیں نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا ذہن و دماغ اور ہمارا شعر و ادب نفسیاتی گہرائی اور فنی شعور دونوں سے بے بہرہ رہے۔ جب کبھی ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ بات یا وہ انداز ہم میں یا ہمارے شعر و ادب میں مغرب سے آیا ہے تو اس سے..... اتنا سمجھنا چاہئے کہ یہ باتیں ہم میں مغربی کتابوں نہ اخباروں سے، یا یورپ سے آئے ہوئے لوگوں کے توسل سے پہونچی ہیں۔ ہمارے مصنفین یا شعرا کو کبھی براہِ راست نہیں پیش آئیں۔ یہی سبب ہے کہ یورپ کے شعر و ادب کا جو انداز ہمارے لکھنے والوں کو نصیب ہوتا ہے روح نہیں۔ روح تو اسی وقت نصیب ہوتی ہے جب وہ سارے واقعات و حادثات ہمارے سر سے گذرے ہوں۔ نظر برآں انقلابیت، نازیت یا اشتراکیت وغیرہ کا رنگ ڈھنگ جو ہمارے لکھنے والوں میں بالعموم نظر آتا ہے وہ کلیتہً سطحی اور بے جان ہے! اس رمز کو ہمارے نوجوان دوست نہیں سمجھتے اور جو کچھ دل میں آتا ہے لکھتے چلے جاتے ہیں۔ نہ اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہیں اور نہ شعر و ادب کا مقام سمجھتے ہیں۔ یہ کوئی

مبارک فعل نہیں ہے۔ اس وقت تو وہ اس سے جس طرح چاہیں فائدہ اٹھائیں لیکن وہ آئندہ نسل کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ اخلاف اسلاف سے شاکی ہوں گے۔ اور شعر و ادب، جو قوموں کا ضمیر ہوتا ہے اور نسلوں کا حافظ بھی دوسری ترقی یافتہ اور گراں منزلت ادبیات کے مقابلہ میں فرومایہ نظر آتا ہے۔ اُس وقت تاریخ لکھنے اور تنقید کرنے والا یہ فیصلہ دیگا کہ اس شعر و ادب کو وجود میں لانے والے اس عہد کے وہ لوگ تھے جو اس طرح کے سرمایۂ ذہنی و دماغی کو پسند کرتے تھے اور فخر کرتے تھے، اور یہ فخر کرتے تھے۔ اور یہ فیصلہ کوئی قابل رشک فیصلہ نہ ہوگا۔

حضرات! اگر میں شعر و ادب کے ضمیر میں نہیں اتر سکا ہوں تو اپنے ضمیر میں اُسے جگہ دے سکا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ شعر و ادب کی وادی میں کہاں کہاں دوزخ جنت سے ڈھکی ہوئی ہے اور کہاں بہشت دوزخ کے آغوش میں ہے۔ میں ہی نہیں، آپ بھی جانتے ہوں گے کہ آج کل شعر و ادب ہی نہیں، مذہب و اخلاق کی بھی آڑ پکڑ کر یا اس کے سایہ میں ہمارے نوجوان اور بوڑھے شعرا اور ادیب، کس کس طرح "لذت کام و دہن" میں مصروف و مگن ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ لکھنے کا فن بھی خاص خاص اسرار و رموز رکھتا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ عریاں نگاری اس بنا پر ضروری ہے کہ بغیر اس کے بات ذہن نشیں نہ ہوگی۔ وہ یا تو فن میں ناقص ہیں یا پھر اُن کی ذہنیت ہی مریض و ماؤف ہے۔ عریاں طرازی یا فحش سرائی شاعر و ادیب یا آرٹسٹ کا کمال نہیں کمزوری ہے۔ اگر آپ میری طوالت بیانی سے گھبرا نہ گئے ہوں اور گھبرا بھی گئے ہوں تو کچھ مضائقہ نہیں اگر آپ کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ نہ گیا ہو تو میں اس

سلسلے میں اشارۃً ایک نکتہ اور بیان کر دوں۔ جدید شعر و ادب کے دلدادہ یہ کہتے ہیں کہ جب تک ہندوستانیوں کو اپنی غلاظتوں کا علم یا احساس نہ ہوگا اُس وقت تک ہمارے دل میں غلاظت سے نفرت نہ پیدا ہوگی۔ اور صفائی کی طرف ہمارا ذہن مائل نہ ہوگا۔ اس لئے طرح طرح کی غلاظتوں کو طرح طرح سے پیش کرنا چاہئے اور قوم کے پکے پھوڑے میں اسی طور سے نشتر لگانا چاہئے۔" اوّل تو غلاظت کا پیش کرنا، اور غلاظت کا اچھالنا۔ دو قطعاً مختلف باتیں ہیں دوسرے یہ کہ ماہر فن اور مخلص ڈاکٹر جب کبھی آپریشن کرتا ہے تو سب سے پہلے یہ دیکھتا ہے کہ مریض کی عام جسمانی حالت کیا ہے۔ پھر مریض کو مقررہ مکمل طور پر اس کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ آپریشن تھیٹر میں کامل صفائی ہوتی ہے آلاتِ جراحی دواؤں سے دُھلے منجھے ہوتے ہیں۔ روئی اور پٹیاں ہر طرح کی کثافت اور جراثیم سے پاک صاف ہوتی ہیں۔ سرجن خود دیر تک اپنے ہاتھ اور انگلیوں کی صفائی کرتا ہے۔ اور کاسب پر مستزاد یہ کہ وہ اور اُن کے رفقاء کار اپنے نتھنے اور منہ اور بالوں پر پٹیاں باندھ لیتے ہیں کہ کہیں ان کے منھ جراثیم مریض کے زخموں میں گر کر سرایت نہ کر جائیں۔ اس کے بعد جو ڈاکٹر دوائے بیہوشی سنگھاتا ہے اس کی انگلیاں برابر مریض کی نبض پر رہتی ہیں اور وہ آنکھوں اور تنفس پر نظر رکھتا ہے۔ دوران آپریشن میں اگر بیہوشی سنگھانے والے ڈاکٹر کو یہ معلوم ہو کہ مریض کی حالت دگرگوں ہے تو وہ فوراً آپریشن رکوا دیگا۔

ان تمام امور اور ان کے جزئیات کو مدنظر رکھئے۔ اس کے بعد دیکھئے کہ زیر نظر شعرا و مصنفین مریض قوم پر کس طرح عمل جراحی کرتے ہیں۔ تفصیل بہت طویل ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ حالات کا موازنہ کرکے صحیح نتیجہ پر آسانی سے پہونچ سکتے ہیں۔ اور باتوں کے علاوہ آپ یہی دیکھ لیجئے کہ

ڈاکٹر اس امر کا بھی کیسا خیال رکھتا ہے کہ اُس کی انگلیاں آلودگی سے صاف ہوں اور اس کے بال، ناک اور منہ بھی اس طور پر بند سے رہیں کہ خود اُن کی آلودگیاں مریض کی ہلاکت کا موجب نہ بنیں۔ پیغمبر بھی جب کسی قوم کے سامنے آتا ہے تو ریاضت اور تزکیہ نفس کی اعلیٰ منزلیں طے کر چکا ہوتا ہے تاکہ کہیں خود اُس کی کمزوریاں اس کے مشن میں راہ نہ پا جائیں پیغمبر کے پاس پیغمبری کا فرمان خدا کا دیا ہوا موجود ہوتا ہے ڈاکٹر کے پاس یونیورسٹی یعنی ماہرین فن کے صداقت نامے ہوتے ہیں۔ تب کہیں جاکر یہ اخلاقی یا جسمانی امراض کی اصلاح کا کام شروع کرتے ہیں یا کرنے پاتے ہیں۔ اس کے برخلاف ان شعرا و مصنفین یا کبیشتر لیڈروں کو دیکھئے۔ یہ جو کچھ کہتے ہیں اور جس طرح کہتے ہیں اُس میں ان کی آلودگیاں کس درجہ سرایت کئے ہوتی ہیں۔ ان میں سے شاذ و نادر ہی کوئی اس منصب کا اہل ہوگا جس پر اُس نے اپنے آپ کو فائز کر رکھا ہے!

حضرات! میرے نزدیک عریانی اور فحاشی ایسی چیزیں نہیں ہیں جو ادب کی تکمیل میں لازم آتی ہوں لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیا جائے کہ ان کا عمل دخل بھی ایک حد تک ضروری ہے اور بعض شعرا بعض لکھنے یا پڑھنے والے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس کے بغیر زندگی کی مکمل لذت نہیں محسوس کر سکتے تو پھر میں یہ بھی کہوں گا کہ اس قسم کے لٹریچر کو اس کا مناسب مقام دیا جائے۔ یہ نہ ہونا چاہئے کہ جہاد یا انقلاب کا اعلان مراسی مراستوں کے گالی گانے سے کیا جائے!

اس سلسلہ میں ایک معمولی سی بات میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اور باتوں کے علاوہ عریانی و فحاشی سے بچنے کے لئے یا اس کو اعتدال پر

رکھنے یا اس کو مناسب اور دلچسپ انداز میں پیش کرنے کے لئے ماہرین شعر و ادب نے صدیوں کے مطالعہ و تجربہ کے بعد صنائع و بدائع اختراع مدون کئے، محسنات کلام کی طرح ڈالی اور اس کے بلیغ و دلنشین نمونے پیش کئے فحاشی اور عریاں نویسی نہ کوئی فن ہے اور نہ کمال فن، فن کا مقصد اور اُس کا کمال یہ ہے کہ وہ خود بھی مستحسن ہو اور نتائج کے اعتبار سے بھی مستحسن ہو۔ ایسا فن جو انسان میں ایسا رجحان پیدا کرے جن سے بحیثیت مجموعی اخلاق و انسانیت کا مقصد نہ پورا ہو یا خطرہ میں پڑ جائے، فن یقیناً نہیں کچھ اور ہو تو ہو۔ فن برائے فن میرے نزدیک بداعمالی نہیں تو فعل عبث ضرور ہے۔ اور میرا ذاتی عقیدہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا پہلو ایسا نہیں ہے جو اپنی تکمیل کے لئے کسی ایسے فن کا محتاج ہو جس پر صرف فن برائے فن کا اطلاق ہوتا ہو۔ فن برائے فن میں وہی گمراہی پوشیدہ ہوتی ہے جو تصوف کے اکثر پیرووں میں نظر آتی ہے یعنی عشق ہوتا ہے حضرات ہند کی زد کا، اور رشتہ جوڑ بیٹھے ہیں پیمانِ الست کا!

اگر میرے دوستوں سے کوئی یہ کہے کہ عریاں اور فحش باتیں بھی عریاں اور فحش الفاظ و عبارت ہی میں ادا کی جاسکتی ہیں تو میں اس کا قائل نہیں۔ باکمال لکھنے والا فحش سے فحش باتیں اس طور پر کہہ سکتا ہے کہ حسن و شرافت کا دامن نہ چھوٹنے پائے۔ یہی نہیں بلکہ انشا پردازی کا یہ بھی کمال ہے کہ جو بات بظاہر غیر ثقہ یا معمولی اور سپاٹ نظر آتی ہو اس کو انشا پرداز چند الفاظ اور فقروں کے پیرایہ میں نہایت درجہ دلنشیں بلکہ لازوال بنا دے۔ اس لئے اگر میرے دوستوں کو فحاشی اور عریاں نگاری

سے شغف ہے اور وہ اس عادت کو ترک نہیں کر سکتے تو پھر میں ان کو مشورہ دوں گا کہ وہ لکھنے کی مشق اور سلیقہ پیدا کریں لیکن بطور تنبیہ میں یہ جتا دینا چاہتا ہوں کہ جس شے کا نام سلیقہ ہے وہ صرف مشق سے ہاتھ نہ آئے گا اس کے لئے خلوص از بس ضروری ہے۔ عدم خلوص زندگی اور معاشرت میں ہی خلل انداز نہیں ہوتا۔ انشا پردازی کو بھی خاک میں ملا دیتا ہے!

حضرات! یہ باتیں میں نے سچائی اور صفائی سے عرض کی ہیں اور یہ بیان واحد نہ بھی ہو تو کم سے کم یہ ضرور ہے کہ یہ میرے ذاتی "تاثرات ہیں جو میں نے بغیر کسی "دخل فصل" کے پیش کر دئے لیکن تصویر کا یہ ایک ہی رُخ تھا۔ دوسرا بھی عرض کر دینے کی اجازت ہی نہیں چاہتا بلکہ اس پر اصرار بھی کروں گا۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ نوجوان لکھنے والوں میں جو بیداری پیدا ہوئی ہے وہ امید افزا ہے۔ شعور کا بیدار ہونا مبارک ہوتا ہے۔ ابتدا میں جو ناہمواری اور بے راہ روی پیدا ہوتی ہے وہ آگے چل کر درست ہو جاتی ہے۔ اگر آپ غور کریں تو اس بات کا پتہ آسانی سے چل جائے کہ اب تک ہمارے شعر و ادب میں مخصوص سانچوں میں ڈھلی ہوئی مخصوص ہی چیزیں راہ پاتی رہی ہیں۔ جن سے ہم اکتانے لگے تھے اسلوب بیان اور موضوع دونوں میں اس درجہ یکسانیت اور "باسی پن" آگیا تھا کہ جس سے بعض یہ سمجھنے لگے تھے کہ "یہی لکھنا اور "یوں ہی لکھنا" مقصود بالذات ہے لیکن نالہ کی طرح زندگی بھی "پابند نے نہیں" نئے ادب نے ہم کو بعض بڑی اچھی چیزیں بھی سجائی ہیں جن کو اب ہم نظر انداز نہیں کر سکتے کچھ اور نہیں تو یہ کیا کم ہے کہ ہمارے ادب میں جو ایک کمی نہایت درجہ نمایاں تھی اُس کو یہ پورا کر رہا ہے۔ مثلاً اُردو میں پریم چند سے پہلے

غریبوں کا ادب مفقود تھا۔ حُسن ہو، محبّت ہو، بہادری ہو، عصمت ہو، سچائی ہو، قابلیت ہو، غرض ہنسنا بولنا، رونا دھونا، مرنا جینا، آداب تسلیمات، تو تو میں میں، سب کے سب طبقۂ اولیٰ یا طبقۂ امرا سے متعین ہوتے تھے۔ سب کچھ "تجمل حسین خاں" کے لئے تھا۔ غریبوں یا عوام کو اتنا بھی میسر نہ تھا کہ خانۂ خدا کی نظرِ بد سے محفوظ رہیں۔ پریم چند نے سب سے پہلے اُردو ادب میں غریبوں کو جگہ دی۔ اور وہ بھی اس طور پر کہ ہم کو غریبوں پر ترس ہی نہیں آیا بلکہ اُن کے ایسے فضائل ہم پر روشن ہوئے کہ ہم نے اپنے دل میں اُنکے لئے محبت اور رفاقت کی معزز جگہ نکالی۔ ہمارے شعرا اور ادیب بھی غریبوں کی طرف مائل ہوئے اور انھیں محسوس ہوا کہ شعر و ادب میں حُسن اور جان امیروں ہی سے نہیں ناکسوں سے بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔ پریم چند کے بعد ہی نئے ادب والوں کا دَور آیا۔ انھوں نے غریبوں کو اپنا لیا۔ لیکن یہ اس درجہ شدت اور عجلت کے ساتھ پیش آیا کہ اس کی "جھونک" خود نئے ادب والے بھی نہ سنبھال سکے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جب تک نئے ادب میں کوئی پریم چند یا حالؔی یا دونوں نہ پیدا ہوں گے، نئے ادب میں وہ سنجیدگی، وقار اور وزن نہ آئے گا جس کا وہ یقیناً مستحق ہے اور جس کی اُسے بڑی ضرورت ہے۔

ترقّی پسند ادب کی نفسیاتی تحلیل

از خان بہادر مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر

مجھے حیرت ہے کہ یہ لوگ جو اپنے آپ کو "ترقی پسند" مصنف کہتے ہیں، ادب اور اس کی حقیقت سے کس قدر بیگانہ ہیں!

جب تک ادب کا شمار فنون لطیفہ میں ہے۔ اس سے صناعت کا عنصر جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ شامل ہے تو شاعری کا موضوع کچھ بھی ہو، ہماری بحث شاعری تک محدود رہے گی، اس کا مقصدِ اولیں نشاط دل و دماغ کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ادب کا افادی یا غیر افادی، اخلاقی یا غیر اخلاقی ہونا ضمنی اور اضافی اوصاف ہیں۔ اسی طرح تمدن، سیاست یا کسی اور تحریک سے ادب کو براہ راست کوئی واسطہ نہیں۔ اور نہ ہونا چاہئے۔ یہ سچ ہے کہ موجودات عالم میں کوئی شے اور واقعہ ایسا نہیں۔ جو شاعری کے دائرہ عمل سے خارج ہو، مگر نقطۂ نظر صناعانہ ہو اور پروپگنڈا کا شائبہ بھی نہ ہو۔ ورنہ شاعری یا ادب کا غلط اور ناجائز استعمال ہوا۔ موضوع جو کچھ ہو طرز ادا میں فن کارانہ بانکپن قائم رہے۔ ادب کو جہاں کسی غرض یا مفاد کا آلۂ کار بنایا اُس کی تاثیر اور دلکشی فنا ہوئی، پھر شاعری شاعری نہیں بکواس ہے اور اُس کی مثال ایسی ہے کہ بچے ٹیسو مانگتے، میوہ فروش بانیاں سناتے چوکیدار پہرا دیتے یا اگھوری چمٹا بجاتے ہوں۔

فنونِ لطیفہ میں مصوری، موسیقی اور بت تراشی بھی شامل ہیں، ان سے پروپگنڈا کا کام نہیں لیا جاتا۔ مگر غریب شاعری سے توقع رکھی جاتی ہے

کہ مزدوروں اور کسانوں کی دلّالی کرے!

شاعری کا یہ غلط مصرف بدترین ادبی اور اخلاقی جرم ہے۔ اور ایسے لوگوں کی مخالفت ہر ذی ہوش کا فرض ہے۔

اگر شاعری کا مقصود زندگی کی مستقل قدروں کا دریافت کرنا اور دوسروں تک پہونچانا ہے۔ تو ایسی نام نہاد شاعری کا انجام کیا ہوگا۔ جو ایک خاص غرض کے حصول کے لئے گتھیوں کو سلجھانے اور مسائل کا واقعات کی روشنی میں حل سوچے بغیر ہندوستان میں سودیٹ ذہنیت پھیلانا چاہتی ہے، اگر اسی کے ساتھ ساتھ جذبۂ نفرت و انتقام بھی کارفرما ہے۔ تو ایسی شاعری کی زبوں کا کیا پوچھنا۔

ادب کا مطالعہ ہی وہ معصوم اور دلچسپ مشغلہ ہے جس سے سائنسداں فلسفی، مفکر، بلکہ ہر طبقے اور حیثیت کا شخص دن بھر کی مصروفیت اور تھکن کے بعد اپنی فرصت کے لمحے اس طرح صرف کرسکتا۔ اور ایسے ماحول میں پہنچ سکتا ہے۔ جہاں دنیا کے مکروہات سے تھوڑی دیر کو نجات پاجائے اور وہ سکون و راحت میسّر ہو اس کے دل و دماغ کو جس کی ضرورت تھی۔ اور جس کے نصیب ہونے پر دوبارہ تازہ دم ہو کر اپنے روزانہ مشاغل زندگی میں زیادہ مستعدی، سرگرمی اور خوشدلی سے منہمک ہو" ادب برائے زندگی" یہ نعمت بخشنے سے قطعاً قاصر ہے۔ کیونکہ اپنی بہترین صورت میں بھی اسی کشاکش کا آئینہ ہے جس کا عملاً سامنا ہوتا ہے، ادب میں بھی وہی چرخانا دھنا مسرت کے بجائے طبیعت کو اور زیادہ مضمحل اور اندوہگیں بنا دیتا ہے اور اس طرح ادب کا حقیقی منشا فوت ہو جاتا ہے۔ ایسا ادب اپنی نوعیت کی بنا پر کسی طبقے میں بھی مقبول نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ نفرت انگیز ہونے کے علاوہ

اُن خوبیوں اور لطافتوں سے بھی معرا ہے جن کی وجہ سے موضوع سے قطع نظر خود شاعرانہ صناعت دلکشی بھر دیتی ہے۔

"ادب برائے زندگی" دراصل روسی اشتراکی لٹریچر کا بگڑا ہوا خاکہ ہے ایسی شاعری کیا خاک کامیاب ہو سکتی ہے جس میں "خلاقانہ تکمین" معدوم ہے اور جس میں حقائق کی ترجمانی کے بجائے بدیسی واقعات کو ہندوستان میں منتقل کرکے اُن کی مبالغہ آمیز اور سفیہانہ نقالی کی گئی ہے۔ یہ ایسی شاعری ہے جو کسی خاص مقصد کی تکمیل کو وجود میں آئی نہیں، بلکہ لائی گئی ہے اور کسی طرح دیر پا نہیں ہو سکتی۔

ایک صاحب فرماتے ہیں کہ

> ادب کی دو تعریفیں ممکن ہیں، ایک جس میں مصنف کی داخلی یا موضوعی کیفیت پر زور دیا جاتا ہے۔ اور دوسری جس میں خارجی یا معروضی عنصر کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ادب کا پہلا تصور ہمیں رومانیت کی طرف لے جاتا ہے جس میں مصنف کے جذبات اور محسوسات زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ اور دوسرا تصور حقیقت نگاری کی طرف جس میں اُس "خارجی" چیز کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے جس کی تصویر کھینچنی مقصود ہو، پہلی صورت میں بیان یا طرز ادا پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اور دوسری میں اُس چیز پر جو بیان کی جائے

پہلی حالت میں ادب مقصود بالذات ہو جاتا ہے
اور دوسری حالت میں ایک ذریعہ قرار پاتا ہے
"ادب برائے زندگی" پہلے نظریہ کی حمایت ہے
اور دوسرے نظریہ کو "ادب برائے زندگی" کہہ سکتے ہیں۔

کس قدر گمراہ کن تحریر ہے! دنیا جانتی ہے کہ ادب کے داخلی اور خارجی پہلو سے مراد تخیل کا طریق کار ہے۔ شاعر کبھی اپنے جذبات، محسوسات و وارداتِ قلب کی مصوری کرتا ہے۔ یہ شاعری کا داخلی پہلو ہوا۔ کبھی مناظر قدرت یا کسی واقعہ یا مرئی شے کا نقشہ کھینچتا ہے، اس کو شاعری کا خارجی پہلو کہتے ہیں، کوئی شاعر ایسا نہیں قدیم یا جدید جس کے کلام میں دونوں عناصر کم یا بیش موجود نہ ہوں۔ اگر ہمارا قول صحیح ہے۔ تو "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" میں کوئی حد فاصل نہ رہی۔ اور یہ حضرت خود نہیں جانتے کہ "ادب برائے زندگی" کیا بلا ہے تاہم دوسروں کو سمجھانے کی جسارت کرتے ہیں!

"ادب برائے زندگی" کے ایک دوسرے حامی فرماتے ہیں۔ کہ ادب میں دو خصوصیتیں لازمی طور پر پائی جانی چاہئیں۔ اول یہ کہ اپنے دور کی اجتماعی زندگی سے ایک گہرا اور براہ راست تعلق رکھتا ہو۔ دوسرے یہ کہ اُس کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے ماتحت عمل میں آئے "اجتماعی" زندگی سے اُن لوگوں کی زندگی مراد ہے جن کے درمیان یہ ادیب یا شاعر اپنی زندگی بسر کرنے کے لئے سماجی تعلقات قائم کرنے پر مجبور ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ شاعری چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم ہو کر عجیب و غریب متضاد کیفیتوں کا مجموعہ بن جائے گی۔ دنیا بھر کو جانے دیجئے۔ ایک شہر یا قریہ لے لیجئے۔ سماج کے افراد جس قدر مختلف عقائد، خیالات اور رجحانات

رکھتے ہوں گے۔ بچارا شاعر اس مجبوری کے ماتحت کہ "باہمیں مرداں بباید ساخت" اُن کی تمام بیہودگیاں، توہمات اور مناقشات کی اپنی شاعری میں تفسیر تنقید یا ترجمانی کرنے کی سعی لاحاصل کرے گا، تفرقوں کی خلیج بڑھتی چلی جائیگی اور چونکہ آج کچھ کہے گا۔ اور کل کچھ، اجتماعی زندگی سے گہرا اور براہِ راست تعلق پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ شاعر زندگی کی (مجموعی ہو یا انفرادی)، ترجمانی جبھی کر سکتا ہے کہ بنیادی اُصول دحقائق کی جو ذات پات فرقہ دارانہ کوتاہ نظری وپست خیالی سے بالا ہیں۔ ایسے دلکش انداز اور الفاظ میں ترجمانی یا تنقید کرے۔ کہ لوگوں کے دل اُس طرف خود بخود کھنچیں اور شاعر کے منقولات کو قبول کریں۔ ایسا شاعر ذاتی وقتی یا مقامی تنازعات سے کبھی واسطہ نہیں رکھتا۔

یہی بزرگ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ۔

> ایک مہذب انسان کا فرض ہے کہ وہ ذاتی فائدے کے بجائے جماعتی فائدے کو اپنا مطمح نظر بنائے۔ اس لئے کہ اگر ہم اس سوال پر غور کریں۔ کہ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے تو اس کے سوا کوئی جواب نہ ملے گا۔ کہ انسان کی خدمت ہی انسان کی زندگی کا واحد اور حقیقی مقصد ہے۔ دنیا میں انھیں لوگوں نے کامیاب، مطمئن اور سچی مسرت سے لبریز زندگیاں بسر کی ہیں۔ جنھوں نے اپنے ذاتی فائدوں اور ذاتی خواہشوں کو پس پشت ڈال کر اپنائے

جنس کی خدمت کو اپنا شعار بنایا، دوسروں کے
آرام کو اپنے آرام پر مقدم سمجھا، دوسروں کی
خوشی کو اپنی خوشی اور دوسروں کے غم کو
اپنا غم خیال کیا۔ جن شاعروں اور ادیبوں
نے اپنی زندگی میں عالمگیر مقبولیت حاصل کی
اور مرنے کے بعد بقائے دوام کا تاج پہنا
وہ وہی ایثار پسند اور اخلاص پیشہ اربابِ فکر و نظر
تھے۔ جو سارے جہاں کے درد کو اپنا درد سمجھتے
تھے، انسان کی فلاح و بہبود جن کا نصب العین
تھا۔ جنھوں نے آپ بیتی کا راگ الاپنے کے
بجائے جگ بیتی کے نغمے گائے اور اپنی خودی
کو عالم انسانیت کی زندگی میں تحلیل کر دیا۔

میرا خیال تھا کہ شاعر کی شہرت اور بقا کا دارومدار اُس کے کلام کی خوبی اور حسن قبول پر ہے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ جب تک شاعر ولی نہ ہو اُس کا کلام بجائے خود کسی عزت کا مستحق نہیں۔ کاش فاضل نقاد ایک ہی ایسے فرشتہ صفت محسنِ انسانیت شاعر کا نام لے دیتے۔ جو ابراہیم بن ادہم کی طرح بنی آدم کا خادم بن کر خدا کا برگزیدہ بندہ بن گیا۔ اور اُس کی شاعری کی شہرت اس وجہ سے ہوئی کہ زیور اخلاق سے آراستہ تھا۔ چاہے شاعر کی حیثیت سے قابل عظمت نہ ہو۔ کیا فردوسی ایسا خادم خلق تھا، سعدی تھا، حافظ تھا، خیام تھا، شکسپیر تھا، ملٹن تھا، ڈانٹے تھا، اگر کوئی شاعر یا ادیب ہوا بھی ہو تو سوال پیدا ہوگا۔ کہ شاعری نے اُس کو ایسا انسان بنا دیا یا شاعر ہونے کے علاوہ اُس کی افتادِ طبع

ایسی بھی بعض شاعر سپاہی یا مصلح بھی ہوئے ہیں ۔ اور ایسے بھی ہوئے ہیں کہ شاعر کی حیثیت سے مشہور مگر اطوار کے لحاظ سے مردود ۔ یہ ضرور نہیں ۔ کہ اچھا شاعر کردار کے اعتبار سے بھی اچھا ہو ۔ اس کا یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیئے کہ شاعر ہر قسم کی اخلاقی خوبیوں سے معرا ہوتا ہے بلکہ یہ کہ شاعر کی شہرت کا مدار اُس کے کلام پر ہوتا ہے ۔ نہ کہ اُس کے افعال و کردار پر علاوہ بریں اگر شاعر یا ادیب کی یہی تعریف ہے تو مصلح قوم، محب وطن اور خادم خلق کی کیا تعریف ہوئی ؟

اگر مضمون نگار کی تحریر کے آخری حصہ کو لیا جائے ۔ اور تمام عبارت آرائی کا یہ لب لباب سمجھا جائے ۔ کہ شاعری یا ادب میں شاعر یا ادیب اپنے انفرادی تاثرات کو پس پردہ رکھے ۔ اور خارجی واقعات یا مسائل پر اپنی شاعری یا ادب کا زور صرف کرے ۔ تو عام ادب کی بابت جو چاہے کہے شاعری کا تو خون ہو گیا ۔ کیونکہ واقعات و مسائل عام اور پیشِ نظر ہیں ۔ جب تک شاعر کی انفرادیت اُن کی تنقید یا ترجمانی اپنے والہانہ انداز میں نہ کرے گی تو شاعری کہاں سے ہوئی ۔

ان صاحب نے ادب کا مقصد بھی بالکل انوکھا قرار دیا ہے ۔ تمہید میں فرماتے ہیں ۔ کہ

> اس سوال کا صحیح جواب دینے کے لئے ہم کو غور کرنا ہو گا ۔ کہ وہ کون سی چیز ہے جو ادیب کی تخلیق ادب پر مجبور کرتی ہے ۔ اور وہ کون سا اندرونی جذبہ ہے ۔ جو شاعر سے شعر کہلواتا اور فسانہ نگار سے کہانی لکھواتا ہے ۔ ہر شخص مخصوص خیالات و جذبات کا مالک ہوتا ہے ۔ اس کے

> ساتھ ساتھ وہ یہ بھی سمجھتا ہے (اور یہ عین فطرتِ
> انسانی ہے) کہ میرے خیالات وجذبات ایک خاص
> اہمیت رکھتے ہیں، پھر قدرتی طور پر یہ خواہش
> اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ کہ میں ان خیالات
> وجذبات کا اظہار کروں۔ اور اُن کو دوسروں
> تک پہنچاؤں .... ادیب اس لئے
> شعر کہتا یا افسانہ لکھتا ہے۔ کہ وہ اپنے تاثرات کو
> ایک مستقل شکل دے، اپنے خیالات وتجربات کو
> دوسروں تک پہنچائے۔ اور اپنے جذبات و
> احساسات میں وسیع انسانیت کو بھی شریک
> کرے، وہ چاہتا ہے۔ کہ جو کچھ میں نے سمجھا اور
> محسوس کیا ہے۔ دوسرے بھی سمجھیں اور محسوس کریں
> دوسرے بھی حزن وملال، نشاط ومسرت اور
> تفکر وتصور کا وہی لطف حاصل کریں جو خود میں نے
> حاصل کیا ہے۔

اس تحریر کا استدلال ہی غلط ہے۔ وہ شاعر یا ادیب جو فطانت یا (Genius) کے مالک ہیں، شاعری یا ادب کے شاہکار اُس عمر میں پیش کر دیتے ہیں جب سن شعور کی ابتدائی منزلوں میں ہوتے ہیں اور تجربات کی پختگی سے کوسوں دور۔ یہ ادعا بھی قطعاً غلط ہے۔ کہ پہلے انھیں اپنے خیالات وجذبات کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان خیالات وجذبات کو شعر میں منتقل کرتے ہیں (صرف شاعری سے بحث ہے) آدمی شعر اس لئے کہتا ہے کہ اُس کی

فطرت شعر کہنے کی محرک ہوتی ہے۔ جب تخیئل شعر کا جامہ پہن لیتی ہے۔ اس کے بعد شاعر دوسروں کو اپنے اس انفعالی تاثر میں شامل کرنا چاہتا ہے جو خود اس پر طاری ہوا تھا۔ اور جس نے شعر کی شکل اختیار کی۔ ورنہ خیالات و جذبات ہر شخص میں موجود ہوتے ہیں۔ اور اس گمان میں اہمیت بھی رکھتے ہیں، پھر وہ سب شعر یا افسانہ کیوں نہیں بن جاتے؟ نیز اس کی کیا وجہ کہ خیالات و جذبات شعر اور افسانے کے علاوہ کہیں خطابت، کہیں مذہبیات اور کہیں عمل یا سازش کی صورت اختیار کرتے ہیں؟ آخر میں یہ نتیجہ نکالا گیا ہے۔ کہ ادب کا مقصد سماجی زندگی کو متاثر کرنا ہوا۔ شاعری کا مقصد جیسا پہلے بیان ہو چکا۔ اس کے سوا کچھ نہیں، کہ حیات و کائنات کی تفسیر و تنقید کرے۔ اور ایسی زبان میں اور اس اسلوب سے کہ یہ تفسیر یا تنقید اپنے حسن و صداقت سے دل و دماغ کے لئے تسکین یا راحت کا موجب ہو۔ اسی سے ہم کہتے ہیں۔ کہ ادب کا مقصود بالذات دماغی اور روحانی مسرت یا تسکین مہیا کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ اور "ادب برائے زندگی" جو اس مقصد سے ہٹ کر شاعری کو اس کی بلندیوں اور لطافتوں سے محروم کر کے کثافت اور گندگی میں آلودہ کرنا چاہتا ہے۔ نہ تو حیات کی تفسیر ہے نہ ترجمانی۔

اسی کے ساتھ پھر اس امر کے اعادہ کی ضرورت ہے۔ کہ شاعری کے دائرہ عمل سے کوئی واقعہ خارج نہیں۔ شاعر اگر دراصل شاعر ہے تو اس کا موضوع سخن جو کچھ بھی ہو۔ زندگی کی تنقید یا ترجمانی ضرور ہو گی۔ کیونکہ موجودات میں کوئی شے ایسی نہیں۔ جو زندگی سے وابستہ نہ ہو اور یہ تنقید ایسے الفاظ میں اور اس انداز سے ہو گی۔ کہ اس میں شاعرانہ حسن اور شاعرانہ صداقت جھلکیں گے اور یہی وصف شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور شاعری تو اظہار جذبات و خیالات کے دوسرے طریقوں سے ممیز اور ممتاز کرتا ہے۔

مگر جو لوگ "جھنڈا اونچا رہے ہمارا" یا "جان بیٹا خلافت پہ دیدو" یا حیا سوز فحاشی اور خواہشات جنسی میں ہیجان پیدا کرنے والی باتوں کو شاعری سمجھتے ہوں۔ اُن کو سمجھانے کی کوشش ہی پاگل پن ہے۔ خیر ع

تھا جنونِ عشق کا یہ بھی تقاضا، ہو گیا

ادب برائے زندگی کے علمبردار۔ ادب برائے ادب کا یہ مفہوم متعین کرتے ہیں۔ کہ اس کا مقصد واحد سامان تفریح مہیا کرنا ہے۔ اگر تفریح سے مراد ادب کی دل آویزی ہے، وہ رنگینیاں ہیں جن میں ہم گم ہو جاتے ہیں۔ تو بے شک ایسا ادب سامانِ تفریح ہے۔ اور ہمیں شرمندہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ کہ ایسا کیوں ہے، مگر حقیقی ادب کی دستگاہ یہیں ختم نہیں ہو جاتی، اچھا ادب صرف حیات کا ترجمان ہوتا ہے۔ بلکہ دائرۂ حیات کو وسیع کرتے کرتے، پھول پتی، ذرہ قطرہ اور دیگر بظاہر "بے جان" اشیاء میں بھی حیات کا مشاہدہ کرتا ہوا انسان کو نامحدودیت سے ہم کنار کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ خود موت بھی زندگی کی ایک شکل بن جاتی ہے ؎

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لیکر (میر)

ادب برائے ادب نے انسانی کردار کے اُن خصوصیات کو جن کا مظاہرہ جہد حیات میں ہوتا ہے۔ کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ اور محض خیالی اور مصنوعی دنیا نہیں بسائی۔ نیکی و نکوکاری، راستی، تواضع، خلق، حیا، نیز دیگر اخلاق حمیدہ کی تعریف کر کے اُن کی طرف رغبت دلائی، بدی، جھوٹ، ریاکاری دغا، فریب، ظلم۔ دل آزاری وغیرہ کی مذمت کی۔ مگر جو کچھ کہا۔ صناعت کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ (گفتگو اچھے کلام سے ہے ورنہ رطب و یابس ہر جگہ ہے)

لہذا یہ کہنا کہ ہمارے ادب میں رومانیت اور قنوطیت کے سوا کچھ نہیں۔ ایک بے بنیاد اتہام ہے۔ تخیّل کے علاوہ طرز ادا اور بیان کی خوبی منجملہ اُن زیوروں کے ہیں جن سے عروسِ سخن سنواری جاتی ہے، اُن کو ادب کا مقصود بالذات کہنا غلط ہے، البتہ یہ مدعیان ادب برائے زندگی ادھوری محاکات اور مبہم معانی کا ایک کاواک ڈھانچہ بنا کے اُس کو زرق برق لباس میں لپیٹ کر "بسم اللہ اگر تاب نظر ہست کسے را" کی دعوت دیتے ہیں۔ مگر یہ ناظورۂ ہزار شیوہ دراصل عفونت میں بسا ہوا اور غلاظت میں لتھڑا ہوا جھلنگا ثابت ہوتی ہے جس کی کراہت لیپ پوت نے دوبالا کر دی۔

ادب برائے زندگی کے مدعیوں کا بیان ہے کہ اُن کے مخالفین زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں سے بھاگ کر ایک فرضی اور مصنوعی دنیا میں پناہ لیتے ہیں، الفاظ میں موسیقیت اور خیالات میں رومانیت کی تلاش میں رہتے ہیں درانحالیکہ "ادب برائے زندگی" کا وجود ہی کالعدم ہو جاتا ہے۔ اگر زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں نے انھیں شاعری پر نہیں اُبھارا۔ یہ احساسِ بیچارگی و محرومی ہی ہے۔ جو قوتِ عمل نہ ہونے کے باعث نثر میں کوسنے اور گالیاں اور نظم میں "ماری جو رہیا" بن گیا، لگے ہاتھوں پیٹ پالنے کا دھندا بھی نکل آیا دراصل وہ الزام جو دوسروں کے سر تھوپا جاتا ہے انھیں پر عائد ہوتا ہے یہی تلخی اور ناکامی ہے جس نے ان کی شاعری کو مسلخ کا نمونہ بنا دیا ہے، اسمیں سوائے دانت پیسنے چیخنے چلانے، بوٹیاں نوچنے، خون بہانے اور ڈکارنے کے کچھ نہیں۔ جوش اور غالباً احسان دانش کو نکال دو تو کسی کی شاعری میں توپ و تفنگ، لاشوں کے ڈھیر اور خون کی ندیوں کے باوجود مردانگی اور دلیری کی ڈپٹ بھی نہیں، بڑبڑانا، رونا پیٹنا خواب میں بڑانا ہے سمندر کا

جز رو مد اور اُس کا طوفانی اضطراب مفقود رہے۔

شاعری کا موضوع کچھ بھی ہو۔ جب تک اُس کی امتیازی شان موجود نہ ہوگی تاثیر اور کیف سے خالی رہے گی۔ راستی حسن اور شدتِ احساس اس کے ابعادِ ثلاثہ ہیں، اختراع و انتخاب و ترتیب اس کے آلۂ کار اور موسیقی و مصوری و تنوع اس کے رفیق ہیں۔ راستی سے یہ مراد نہیں کہ درخت کو درخت کہہ دیا۔ بلکہ جو نقش اُبھرے وہ کامل اور بے عیب ہو۔ حسن سے یہ مدعا نہیں ہے کہ کسی "مہ جبیں" کو دیکھ لیا اور ریجھ گئے۔ بلکہ وہ توازن و تناسب خیال و معنی ہے جس سے ایسا روحانی اہتزاز حاصل ہوتا ہے جو انسان کو "پوتر" بنا دے۔

یہ لوگ مدعی تو ہیں ادب برائے زندگی کے مگر ادب اور زندگی دونوں کے دائرے سے ہر شے کو سوائے چند "مفید" عنوانات کے خارج کر دیتے ہیں ان کی شاعری انسان کو حقیقت کا راز دار اور فطرت کا ترجمان بنانے کے بجائے انقلاب کے سامنے ناچتے تھرکنے اور نجاست میں لوٹنے کی دعوت دیتی ہے شاعری کوئی بھی ہو عشقیہ یا غیر عشقیہ، جسدِ بے روح ہے، اگر حقیقت سے دور، جوش و خروش سے خالی اور تصنع سے پُر ہے یہ بھی یاد رہے کہ ہر شخص شاعر نہیں ہوتا، نہ معلوم کتنے تک بند ہیں جنھوں نے یہ خطاب اپنے آپ کو دے رکھا ہے۔ ورنہ ممکن نہیں۔ کہ سچا شاعر منظر کشی یا جذبات نگاری کرے اور سننے والا متاثر نہ ہو۔ مگر یہ "ادب برائے زندگی" کے مؤید جنھیں ہم دستی "ادب جدید" سے زیادہ غالباً میتھو آرنلڈ کے اس مقولے نے کہ "شاعری تنقیدِ حیات ہے" گمراہ کر دیا ہے۔ صرف اسی شاعری کے گرویدہ ہیں جو اشتراکیت و انقلاب کی تلقین کرے، چاہے شاعرانہ خوبیوں سے خالی ہو ضرورت ہے کہ میتھو آرنلڈ

کا نظریہ واضح کر دیا جائے۔ تاکہ لوگ غلط بیانیوں کا شکار نہ ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ ،، شاعری کا مستقبل نہایت بالشان ہے کیونکہ شاعری میں، بشرطیکہ اپنے اعلیٰ مقصد کے شایان ہو، بنی نوع انسان کو قابل رہنما ملے گا۔ کوئی مذہب ایسا نہیں جسکی بنیادیں متزلزل نہ ہوں۔ کوئی عقیدہ ایسا نہیں۔ جس پر شبہ نہ کیا گیا ہو، کوئی روایت ایسی نہیں۔ جو معرض خطر میں نہ ہو۔ اولاً مذہب واقعہ کی شکل میں پیش کیا گیا۔ مفروضہ واقعہ کی شکل میں، اُس کے بعد واقعہ پر جذبہ کا اضافہ کیا گیا، انجام جو ہونا تھا ہوا یعنی واقعہ نے مذہب کا ساتھ دینا چھوڑ دیا اب شاعری کو لیجیے، اس میں تخیل سب کچھ ہے، باقی اوہام کی دنیا ہے بیشک الہیانہ اوہام کی دنیا۔ مذہب کے علی الرغم شاعری تخیل سے جذبے کو منسلک کرتی ہے لہٰذا خیال واقعہ بنجاتا ہے۔ غور کیجئے تو معلوم ہو۔ کہ مذہب کا راسخ ترین جزو اُس کی نامحسوس شعریت ہے!

ہمارا فرض ہے۔ کہ شاعری کو زیادہ وقعت کی نگاہ سے دیکھیں۔ اور زیادہ بلند رتبہ دیں، اب تک ہمارا رویہ اس کے خلاف رہا ہے، ہمیں چاہیئے کہ شاعری کو قبول کردہ مقاصد سے رفیع تر مقاصد میں صرف کریں۔ اسطرح آدمی کا یہ خیال روز بروز قوی ہوتا جائے گا۔ کہ زندگی کی ترجمانی کیلئے شاعری کی طرف رجوع ناگزیر ہے۔ اور شاعری ہی سے تسکین اور تقویت حاصل کرنا ہوگی، شاعری کے بغیر سائنس نامکمل نظر آئے گا اور ایک بڑا حصہ ہمارے علم کا جس کو مذہب یا فلسفہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اُس کی جگہ شاعری لے لیگی۔ جو دراصل تمام علوم کا نچوڑ ہے بلکہ روح رواں ہے۔

لیکن شاعری کا مقصد جب اتنا بلند رکھا جائے گا۔ تو لازم ہے۔ کہ اُس کا پایہ بھی اتنا ہی بلند ہو۔ تاکہ دونوں کا توازن منزل تک رسائی کا ضامن ہو۔

ہمیں عادت ڈالنا چاہیئے۔ کہ شاعری کا اعلیٰ معیار قائم کریں اور سختی سے جانچیں۔
نپولین کے سامنے کسی شخص کی بابت کہا گیا کہ "وہ خود فریب" ہے۔ نپولین نے کہا کہ سچ ہے۔ مگر کیا کوئی ایسی جگہ ہے۔ جو خود فریبی سے ناآشنا ہو۔ سینٹ بیوؔ کہتا ہے کہ سیاست اور حکمرانی کی مملکت میں نپولین کا قول درست ہے مگر جہاں تک دنیائے تخیّل وصناعت کا دخل ہے۔ خود فریبی ٹکسال باہر ہے اور انسانیت کا یہ قابل ادب جزو دغل فسل سے ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ خود فریبی کی سعی ہوتی ہے۔ کہ عمدہ اور حقیر کا امتیاز مٹادے یا مبہم بنادے، کیا قوی ہے اور کیا ضعیف یا نیم قوی جو ایسے امتیازات کا مٹانا یا مبہم بنانا شاعری میں سخت ممنوع ہے۔ کیونکہ جب تک شاعری کے مقاصد بلند ہیں۔ ایسے امتیازات اہم اور ضروری ہیں۔ شاعری بحیثیت تنقید کے اُن شرائط کے تابع ہے جو اس قسم کی تنقید کے لئے شاعرانہ صداقت اور شاعرانہ حُسن کے قوانین نے وضع کئے ہیں۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ وہ امداد اور تسکین بخشے گی جس کی بہم رسانی میں دوسری قوتیں عاجز ہوں گی۔ اور یہ تسکین وطمانیت اتنی ہی قوی ہوگی جتنی شاعری میں تنقید حیات کی صلاحیت قوی ہوگی، نیز تنقید حیات اتنی ہی موثر ہوگی جتنی شاعری حقیر ہونے کے عوض بلند پایہ ہوگی۔ کمزور یا نیم توانا ہونے کے بجائے توانا ہوگی، کذب یا نیم راستی کے بجائے راستی پر مبنی ہوگی۔ ہمیں بہترین شاعری کی ضرورت ہے جس میں ہمارے کردار کی تعمیر، ہمیں برقرار رکھنے اور خوش کرنے کی استعداد ہو۔"

آپ نے ملاحظہ کیا۔ کہ تنقید حیات قوانین حُسن وصداقت کے ماتحت ہونا چاہیئے۔ مگر یہ گم کردہ راہ "ترقی پسند" ادیب شاعری کو زندگی کی گھناونی خواہشوں اور ہوس کاریوں میں آلودہ کرنا اور سیاسی پروپیگنڈا کا آلہ

بنانا چاہتے ہیں!

میتھو آرنلڈ نے بہترین شاعری کی جو معیاری مثالیں پیش کی ہیں اور زور دیا ہے۔ کہ شاعری کو بالعموم ان سے پرکھا جا سکتا ہے۔ اور جن کو سرچشمہ مسرت قرار دیا ہے یہ ہیں۔

۱۔ مدت ہوئی۔ کہ وہ دھرتی ماتا کے نرم کناروں میں مصروف راحت ہیں، اپنے ہی پیارے وطن اور اپنے اجداد کے وطن لیکیڈیمن میں (ہیلن اپنے بھائیوں کا ذکر کرتی ہے۔ ہومر)

۲۔ اے نامراد گھوڑو تمھیں ایک فانی بادشاہ پیلوس کے سپرد کیوں کیا؟ لیکن تمھیں بڑھاپا چھو نہیں سکتا اور تم غیر فانی ہو، کیا یہ منشا تھا کہ انسان جو مصیبت سہنے کو پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے شریک غم ہو؟ (زیوس بادشاہ پیلوس کے گھوڑوں کو مخاطب کرتا ہے۔ ہومر)

۳۔ نا، اے بوڑھے شخص ہم نے سنا ہے۔ کہ ایک زمانہ ایسا تھا جب تو بھی شادکام تھا۔ (اکیلیز پرائم سے کہتا ہے جس وقت، وہ اکیلیز کے سامنے گڑگڑاتا ہے۔ ہومر)

۴۔ میں نہیں رویا اور اندر ہی اندر پتھر کا ہو گیا ..... وہ روئے (ڈانٹے)

۵۔ اپنی رحمت سے خدا نے مجھ کو ایسا ملکہ دیا ہے۔ کہ مجھ پر مصیبت کا اثر نہیں ہوتا اور اس آگ (دوزخ) کے شعلے مجھے گزند نہیں پہنچا سکتے۔ (ڈانٹے)

۶۔ خدا کی مرضی میں ہمارا امن ہے۔ (ڈانٹے)

۷۔ کیا تو اس بلند اور گھمنی پیدا کرنے والے بادبان پر جہاز راں لڑکے کی آنکھوں پر مہر لگا دے گی۔ اور اس کے دماغ کو وحشی اور جابر موجوں کے گھوارے میں لوریاں دے گی؟ (ہنری چہارم نیند کی خوشامد کر رہا ہے (شیکسپیر)

۸۔ اگر کبھی تیرے دل میں میری جگہ تھی۔ تو تھوڑی دیر کو آرام کی معیت چھوڑ دے۔ اور اس بے رحم دنیا میں اوپر کی سانسیں لے لے کر میری کہانی سُنا۔
(ہیملٹ۔ شیکسپیئر)

۹۔ اس تاریکی میں بھی معلم الملکوت (شیطان) اُن سب سے بلند اور تابناک تھا لیکن اُس کے چہرے پر بجلیوں نے گہرے نشان نالیوں (جھریوں) کی شکل میں چھوڑے تھے اور اندوہ اُس کے رخسار پر متمکن تھا (ملٹن)

۱۰۔ ہمت جو فرمانبرداری یا مغلوب ہونے کو ٹھکرا دے اور باقی جو کچھ ہے اُس پر فتح نہ حاصل کرے۔ (ملٹن)

۱۱۔ وہ نقصان جس نے کیسر پز کو دنیا بھر کی خاک چھاننے کی زحمت گوارا کرنے پر مجبور کیا۔

اس کے بعد میتھو آرنلڈ ارسطو کا قول نقل کرتا ہے۔ کہ شاعری میں اعلیٰ درجہ کی صداقت اور متانت ہونا چاہیئے۔

ان مثالوں اور اقوال کی روشنی میں "ترقی پسند" ادیبوں کی نظمیں پڑھی جائیں۔ تو ان باتوں کا شائبہ بھی نہ ملے گا۔ ان میں انقلاب اور خونریزی کی تعلیم اور ترغیب کے سوا کچھ نہیں، وہ بھی بھونڈے الفاظ میں، اور یہ باتیں ایسی ہیں جن کو شاعری کے بلند اور مقدس مقاصد سے دور کا بھی لگاؤ نہیں اُن میں اُس اعلیٰ صداقت کا نام نہیں جو سطحی نگاہوں سے مخفی ہو اور جس کا اکتشاف شاعری کا فرض اولیں ہے۔ متانت کا ذکر ہی بیکار ہے۔ اُس کی ہوا بھی نہیں لگی۔ تاہم یہ لوگ میتھو آرنلڈ کے قول کو اپنا دستور العمل بنانے کے مدعی ہیں اور کتابیں کی کتابیں اور مضمون پر مضمون اپنی بیباک گمراہی کی تائید میں لکھ مارے ہیں! تان اس پر ٹوٹتی ہے۔ کہ ہماری شاعری حیات کی

سچی تنقید اور ترجمانی ہے جس نے شاعری کو خیالی پلاؤ پکانے کے بجائے حقائق حیات سے قریب تر کر دیا ہے۔ اگر حیات کا مفہوم میتھو آرنلڈ کے الفاظ میں حقیقی حسن و صداقت کو بے نقاب کرنا ہے۔ تو ان لوگوں نے "اس شاہد معنی" کا ایک جلوہ بھی آشکار نہیں کیا۔ اگر شاعری کا فرض وہ عظیم الشان اصول منضبط کرنا ہے جو انسان کو ایسا سکون و اطمینان و انبساط بخشیں جس کی تکمیل کو مذہب اور سائنس ناکافی ہیں۔ جو مذہب کی آنکھوں کا نور اور سائنس کے رخسار کا غازہ ہیں تو اس سلسلے میں "نیا ادب" اور اس کی شاعری کا نام لینا بھی ادب اور شاعری کی توہین ہے۔

ایک جگہ میتھو آرنلڈ نے اصلی اور مصنوعی شاعری کا فرق بیان کیا ہے وہ کہتا ہے۔ کہ ایک کی نشو و نما ذہن اور دماغ میں رہتی ہے۔ اور دوسری روح کی گہرائیوں میں تربیت پاتی ہے۔ مصنوعی شاعری میں فکر کا کوئی مستقر نہیں ہوتا اور شعر کے الفاظ محض چند نقوش پیش کر دیتے ہیں۔ جو نثر کی عام زبان بھی کرتی ہے۔ عریانی تخییل کے پردہ پوش چند خوش آیند فقرے ہوتے ہیں جن میں کچھ لمحوں کے لئے آدمی ایک قسم کی دلکشی محسوس کرتا ہے۔ لیکن ایسی شاعری ہمیں واقعات کی سطح سے بہت نیچے لئے جاتی ہے۔ اس سے ہمارا وہ جذبہ نہیں ابھرتا کہ اشیا اپنے حقیقی حسن میں جلوہ گر ہوں۔ اصلی شاعری کا ارتقا ایسا ہے۔ گو یا کوئی شئے شاعر کی روح میں ڈوب کر ہیجان برپا کرتی ہے۔ اور آخر کار سیراب و سرشار ہو کر اپنی فطری اور درخور قبول رعنائیوں کے ساتھ منصۂ شہود پر آتی ہے۔ یہ ارتقا مصنوعی صنعت گری سے زیادہ روشن اور زیادہ تسکین دہ ہوتا ہے، اسی طرح اس کی زبان بھی سادہ و سلیس ہوتی ہے لیکن یہ سعادت صرف اُن لوگوں کا حصّہ ہے۔ جو زندگی کے سرچشمے سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں اور سطحی موجوں سے نہیں کھیلتے۔

اس اصول کی روشنی میں بھی ترقی پسند ادب اور اس کی شاعری پرچھائیں کی طرح غائب ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کے تخیّل کا افلاس اپنا آپ سوگوار ہے۔ ان کی شاعری "مزدور" اور "انقلاب" کے بھنور میں پڑکر ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ اور بس!! اس کے ماسوا ان کی شاعری میں نہ تو جدّت ہے نہ ترقی کے آثار۔

ایک دوسری جگہ میتھو آرنلڈ کہتا ہے۔

شرافت پر مبنی گہرے خیالات کو زندگی سے مطابق کرنا شاعرانہ عظمت کا ضروری جز و ہے۔ بڑے شاعر کی برتری اسی میں ہے۔ کہ اُن شرائط کے ماتحت جو شاعرانہ حسن اور شاعرانہ صداقت کے قوانین اُس پر عائد کرتے ہیں۔ اپنی شاعری کو زندگی سے ہمنوا کر دے۔ موضوع شاعری خواہ انسان ہو خواہ فطرت، خواہ حیات انسانی، شاعر اپنے وضع کردہ خیالات سے اُن کی ترجمانی کرے۔ ان خیالات میں شرافت و متانت ہونا لازمی ہے۔

ہمیں یہ امر کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے۔ کہ شاعری فی نفسہٖ تنقید حیات ہے۔ اور ایک شاعر کی عظمت کا راز اس میں ہے کہ وہ قوت اور حسن کے ساتھ حیات پر اپنے خیالات کی روشنی ڈالتا ہے۔ اور اس سوال کو حل کرنا چاہتا ہے۔ کہ ہمیں کس طرح جینا چاہئے۔ ہم اخلاقیات کا مفہوم اکثر غلط سمجھتے اور اُس کا دائرہ محدود کر دیتے ہیں۔ اور اخلاقیات کو کسی نظام خیال یا عقیدہ سے جن کا عہد حکمرانی گزر چکا۔ گر جو چند پیشہ ور نقالوں کی زبان پر چڑھ گئے ہیں۔ وابستہ کر دیتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے۔ کہ ہم اُن کو سنتے سنتے اکتا جاتے ہیں بعض مرتبہ ہمیں ایسی شاعری سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے جس میں اخلاقیات سے کھُلی بغاوت ہے۔ یا ایسی شاعری کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ جو اخلاقیات سے بے پرواہ ہے۔ اور جس کا موضوع گو غیر متعین ہے۔ مگر طرز ادا میں ندرت پیدا کی گئی ہے

دونوں صورتوں میں ہم اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ اس کا علاج یہی ہے کہ اُس عظیم و نامحدود معنی رکھنے والے لفظ "حیات" پر برابر غور کرتے رہیں یہانتک کہ اُس کے مفہوم پر کامل عبور حاصل ہو جائے۔ جو شاعری اخلاقیات سے بغاوت کرتی ہے۔ وہ زندگی سے بغاوت کرتی ہے۔ جو شاعری اخلاقیات کو نظر انداز کردیتی ہے۔ وہ حیات کو نظر انداز کردیتی ہے۔

اپکٹس نے کہا عمدہ شاعری ان چیزوں کی پیش کی ہے جن کا تعلق محض حیات سے ہے۔ یا جن میں لفظی یا ظاہری خوش اسلوبی وصناعت ہے، یا جن کو مدلل بنانے میں ذہانت سے کام لیا گیا ہے۔ بعد ازاں اُن کا موازنہ اُس بہترین اور فائق تر چیز سے کیا ہے۔ جس سے ہمارا گہرا تعلق ہے یعنی کس طرح زندگی بسر کرنا چاہئے۔ وہ کہتا ہے کہ بعض لوگ ایسی چیزوں سے جن کا رشتہ حیات سے وابستہ ہے۔ ڈرتے ہیں۔ یا ناپسند کرتے ہیں۔ یا قدر و قیمت گھٹا دیتے ہیں یہ لوگ صرف غلطی پر نہیں۔ بلکہ ناشکر گذار یا بزدل ہیں لیکن یہ بھی امکان ہے کہ ایسی چیزوں کی قیمت بے جا طور پر بڑھا دی جائے۔ اور انہیں کو ماحصل حیات سمجھ لیا جائے۔ حالانکہ وہ حاصل حیات نہیں۔ بلکہ حیات سے اُن کا وہی تعلق ہے۔ جو گھر اور راستے کی سرائے میں ہوتا ہے، گویا ایک شخص جو سفر سے گھر کا عازم ہے راستے میں ایک عمدہ سرائے دیکھتا اور اُس کو پسند کرتا ہے۔ اور وہیں مستقل قیام کی ٹھان لیتا ہے ایسے انسان تو اپنا مقصود بھول گیا۔ یہ تیری منزل نہ تھی۔ بلکہ اس سے ہو کر گزرنا تھی۔" لیکن یہ سرائے دلکش ہے؟" اسی طرح اور سرائیں اور مرغزار بھی دلکش ہیں، لیکن صرف رہگذر کی حیثیت سے۔ تمہارا ایک خاص مقصد ہے اور وہ یہ ہے۔ کہ گھر پہنچ جاؤ اور اپنے خاندان، اپنے دوستوں اور ہموطنوں کے ساتھ جو تمہارے فرائض ہیں ادا کرو۔ اندرونی آزادی، تسکین، خوشدلی

اور قناعت حاصل کرد انداز بیان تمھیں اپنی طرف کھینچتا ہے، دلائل اپنی طرف مائل کرتے ہیں۔ اور تم اپنے گھر کو بھول جاتے ہو اور ظاہری رعنائیوں میں الجھ کر وہیں اپنا مسکن بنانا اور وہیں رہ جانا چاہتے ہو۔ تمھارا عذر صرف اس قدر ہے کہ وہ دلکش ہیں۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ دلکش ہیں؟ لیکن محض رہگذر یا سرائے کی طرح! جب میں ایسا کہتا ہوں تو الزام دیتے ہیں کہ میں اسلوبِ بیان اور استدلال کا دشمن ہوں۔ اور اُن سے بے پروائی برتنے کی تعلیم دیتا ہوں میں ایسا نہیں کرتا، میں تو اُن میں کھو جانے، انھیں کا ہو رہنے کے خلاف تنبیہ کرتا ہوں کہ حاصل سے بے خبر ہو گئے، جس کی سرحد اور آ گئے ہے۔

چند بلند مرتبت شاعروں کو مستثنیٰ کر کے جن کی شاعری میں تنقید حیات شاعرانہ صداقت اور حسن سے شیر و شکر ہو گئی ہے۔ باقی شاعروں کے کلام میں محاسن و معائب کا موازنہ اور یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ کہ محاسن کا پلہ بھاری ہے یا معائب کا۔ میتھو آرنلڈ مزید وضاحت کرتا اور کہتا ہے۔ کہ یہ قول مجھ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ کہ میں شاعری کو تنقید حیات کہہ کر شاعری کو نثر سے ممیز کرتا ہوں، گویا نثر میں تنقید حیات نہیں ہو سکتی۔ میتھو آرنلڈ کا جواب ہے کہ میں نے یہ جملہ یعنی تنقید حیات بہت برس ادھر استعمال کیا تھا۔ اور عام ادب کے متعلق استعمال کیا تھا، شاعری کی تخصیص نہیں کی تھی، میرے یہ الفاظ تھے "ہر ادب کا منشائے آخر اگر غور کیا جائے تو تنقید حیات کے سوا کچھ نہیں" لیکن شاعری میں تنقید حیات، شاعرانہ صداقت اور شاعرانہ حسن کے اصول کے مطابق ہونا چاہئے، یعنی اصل مضمون اور طرز ادا میں سچائی اور متانت ہو اظہار خیال مناسب الفاظ اور مکمل خوش اسلوبی کے ساتھ ہو، یہی خوبیاں ہیں۔ جو بہترین شاعروں کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ اور انھیں سے میرا مدعا ایسی تنقید حیات

ہے۔ جو شاعرانہ صداقت اور شاعرانہ حسن کے قوانین کے پہلو بہ پہلو ہوں لیکن گنتی کے ایسے شاعروں سے قطع نظر جو "کلاسک" ہیں اُن سے کم پایہ شاعروں میں ہم دیکھتے ہیں۔ کہ مکمل راستی و متانت، اور مکمل صدق شگفتہ انداز بیان کے شمول میں ہر جگہ نظر نہیں آتے، لہذا اس کی ضرورت ہے۔ کہ اُن کے کلام سے عمدہ نمونے منتخب کر لئے جائیں، اور اُن کے کلام کا بعض حصّہ قبول اور بعض حصّہ رد کر دیا جائے۔ اور اس عملِ رد و قبول کے بعد اُن کے کلام پر رائے زنی کریں اور ایک شاعر کا دوسرے شاعر سے موازنہ کیا جائے۔

میتھو آرنلڈ کے معقولات ختم ہوئے۔ اُس کے برعکس ہمارا یہ حال ہے۔ کہ ہر شاعر کو جو گنجشک سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ شاہین یا عقاب سمجھ کر بشرطیکہ مزدور اور انقلاب کا راگ الاپے "ادب برائے زندگی" کا نمائندہ اور ناقدِ حیات قرار دیتے ہیں۔ اور اُن فیتو دسے قطعاً چشم پوشی کرتے ہیں کہ شاعری میں تنقیدِ حیات شاعرانہ صداقت اور شاعرانہ حسن کے قوانین کی پابند ہے۔ نظرِ حیات اپنے وسیع ترین مفہوم میں استعمال ہونا چاہئے سیاسی معتقدات کو نظم کر دینا اور اُن امور کو جو سطحی اور پیش پا افتادہ ہیں۔ اور نظم کی بہ نسبت نثر میں ہزار درجہ بہتر اور قوی تر الفاظ میں بیان ہو چکے ہیں۔ سجو رادزان میں لے آنا نہ تو شاعری ہے۔ اور نہ تنقیدِ حیات ہے میتھو آرنلڈ نے اپنی تصانیف میں متعدد جگہ شاعری کو تنقیدِ حیات کہا ہے۔ مگر ہر جگہ یہ شرط لگا دی ہے۔ کہ تنقیدِ حیات شاعرانہ صداقت اور شاعرانہ حسن کے قوانین کے مطابق ہو۔ مگر ہمارے مفتخر ادیبوں اور نقادوں نے صرف تنقیدِ حیات کو لے لیا۔ باقی اجزا کو جو نہایت اہم تھے، چھوڑ دیا اور وہ غالباً اس لئے کہ "ادب برائے زندگی" کا ہیولیٰ طیار کرنے میں مخل اور سخت مخل تھے۔ میں

امید کرتا ہوں کہ میتھو آرنلڈ کے معقولات سے ثابت ہو گیا۔ کہ تنقیدِ حیات کا وہ مفہوم ہی نہیں۔ جو "ترقی پسند" ادیب اُس کے سر تھوپتے ہیں۔ "ادب برائے زندگی" کا پشت پناہ یہی فقرہ تنقیدِ حیات تھا۔ جب اس کا مفہوم ان لوگوں کے مفروضہ مفہوم سے الگ ہو گیا تو "ادب برائے زندگی" کی پوری عمارت ڈھے گئی اور اب کوئی نئی تعریف گڑھنا ہوگی۔

ایک دوسرے زاویہ سے اس مسئلہ پر غور کیجئے۔ روس میں شاعروں اور ادیبوں کو مجبور کیا جاتا ہے۔ کہ خیالی دنیا میں بسر نہ کرو۔ بلکہ میدانِ عمل میں کود کر حق و انصاف کی حمایت اور جور و استبداد کی مخالفت پر کمربستہ رہو۔ ہندوستان میں "ادب برائے زندگی" کے علمبردار صرف قلم سے ہنگامہ کارزار گرم کرتے اور مارتے مرتے ہیں۔ تاہم ادب برائے ادب کو نام رکھتے ہیں۔ مجھے تو چنداں فرق نظر نہیں آتا۔ کیونکہ اگر ایک میں معشوق کی پلکیں صف آرا ہو کر بیچارے عاشق پر تیر باراں کرتی تھیں۔ تو "ادب برائے زندگی" میں یہ خیالی جانباز مفروضی آلاتِ حرب کا نشانہ ہیں۔ حملے دونوں میں صرف "بادِ ہوائی ہیں"۔

ایک صاحب فرماتے ہیں کہ ادب کا فرض اولیں یہ ہے۔ کہ دنیا سے قوم، وطن، رنگ، نسل اور طبقہ و مذہب کی تفریق مٹا دے۔ اور اُس جماعت کا ترجمان ہو۔ جو اس نصب العین کو پیشِ نظر رکھ کر عملی اقدام کر رہی ہو۔ ایسی جماعت کو شاعری کی ضرورت ہی نہیں۔ کیونکہ بہیمانہ زندگی کی طرف بازگشت ہے جس میں فنونِ لطیفہ کا خیال بھی ستم ظریفی ہے۔ کیا اچھا طریقہ آزادی کی نشو و نما اور استبداد کو کچلنے کا نکالا ہے! پھر فرماتے ہیں۔ کہ ہمارا ادب زندگی کی بے ثباتی اور انسان کی بیچارگی کا نوحہ پڑھتا آیا ہے۔ اب اسے اس جذبۂ بزدلی سے نکل کر یہ کہنا چاہئے۔ کہ زندگی ابد الآباد تک ہے اور انسان اس کا

کارسازِ حقیقی ہے۔ قیامت کے یہ معنی ہیں۔ کہ روح الاجتماع داورِ محشر بن کر استبداد کو ہمیشہ کے لئے جہنم رسید کر دے۔ اور پھر اسی زمین پر ایک ایسی بہشت کی تخلیق کرے جس میں ہر انسان ذہنی، جسمانی اور روحانی ترقیوں کی بلندیوں تک پہنچے۔

ان لوگوں کی غلامانہ ذہنیت اور ہرزہ سرائی کا یہ عالم ہے۔ کہ ایک طرف تو دہریت اور الحاد کی تعلیم دیتے ہیں، مذہب، امتیازِ نسل وغیرہ کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ اور دوسری طرف ازل و ابد، قیامت، دوزخ، رُوح، بہشت اور مماثل تصورات پر جو مذہب اور تہذیب سے مستعار ہیں صورت بگاڑ کر عقیدہ رکھتے ہیں پھر اس عظیم الشان تکمیل کو شاعر کے فرمودات کا محتاج قرار دیتے ہیں جس کا نعرۂ جنگ "ادب برائے زندگی" ہے! شاعر نے اور اس کے ہمنوا انسانوں نے کہدیا کہ "ہم زندگی کے کارسازِ حقیقی ہیں" اور ہوگئے! ایک چیخ اٹھا کہ میں نے استبداد کو کچل دیا۔ اور وہ کچل گیا! "اے بہشت صفحۂ ارض پر اُتر آ"، اور وہ اتر آئی! ہے تو بہت سہل نسخہ اور وہ بھی صرف "ادب برائے زندگی" کے زور پر یا کسان کے بل بوتے پر کہ وہ آپ کا آلۂ کار بنے قتل و غارت کرے، اور عنانِ حکومت آپ کے دستِ مبارک میں دیدے۔ کہ لو بھائی اب تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ غرضکہ ادب برائے زندگی ہر مرض کی دوا ہے۔ وار خالی بھی گیا تو کوئی مضائقہ نہیں، ساری بلا کسان کے سر گئی، اور آپ نے اپنے گھر کا راستہ لیا۔ "ادب برائے زندگی" کا "ڈھول" بیکار رہتا ہے تو "ادب برائے بیکاری" یا اسی قسم کی اور کوئی تان لگانا شروع کر دی۔

جذبی کا جب یہ شعر پڑھتا ہوں تو کلیجہ پر سانپ لوٹ جاتا ہے کہ

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

نئے ادب کا پورا دھواں دھار اور شعلہ بار سانپ کی پھنکار ہیں لینے والا تبلیغی لٹریچر اس ایک شعر پر قربان کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہے زندگی کی صحیح تنقید اور ترجمانی اور اگر اسی کا نام ترقی پسند ادب ہے تو سر آنکھوں پر۔

اشتراکی شاعری کے ریگستان میں سجاد ظہیر کا مشورہ بھولے بھٹکوں کیلئے خضر راہ ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر سنتا کون ہے۔ منزل دشوار گزار ہے جس پر گامزن ہونے کو عزم و ہمت و استقلال کی ضرورت ہے۔ اور یہی اوصاف عنقا ہیں (دیکھو صفحہ ۴۵ نیا ادب، خاص نمبر)

اچھے شاعر ہر عہد میں اکا دکا ہوتے ہیں۔ معمولی شاعر خصوصاً پر آشوب زمانے میں، اس طرح نکل پڑتے ہیں۔ گویا روح بربادی، مع اپنی ذریت اور لاؤ لشکر کے مجسم ہو گئی۔ ان کی سعی ہوتی ہے۔ کہ صدیوں کی اندوختہ حکمت کو ملیا میٹ کر دیں۔ اور اس کی جگہ وقتی توہمات کا علم بلند کر کے جس طرح ہوا بادلوں کو تتر بتر کرتی یا اُن کا نقشہ بدل دیتی ہے۔ بادشاہوں کے تخت اور سلطنتوں کا تختہ الٹ دیں بعض اچھے شاعر اور مفکر بھی اس لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ اور کچھ دیر کے لئے انھیں کی سی گانے لگتے ہیں۔ انگلستان کا ایک شاعر جو بعد کو شہرۂ آفاق ہوا عنفوان شباب میں جب انقلاب فرانس سے متاثر تھا۔ تو یوں ڈینگیں مارتا تھا۔

"قدیم چیزیں بوسیدہ ہو گئیں
اچھی چیزوں میں کوئی شے کافی اچھی نہیں
ہم ثابت کر دیں گے کہ دنیا کی کایا پلٹ سکتے ہیں۔
اس دنیا میں ہم ہی بادشاہ ہوں گے، لیکن وہ زندگی اور موت کی نشانیاں
ہمارے ہاتھ سے لیں گے۔

سلطنتیں بادلوں کی طرح چولا بدلتی رہیں گی، گویا میری سانس کی تابع حکم ہیں۔"

یہی" ادب برائے زندگی" کا نعرہ ہے۔ سو برس سے زیادہ کے گڑے ہوئے مردے آج اکھیڑے جا رہے ہیں۔ اور یہ گورکنی مایۂ ناز سمجھی جاتی ہے!"

ہاں تو کہنا یہ تھا۔ کہ معمولی اور وقتی شاعروں میں جو مستقل" قدروں" سے ناواقف ہیں، چڑچڑے پن کا سبب تلاش کرنے کو دور جانے کی ضرورت نہیں ایسے شاعر اُن خواہشوں کے غلام ہوتے ہیں۔ جو اُن کے دسترس سے باہر ہیں اور جن کے حصول میں ناکام رہنے پر اپنے دل کا بخار یا بھڑاس شاعری میں نکالتے ہیں۔

یہ حقیقت بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ کہ عامۃ الناس بغیر جائزہ لئے ہوئے ایسی دل خوش کن شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں، حیرت تو یہ ہے۔ کہ بعض اشخاص بھی جن کی لیاقت مسلم ہے۔ اس جال میں پھنس جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی اتفاقی حادثہ یا بحث اُن کو چونکا کر ایسی شاعری کی خامیوں اور خامکاری سے آگاہ کر دیتی ہے دیکھا گیا ہے۔ کہ وہ لوگ جو نہ صرف وہبی شاعری بلکہ اکتسابی علوم سے بھی بے بہرہ ہیں، وہ بر خود غلط افراد جو معمولی صنعت اور پیشہ وری میں بھی "نکمے" ثابت ہوئے اتنے ہی بدمغ بھی ہیں۔ جتنے جاہل اور بے حس ہیں جو کبھی کاہلی اور سفاہت کی بنا پر شُدبُد کر لیتے تھے، بغض و حسد و کینہ کے زیر اثر شاعر بن بیٹھے۔ اور اچھے اچھے شاعروں کے منہ آنے لگے اور بعض اوقات کتب فروشوں کی سازش سے تجارتی فائدہ بھی اٹھانے لگے، عوام میں عارضی شہرت بھی پیدا کر لی کیونکہ خوشامد کا وہ زبردست طریقہ اختیار کیا جس کا جادو کبھی بٹ نہیں پڑتا یعنی انسان کے جذبات بدی و فتنہ و شر کو مشتعل کرنا۔

ان سے کوئی پوچھے۔ کہ صرف دولت ہی کیا وہ جنس ہے۔ جو ذہن انسانی کی جولانگاہ بن سکتی ہے؟ کیا حقیقت پر نظر رکھتے ہوئے اور واقعات درفرقہ وارانہ چپقلش میں جہاں قومیت کا خواب محتاج تعبیر ہے۔ اشتراکی اصول کی ترویج، خیالی پلاؤ پکانے یا بھنگ گھوٹنے سے زیادہ وقعت رکھتی ہے؟

ان کے ہفوات کو تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے۔ تو کیا شاعر کی دولت اُس کے شاعرانہ کارنامے نہیں ہیں۔ اور مزدور کا انعام خود وہ محنت نہیں ہے جس کی وجہ سے اُس کو سراہا جاتا ہے؟ یا اسی کے علی الرغم سرمایہ دار، انھیں برائیوں کی بدولت جو اُس سے منسوب کی جاتی ہیں مفلس اور قابلِ رحم نہیں؟ تاہم ایک تو حکومت کا مستحق اور دوسرا صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے قابل کیا زندگی کا مفہوم اس قدر تنگ ہے؟ اگر "ادب برائے زندگی" کی یہی بساط اور اس کے تخیل کی پرواز یہیں تک ہے۔ تو ایسے ادب اور اُس کے حامیوں پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے۔ اگر شاعری نفس انسانی کی گہرائیوں اور حیات کائنات کا مستقل اور دلکش مرقع ہے۔ تو یہ "ترقی پسند" ادیب یا شاعر ایسے ہیں جو پہاڑ کی بلندیوں پر شعر و ادب کا درخشاں معبد تعمیر کرنے کے بجائے دامن کوہ کے دھندلے کہر پر نقش و نگار بنا رہے ہیں۔ جسے ہوا کا ایک جھونکا اڑا کر لیجائیگا۔

میرے محترم دوست پنڈت امرناتھ جھا، وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی کے الفاظ یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

> ایک ذی اثر طبقہ مفکرین ہے جس کا خیال ہے کہ ایسی چیز کا بھی وجود ہے۔ جس کو کہ "ترقی پسند ادب" کہتے ہیں۔ "ادب جدید" کا ہمیں علم ہے، ہر زمانے میں طرزِ نو سے اُس کی تخلیق ہوتی ہے اور ہر دور اپنے

سے ماسبق دور کو "رجعت پسند" کہتا ہے مگر "ترقی پسند"
ادب کا تو یہ مفہوم متعین کیا جاتا ہے۔ کہ ادب کو سیاسیات
ومعاشیات سے ایک خاص مارکہ کے پروپیگنڈہ کا
آلہ بنایا جائے۔ اگر ادب میں ترقی کا منشا انداز بیان
میں جدت آفرینی ہے نئے سروں یا سنگیتوں کی
تلاش یا ایجاد ہے، نئے شاعرانہ تناسبات و لوازم
کا دریافت کرنا ہے تو البتہ اس نقطے کے کچھ معنی
اور اس میں کچھ معقولیت ہو سکتی ہے۔ ورنہ فہل ہے
موضوعات ادب نئے نہیں ہو سکتے، زیادہ سے زیادہ
اہمیت کا مرکز ثقل بدل جائے گا یا احساس قبح رد
قیمت میں تغیر رونما ہو گا یا نقطہ نظر مختلف ہو جائے گا
ترقی پر بھروسہ، استعداد عمل و حرکت کا اعتبار،
بھوک، گندگی، اور جھونپڑوں کی قصیدہ خوانی یہ
باتیں بھی نئی نہیں ہیں۔ مگر وحشت کی پوجا بھی نئی
نہیں تعطل اور ناکامی کا احساس جن کے برتے
پر عہد حاضر فلسفے میں جدید ابواب اضافہ کرنے
کا مدعی ہے۔ وہ بھی نئے نہیں، بتیاب تمنائیں
جد و جہد، دعوت عمل، ہمت و جرات، ناقابل اطمینان
وارزاں عمومی نظام اشیاء سے دل برداشتگی
کوئی عہد ایسا نہیں گزرا ہے۔ جہاں انفرادیت کو
کچلا نہیں جاتا اور جہاں رائے، نظریہ، او ر

طبائع کو حکومت ایک خاص ڈھرّے پر نہیں لگاتی،
وہ خود صناع یا ادیب کا نقطہ نظر ہے، خود اُس کا
فلسفہ ہے، باقی رسمی پینترے ہیں۔"

"ادبِ لطیف لاہور"

نظمِ معریٰ اور آزاد شاعری

از مولانا نیاز فتحپوری

فرقت صاحب نے اپنی کتاب مدّ و اکیلئے مجھ سے ایک تنقیدی مضمون
کی فرمائش کی تھی چنانچہ یہ مضمون اس کتاب کیلئے لکھا گیا تھا
مگر اسی زمانہ میں ایک دوسرے صاحب نے آزاد شاعری کے
بارے میں میری رائے دریافت کی چنانچہ میں نے فرقت صاحب سے
اجازت لیکر اسکو نگار میں شائع کر دیا۔ "نیاز"

آج کل یہ مسئلہ اکثر اہلِ ادب و انشا کا موضوع فکر بنا ہوا ہے اور خصوصیت کے ساتھ ہمارے نوجوان طبقۂ شعر و سخن میں اس پر بہت گفتگو ہوتی رہتی ہے چنانچہ اس مرتبہ میرے قیام حیدر آباد کے زمانہ میں، جامعہ عثمانیہ کے متعدد طلبہ نے مجھ سے اس باب میں استفسار کیا۔

اس میں شک نہیں کہ زبان کا مقصود صرف اظہار خیال و جذبات ہے اور جو زبان جتنے زیادہ الفاظ و اسالیب بیان اس مقصد کی تکمیل کے لئے رکھتی ہے، وہ اتنی ہی زیادہ وسیع و کامیاب ہے لیکن جس طرح ہر لفظ کا ایک خاص مفہوم ہوتا ہے اسی طرح ہر اسلوب بیان کا ایک خاص محل استعمال ہوتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ ہر ملک کے لٹریچر یا ادبیات کا نشو و ارتقا یکسر قومی تہذیب و معاشرت کا ممنون ہے اور سماج کے نظام سے علیحدہ ہو کر کوئی زبان ترقی نہیں کر سکتی۔

ظاہر ہے کہ شعر یا نظم زبان کے ابتدائی دور کی چیز نہیں، بلکہ جب ترقی

تمدن ایک خاص منزل پر پہونچ گئی تو لٹریچر میں شعر پیدا ہوا۔ گو یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ اُس وقت نثر و نظم کے درمیان تفریق کے کیا اُصول تھے اور شعر کے لئے کیا خصوصیات ضروری سمجھی جاتی تھیں، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ شعر آہنگ یا موسیقی سے ضرور تعلق رکھتا ہوگا اور ایک خاص قسم کا ایقاع (Rhythm) اس کی جان رہا ہوگا۔

شعر نے اس کے بعد آہستہ آہستہ کیا صورتیں اختیار کیں، ان سے بحث کرنے کا موقع نہیں، لیکن یہ یقینی ہے کہ شاعری نے زمانہ کے ساتھ ساتھ ضرور ترقی کی، اور اس ترقی کا تعلق بالکل آہنگ یا تال سے تھا اور یہیں سے بحروں کی بنیاد پڑی جنھیں ہم گانے کے ماتروں یا درمیان کے متعین وقفوں سے تعبیر کر سکتے ہیں، لیکن سم یا تال کا سوال اس سے حل نہ ہوتا تھا اس لئے بحروں کے وزن کے ساتھ ردیف و قافیہ بھی ضروری قرار دیا گیا۔ کہ اس سے ایک دوسرا فائدہ یہ بھی تھا کہ سننے والے کا احساسِ توازن پہلے ہی سے شعر کا ہم آہنگ ہو کر تال یا ایقاع سے کافی لطف اٹھا سکتا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب کسی قوم کا تمدن زیادہ مہذب و شائستہ ہو جاتا ہے تو اسمیں تکلفات و تصنعات بھی زیادہ ہو جاتے ہیں اس لئے تمدن اور زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ شعر میں وزن و ردیف کی پابندیاں بھی بڑھیں اور کمالِ فن یہی قرار پایا کہ ایک شاعر انھیں قیود کے ساتھ شعر کہے۔ پھر نہ صرف شعر و شاعری بلکہ تمام فنون میں ترقی کا معیار یہی قرار پایا کہ اس میں زیادہ نزاکتیں، زیادہ مشکلات پیدا کی جائیں اور اربابِ فن انھیں پیچیدہ راہوں سے گزریں نقاشی و سنگتراشی کو دیکھئے کہ قدیم تمدن میں ان کی کیا صورت تھی اور پھر ترقی یافتہ زمانہ میں وہ کتنی نازک و پیچیدہ ہو گئی۔

وحشی قوموں کے رقص و سرود کو دیکھئے اور اسی کے ساتھ زمانۂ حال کے رقص و سرود کو، بین فرق آپ کو نظر آئے گا۔ یہیں ہندوستان میں گونڈوں اور بھیلوں کے ناچ کو دیکھئے کہ زمین پر بھی قدم صاف نہیں پڑتے اور اسی کیساتھ کالکا بندادین کے رقص کو، کہ تلواروں کی دھار پر ان کے قدم کو لغزش نہیں ہوتی قدیم عہد کے بھاٹوں کی موسیقی کو دیکھئے اور پھر اس وقت کی موسیقی کو جب خیال کی ایجاد ہوئی۔ الغرض ترقی تہذیب کے ساتھ نہ صرف شاعری بلکہ تمام فنون میں مشکلات اور نزاکتیں پیدا ہوئیں اور انھیں کا رکھ رکھاؤ معیار کمال قرار پایا۔

اب اگر ہم سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ شاعری کی ان قیود کو توڑ دیا جائے تو اس کی کوئی وجہ ہونا چاہئے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ردیف و قافیہ، وزن و بحر کی پابندی کی وجہ سے جذبات و خیالات کو کما حقہٗ ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن کیا یہ بات خود اُن لوگوں کے شاعرانہ اہلیت کی کمزوری نہیں، کیا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ نظم معرّا یا آزاد نظم کا مطالبہ وہی لوگ کرتے ہیں، جن میں شاعری کے قیود کے ساتھ شعر کہنے کی صلاحیت نہیں ہے جنکے پاس الفاظ اور اسالیب بیان کا ذخیرہ کم ہے۔

اس وقت تک ردیف و قافیہ کی پابندی کے ساتھ جتنا کچھ کہا جا چکا ہے، اگر ہم اسے سامنے رکھیں، تو "آزاد نظم نگاری" کا کون سا خیال یا جذبہ ایسا ہے جو ہم کو اس میں نہ ملے گا۔ بات صرف یہ ہے کہ اس وقت کے نوجوانوں کا مطالعہ بہت تنگ ہے اور انھیں بالکل اس کی خبر نہیں کہ ان کا کوئی خیال نیا نہیں ہے اور ہر وہ بات جسے وہ ردیف و قافیہ کی پابندی سے علیحدہ ہونے کے بعد ہی کہہ سکتے ہیں، بارہا شاعری کے تمام قیود کیساتھ کہی جا چکی ہے۔

میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کا امتحان یوں بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کوئی بہتر سے بہتر نظم معرا کسی مشاق شاعر کو دیجیے، وہ ردیف و قافیہ کی پابندی کے ساتھ انھیں خیالات کو نہایت خوبی سے ادا کر دے گا۔

"نظم معرّیٰ" کہنے والوں کو بھی اس سے انکار نہ ہوگا کہ ردیف و قافیہ کی پابندی ہٹا لینے سے شعر کا ترنم و آہنگ مفقود ہو جاتا ہے اس لئے اس ترنم و آہنگ کا لطف دُور کر کے اگر کوئی اور چیز اس سے بہتر پیدا ہو سکے، تو کوئی حرج نہیں، ہم اسے گوارا کر سکتے ہیں، لیکن جب یہ مقصود بھی حاصل نہ ہو، تو پھر کیوں؟

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بعض خیالات اس قدر بلند و دقیق ہوتے ہیں کہ ہماری عام بول چال میں اُن کے ظاہر کرنے کے لئے مناسب الفاظ میسر نہیں آتے خاص کر ایسی حالت میں جبکہ شاعرانہ قیود بھی اس کے ساتھ لگی ہوں لیکن غیر معمولی ذہین آدمیوں کے یہ خیالات اپنی زبان بھی اپنے ساتھ لاتے ہیں، اور یہی وہ چیز ہے جسے ہم الہام کہتے ہیں پھر چونکہ ذہانت کے بھی مدارج و مراتب ہیں، اس لئے معمولی ذہن کا انسان تو ان خیالات کیلئے الفاظ ہی نہیں پاتا اور کہہ دیتا ہے کہ "انسانی زبان ابھی بہت پیچھے ہے" دوسرا اس سے زیادہ ذہین شخص الفاظ تو پالیتا ہے لیکن اُن میں آہنگ و ترنم نہیں پیدا کر سکتا، اس لئے وہ انھیں ظاہر تو کر دیتا ہے لیکن اس کی یہ کوشش نظم معرا سے آگے نہیں بڑھتی، ایک تیسرا شخص جو واقعی (Genius) ہے وہ الفاظ بھی پالیتا ہے اور اسلوب بیان میں بھی ترنم و آہنگ قائم رکھ سکتا ہے۔ ایسے شخص کی مثال میں، میں عہد حاضرہ کے کسی شاعر کو پیش نہیں کرنا چاہتا کیونکہ اس کے متعلق اختلاف رائے پیدا ہو سکتا ہے، بلکہ اُس عہد کے شاعر کو

پیش کرنا چاہتا ہوں، جس کی نزاکت تخیّل کو ساری دنیا نے تسلیم کیا ہے۔ اور وہ بیدل ہے۔

میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت تمام وہ شعراء جو نظم معرّیٰ کے حامی ہیں بلکہ وہ بھی جو غزل کے مخالف ہیں قطعاً بیدل سے بے خبر ہیں اور ان میں سے کسی ایک نے اس کا مطالعہ نہیں کیا، ورنہ وہ دیکھتے کہ ان کی نازک سی نازک تخیل سے بھی بیدل کی معمولی تخیل بہت بلند ہے اور ذہن انسانی کا کوئی امکانی لطیف ترین خیال ایسا نہیں ہے، جسے بیدل نے شاعری کی تمام رسمی قیود کے ساتھ نہ ادا کیا ہو اور ایسے حسن کے ساتھ کہ آورد و تصنع کی جھلک تک کہیں پیدا نہیں ہوتی۔

بہرحال اس وقت تک "نظم معریٰ" کی کوئی مثال میرے سامنے ایسی نہیں آئی جس کے خیالات کو قیود شعری کی پابندی کے ساتھ ظاہر نہ کیا جا سکے، اس لئے میں ایسی خارج از آہنگ شاعری کی ضرورت تسلیم کرنے سے معذور رہوں۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ کچھ دنوں سے "نظم معریٰ" کے ساتھ ساتھ "آزاد شاعری" کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ اول اول تو میں سمجھا کہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہوں گی لیکن اب معلوم ہوا کہ "آزاد شاعری" "نظم معریٰ" کے مقابلہ میں اتنی ہی آزاد ہے جتنی ردیف و قافیہ والی شاعری "نظم معریٰ" کے مقابلہ میں یعنی "نظم معریٰ" میں گو ردیف و قافیہ نہیں ہوتا لیکن وزن تو ہوتا ہے، اس کی کوئی مخصوص بحر تو ہوتی ہے لیکن "آزاد شاعری" ردیف و قافیہ کے ساتھ وزن سے بھی بے نیاز ہوتی ہے، یعنی در اصل وہ ہے تو نثر لیکن اس کے لکھنے والے ہم کو اس کے شعر سمجھنے پر صرف اس لئے مجبور کرتے

ہیں کہ اس کے فقرے مسلسل نہیں لکھے گئے بلکہ انھیں توڑ توڑ کر علیحدہ علیحدہ سطر میں لکھا گیا ہے۔

"نظم معریٰ" کو "نظم مقفیٰ" پر ترجیح دینا، یقیناً عجز کی دلیل ہے اور "آزاد شاعری" تو خیر ایسی طفلانہ حرکت ہے، جس کا ذکر ہی فضول ہے وہ حضرات جو قدرت کی طرف سے ذہین و خوش فکر واقع ہوئے ہیں، اُن کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے ہر خیال کو نظم ہی میں ظاہر کریں، کیا نثر میں وہ موثر طریقہ سے ادا نہیں کر سکتے اور کیا وہ اپنی نثر کو نظم کہنے سے کسی خاص نتیجہ کے توقع، رکھ سکتے ہیں؟

"نظم معریٰ" ہمارے لئے اُس وقت بیشک ایک حد تک گوارا ہو سکتی ہے، جب ہم دیکھیں کہ اس کے خیالات واقعی حد درجہ لطیف و بلند ہیں کیونکہ اس صورت میں، اُن خیالات کی لذت ایسے آہنگ و ترنم کی طرف سے ہمارے خیال کو ہٹا دے گی، لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ہم اسٹیج کے اُس دور کو کیوں بُرا کہیں جب ہر ہر بات شاعرانہ وزن و موسیقی میں ہوتی تھی۔ وہ اگر حقیقی شاعری نہ تھی تو اس میں کم از کم آہنگ و ترنم تو تھا، آزاد شاعری تو خیر سے کوئی ایک بات بھی نہیں رکھتی۔ میں نہیں کہہ سکتا یہ تحریک "ترقی پسند ادیبوں" کی ہے، یا ان لوگوں کی جو "ترقی پسند ادب" کے پردہ میں اپنی نااہلیت کو چھپانا چاہتے ہیں۔ بہر حال اس کا بانی کوئی بھی ہو، ہمارے لٹریچر کا دشمن ہے اور ملک کے نوجوانوں کو بہت سوچ سمجھ کر یہ رنگ اختیار کرنا چاہیئے۔

یقیناً نئی دنیا اپنے ساتھ نیا ادب بھی لائے گی، لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر اس میں کلاسکل شاعری کی گنجایش نہیں، تو اس لولی لنگڑی چیز

کی بھی اُسے ضرورت نہ ہوگی۔

اگراب دنیا کی آرایش از سرِ نو صرف اُصول صنعت و اقتصاد پر ہونا ہے اگر روایاتِ اخلاق و تہذیب سے گزر کر صرف "درایات مادی" ہی پر انسانی مستقبل کو سنورنا ہے، تو یقیناً ہماری کلاسکل شاعری کو بدل جانا ہے لیکن ان مشینوں کی حرکت میں جو خود بھی آہنگ و ترنم اور میکانکی وزن و بحر کی محتاج ہیں! نہ کہ آزاد شاعری کی صورت میں، جس کا ہر پیچ ٹیڑھا اور جس کی ہر چول ڈھیلی ہے!

جدید شاعری پر ایک نظر

جناب صمد رضوی

شاعری کے جدید رجحانات پر اظہار خیال کرنے سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موضوعِ شاعری پر ایک مختصر سی بحث اور تبصرہ کر لیا جائے۔ یہ اعتراض کیا جاتا ہے اور یہ اعتراض ادب کے تاریخی مطالعہ کی روشنی میں صحیح معلوم ہوتا ہے کہ قدیم شاعری کی بنیادیں حسب ذیل عناصر پر قائم ہیں۔

(۱) گل و بلبل

(۲) ساقی و میخانہ

(۳) کعبہ و بتخانہ

(۴) شیخ، زاہد، واعظ اور ناصح

(۵) قاتل و مقتل

(۶) حسن و محبت

(۷) تصوف و مذہب

اب نئی قسم کی شاعری کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی چند مخصوص عنوانات پر مشتمل ہے۔ اور اس کے اہم ترین عنوانات حسب ذیل ہیں۔

(۱) مزدور

(۲) کسان

(۳) مذہب و اخلاقیات کا مذاق اڑانا

(۴) روٹی، پیسہ، فقیر، کفن، بھوک

(۵) طوائف
(۶) شراب پرستی
(۷) حسن و محبت

جس طرح قدیم شاعری پر مخصوص عنوانات میں مقید ہو جانے کا الزام لگایا جاتا ہے، اسی طرح موجودہ شاعری پر بھی یہ الزام عائد کیا جاسکتا ہے جس طرح قدیم شاعری میں اکثر بنیادی عناصر "روایاتی درجے" پر آگئے تھے بالکل اسی طرح نئی شاعری کے اکثر عنوانات "روایاتی" بن گئے ہیں جن کو اصلیت اور حقیقت سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔ یہ شاعری معاشی اور سیاسی آزادی اور مساوات کو قائم کرنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ انسانی آزادی کے راگ الاپتی ہے۔ اس کی آزادی کا تصور ہندوستان کے موجودہ مسلمہ اخلاقی تصورات کی روشنی میں، بیحیائی، نفس پرستی، در بدتمیزی کا مفہوم رکھتا ہے۔

یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہئے کہ میں قدیم شاعری کی تعریف اور نئی شاعری کی مذمت کر رہا ہوں؟ میرے مضمون کا مقصد یہ ہے کہ میں نفس شاعری سے بحث کروں۔ اور اس لحاظ سے جو کلام بھی "شاعری" کے معیار پر پورا اترتا، ہو صرف اس کو شاعری کے نام سے منسوب کروں۔ خواہ وہ جدید کلام ہو یا قدیم خواہ وہ کسی کہنہ مشق استاد کا ہو یا کسی نو مشق شاعر کا۔ میں بہ حیثیت ایک ترقی پسند شہری کے، معاشیات، سیاسیات، عمرانیات، فلسفہ، اخلاقیات، مذہب اور سائنس پر فنی اعتبار سے بحث کرنے اور ان میں باہمی ربط و ضبط پیدا کر کے ملک کی عام خوش حالی اور معیار زندگی کو بڑھانے کے جملہ اختیارات و امکانات کو محفوظ رکھ کر صرف ایک شاعر کی حیثیت سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ شاعری کے صرف تین ہی موضوع ہو سکتے ہیں۔

(۱) حیات
(۲) کائنات
(۳) اختراعی اور حسن کارانہ تخیل

تیسرے عنوان کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیے کہ محض حسن کارانہ تخیل بجائے خود شاعری کا کوئی موضوع نہیں ہے وہ ہر شاعری کا حسن ہے۔ خواہ وہ داخلی ہو یا خارجی لیکن اختراعی تخیل شاعری کا ایک موضوع ہے۔ میں نے یہاں تینوں عنوانات بہ حیثیت ایک 'کل' کے استعمال کئے ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ زندگی اور کائنات کے ہر مظہر اور ہر نظر پر شاعری کی جاسکتی ہے مثلاً کیا حسب ذیل عنوانات شاعری کا موضوع قرار دئے جاسکتے ہیں۔

۱۔ ہندوستان میں بدھ مذہب کے تنزل کے اسباب۔
۲۔ گیہوں کی پیداوار اور اس کے لئے فائدہ بخش کھاد اور زمین کا انتخاب
۳۔ ٹراونکور کے شمال و مغربی حصہ میں، انگور، اناس اور سنترے کی پیداوار کے امکانات۔
۴۔ نیوٹن کے کلیات۔ آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت۔ کانٹ کا نظریۂ تنقید عمل۔
۵۔ جاپان کی تجارتِ خارجہ۔ چلی کے ساحل کی مدافعت۔ حیدرآباد کا ڈرینیج سسٹم۔
۶۔ دردِ گردہ کا علاج۔ کاغذ سازی۔ وائٹکس کے فوائد۔ گلبھار ہیر آئل کمپنی کا تیل۔

تو میرا جواب یہ ہوگا کہ مذکورۂ بالا جملہ عنوانات پر شاعری کی جاسکتی ہے بغزل گو شعرا کو ان عنوانات کو سُن کر تعجب ہوگا اگر یہ کہیں کہ یہ سب عنوانات غیر شاعرانہ۔

ہیں۔ ان کو قطعاً شاعری کا موضوع نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ اور تمام علم دوست حضرات جو مذکورہ بالا عنوانات پر معلومات اور عملی تجربہ رکھتے ہیں۔ میری اس بحث پر خندہ زن ہوں گے کہ کیوں کر ان عنوانات پر شعر کہے جا سکتے ہیں مگر نیا شاعر مختلف دلائل سے یہ ثابت کر سکتا ہے کہ ان میں سے ہر موضوع پر شعر کہے جا سکتے ہیں۔ اس کی بحث کی بنیاد "زندگی کی نئی قدروں" "ماحول کے تقاضوں"، اور "وقت کی ضرورت" پر مبنی ہوگی جس طرح اکثر قدیم مکتب خیال کے شاعروں نے بغیر جانے بوجھے خودی و بے خودی، "من تو شدم تو من شدی" اور دریا بہ حباب اندر، کے مضامین کا ناس مارا ہے اس طرح نئے شاعر نے بھی ابتدا بطور فیشن کے اور بعد میں ایک پیشہ کی حیثیت سے زندگی کی نئی قدروں، ماحول کے تقاضوں، اور وقت کی ضرورت جیسے الفاظ کا استعمال اپنے لئے لازمی اور ضروری کر لیا ہے۔ اس لئے کہ جب تک وہ ان الفاظ کا استعمال نہ کرے گا اس وقت تک یہ نہ سمجھا جائے گا کہ اس نے ماضی سے قطع تعلق کر کے دور جدید میں داخل ہونے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کر لی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ "زندگی کی نئی قدروں"، اور "ماحول کے تقاضوں" کی مٹی پلید ہو رہی ہے اور ہر نیا شاعر جس کو "ترقی پسند" کہلانا مقصود ہے، "زندگی کی نئی قدروں" کو اس طرح استعمال کر رہا ہے جس طرح کہ قدیم شعراء خودی و بیخودی کے مضامین باندھتے تھے۔ اور اس پر طرہ یہ ہے کہ یہ نیا شاعر جو سیاسی اور معاشی آزادی اور مساوات قائم کرنے کا دعویدار ہے۔ جو مزدوروں، کسانوں، مفلسوں، اور بھوکوں کو، انتہائی معاشی ترقی دینے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ اور جو قدیم شاعروں پر عورت پرستی کا الزام لگا کر، اپنے آپ کو ان سے ممتاز اور بلند بتلانا چاہتا ہے۔ جو دور مشنری میں اور زندگی

کے بدلتے ہوئے تقاضوں میں تہذیب و تمدن کی قدیم اور فرسودہ عمارت کو سمار کر دینے کا عزم بالجزم کر چکا ہے، جب خود شعر کہنے کے لئے بیٹھتا ہے تو قدیم شاعروں کی طرح "زلف گرہ گیر" کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ ان شاعروں کے کلام کا مطالعہ کیجئے تو بجز چند مستثنیات کے اور وہ بھی خاص خاص صورتوں میں، اکثر و بیشتر شاعر "نجمہ" کے ساتھ چاندنی رات کا لطف اٹھاتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ یا پھر "سلمیٰ" کو یہ سمجھاتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ زندگی اور جوانی دونوں ہم معنیٰ الفاظ ہیں۔

میں اس سے متفق ہوں کہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات اور بڑھتی ہوئی ضروریات کا لحاظ رکھنا از بس ضروری ہے۔ اور شاعر کی نظر اور تخیل کو صرف قدیم شاعری کے عناصر میں محدود نہ ہونا چاہئے بلکہ زندگی کے دوسرے ہزاروں اور لاکھوں مسائل پر بھی اس کو نظر ڈالنی چاہئے۔ لیکن یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ زندگی کے دیگر مسائل میں صرف ترقی پسندی کے اجزا ہی کیوں شریک سمجھے جائیں؟ کیا زندگی کے تمام فلسفیانہ، معاشی، سیاسی، اور سماجی مسائل کی وسعت سمٹ کر اور سکڑ کر، صرف انھیں اجزا میں آگئی ہے جو ترقی پسندی کے لئے لازمی ہیں؟ کہا جاتا ہے کہ مسائل تو اور بھی ہیں لیکن ترقی پسند ادب نے جن مسائل کو اٹھایا ہے، انھیں کے حل میں انسانیت کی فلاح و بہبود مضمر ہے گویا کہ تاریخ انسانی کی ہزاروں معلوم اور نامعلوم صدیاں گذر جانے کے بعد اب ایک ایسی جماعت کا انکشاف ہوا ہے جو انسانی فلاح و بہبود کے مقدس فریضہ کو انجام دینے کے لئے زندگی کے ارتقائی دور میں نمودار ہوئی ہے؟ دوسرے الفاظ میں اس دعویٰ کے معنی یہ ہوئے کہ ہمارے علاوہ دنیا کے تمام سیاسی ادارہ جات، اور انجمنیں، انسانیت کو پستی اور تنزل کی طرف

ے جارہی ہیں۔ ترقی پسند شاعری سے مراد، اشتراکی تصورِحیات کا پرچار ہے
اس سے ہٹ کر اگر کوئی شاعر کچھ لکھتا ہے تو وہ نہ ترقی پسند کہلا یا جاسکتا ہے
اور نہ اس کے خیال و فکر سے دنیا کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ گویا ترقی پسندی کے
جذبے کا لب لباب یہ ہوا کہ اگر تم اشتراکی زندگی کے حامی ہو اور اس کا پرچار
کرنا تم نے اپنی زندگی کا مقصد بنالیا ہے تو تم ترقی پسند ہو ورنہ تم کو ترقی پسندی
سے کوئی واسطہ نہیں۔ ترقی پسندی کا معیار کیا ہے؟ جو ہم نے مقرر کر دیا ہے
وہی معیار ہے۔ اس شاعری کا مقصد اور منتہا کیا ہے؟ عوام کو اشتراکیت
کی تعلیم دینا۔ ان کے سامنے اپنے مکتبِ سیاست کو پیش کرنا۔ سیاسی جدوجہد
کر کے قوت و اقتدار حاصل کرنا۔ اور بالاصرار اشتراکی ریاست قائم کرنا۔
ترقی پسند شاعر چاہے اپنی زبان سے اس کا اقرار کرے یا نہ کرے لیکن
یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس کی شاعری کا مقصد نہ زبان و ادب کی
خدمت کرنا ہے اور نہ ہندوستانی زندگی کی ترجمانی کرنا۔ بلکہ وہ اپنی دانست
میں اشتراکیت کو بہترین سیاسی مسلک سمجھتے ہوئے اس کی اشاعت میں اپنا
وقت اور سر کھپا رہا ہے۔ اور ایک ایسا نظامِ حیات ہندوستانیوں کے سر
منڈھنا چاہتا ہے جو نہ ہندوستان کے پیچیدہ مفادات کی حفاظت و ترقی
میں ممد و معاون ہو سکتا ہے۔ اور نہ ہندوستان کے تاریخی، معاشی، اور
تمدنی حالات میں اس نظام کے قائم کرنے کے کوئی امکانات موجود ہیں
میرے خیال میں یہ ایک ایسی ہی کوشش ہوگی جس طرح کہ اسپین کے باشندے
اپنی تاریخ، قومی روایات، اور تہذیب و تمدن کے ارتقار کو فراموش
کر کے چینی زندگی کے تصورات کو اپنے ملک میں رائج کرنے کی کوشش کریں،
نتیجہ ظاہر ہے۔ اس طرح ترقی پسند شعرار کا مسئلہ دراصل ایک سیاسی حیثیت رکھتا ہے

جو معاشی آزادی اور سیاسی مساوات کا ڈھونگ رچا کر، نئے سانچوں اور نئے تقاضوں کا نقاب ڈال کر، ماحول اور وقت کی پکار کے عنوان سے، اپنی سیاسی تنظیم کو آگے بڑھانے کی خاطر شاعری سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ مگر دوسری سیاسی تنظیموں سے تعلق رکھنے والے اس کے "اندازِ قد" کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ وہ اس جماعت کے اثر، نفوذ، اور وسائل سے بھی بخوبی واقف ہیں لیکن وہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے نہ تو شاعری کی مٹی پلید کرتے ہیں اور نہ زبان میں اوٹ پٹانگ جدت طرازیاں کرکے اس کو برباد کرنا چاہتے ہیں یہ بالکل ہی جداگانہ سوال ہے کہ آیا ان کو اس جماعت کی تقلید کرنی چاہیے یا نہیں۔ اس طرح یہ نام نہاد ترقی پسند شعراء کی مٹھی بھر جماعت جو بیک وقت اپنے آپ کو شاعر، فلسفی، سائنسداں اور دنیا کے تمام دیگر علوم و فنون کا ماہر سمجھتی ہے اُردو زبان کو بطور ایک "زینۂ اولیں" کے استعمال کر رہی ہے، زبان کی ترقی اور سدھار سے نہ اسے کوئی دلچسپی ہے اور نہ یہ اس کے سیاسی پروگرام میں شامل ہے۔ اس کے ادب کا بیشتر حصہ صرف "پروپیگنڈہ لٹریچر" ہے اور اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس جماعت کے اعمال نامہ کو سامنے رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو زبان کے حق میں یہ جماعت "نادان دوست" کا کام کر رہی ہے۔

سیاسیات و معاشیات میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہر سیاسی جماعت معاشی تنظیم کو اپنے پروگرام کا اہم جز و قرار دیتی ہے۔ اور اپنی افادیت اور ترقی پسندی کی صلاحیت کو منوانے کے لئے ہزارہا دلائل پیش کرتی ہے۔ ان سیاسی مکاتیب خیال کا تو ذکر ہی کیا جو بین الاقوامی حیثیت سے ہر ملک کی سیاست کو متاثر کر رہے ہیں، ہندوستان ہی کی سیاسی کشتی کو لے لیجئے۔ مسلم لیگ

کے نقطۂ نظر سے بجز پاکستان کے ہندوستانی سیاست کا کوئی دوسرا بہترین سیاسی حل نہیں ہے۔ کانگریس پریس اور پلیٹ فارم نے اپنی پوری قوت سے اس دعوی کی تردید کی ہے۔ ہندو مہا سبھا نے کانگریس کے مطالبہ آزادی اور قومیت کے تصور پر ہزاروں اعتراضات کئے ہیں اور کر رہی ہے۔ غرض کہ سیاسی اداروں میں اغراض و مقاصد کے تحت نوک جھونک ہونا ایک فطری اور ناگزیر امر ہے۔ جمہوریت نے اشتراکیت پر اور نازیت نے جمہوریت پر کیا مختلف علمی، عملی اور فنی اعتراضات نہیں کئے۔ اور کیا یہ تمام گتھیاں سلجھا دی گئی ہیں کیا دنیا کی پوری آبادی اس نتیجہ پر پہنچ گئی ہے اور کیا یہ ممکن ہے کہ صرف کسی ایک مکتبِ خیال پر سب متفق ہو جائیں؟ اگر ترقی پسند شاعر جو مسلمہ طور پر اشتراکیت کا ایجنٹ ہے اپنے مسلک اور پالیسی کو واضح کر کے اپنے ہی حدود میں رہ کر کام کرے تو اس سے صرف سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے افراد ہی تعارض کریں گے۔ ادب اور زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا وجود اور عدم وجود دونوں برابر ہیں۔ مگر وہ اپنے چہرہ پر ادب اور زبان کا نقاب ڈال کر آتا ہے اس لئے اس سے بہ حیثیت ایک شاعر کے نہیں بلکہ سیاست کے طالب علم کی حیثیت سے یہ درخواست ہے کہ وہ دنیا کے جملہ سیاسی لیڈروں کی ایک گول میز کانفرنس طلب کرے اور ہمیشہ کے لئے اس کا تصفیہ کرائے کہ سوائے اشتراکیت کے اور کوئی سیاسی مسلک عموماً دنیا کی اور خصوصاً ہندوستان کی خوش حالی اور نجات کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ اور اس کے بعد اپنے اغراض و مقاصد کی ایک فہرست مرتب کر کے شاعروں میں تقسیم کر دے۔ کہ آئندہ سے سوائے عنوانات مندرجۂ فہرست کے کسی اور موضوع اور عنوان پر شاعری نہ کی جائے۔ ہندوستانی عوام نہ تو

بیوقوفوں کی جنت میں رہتے ہیں اور نہ شیخ چلی کی طرح ایک رنگین مگر ناممکن الحصول مستقبل کا خواب دیکھتے ہیں۔ ہندوستان کی ہر سیاسی جماعت اچھی طرح جانتی ہے کہ جب اشتراکی خیالات کا پرچار کرنے والا شاعر یہ کہتا ہے کہ وہ زبان کی خدمت اور اس میں اضافہ کر رہا ہے یا نئے رجحانات اور خیالات کی وسعت پذیری کے مدنظر نئے سانچے ڈھال رہا ہے، تو سوائے اس کے کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے اور کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔

بہرحال ان تمام سیاسی مباحث کو چھوڑتے ہوئے جو اشتراکی شاعری کے ضمن میں لازماً پیدا ہوتے ہیں یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ شاعری کے لئے کسی خاص موضوع کا متعین کر دینا ناممکن ہے اور آرٹ کے نقطۂ نظر سے یہ ایک مہمل اور ناقابلِ عمل حد بندی ہوگی۔ میتھو آرنلڈ کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ "اس قسم کی کوئی چیز وجود نہیں رکھتی جسے شاعرانہ موضوع کہا جا سکے۔" ایف۔ ڈبلیو فیلکین نے "شاعر کا فن" میں موضوع شاعری پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ارسطو کے نزدیک شاعری کا موضوع انسان کی زندگی ہے اسکے قلبی واردات، "نفسیاتی" حرکات اور اس کے افعال۔

شاعری کا موضوع حیات ہے۔ اور ہر شاعر اپنے ذوق، وجدان، اور ذہنی کیفیات کے لحاظ سے "حیات" میں سے چند عنوانات کو اپنی شاعری کا موضوع قرار دیتا ہے۔ "حیات" میں سے کن اجزاء کو شاعری کیلئے منتخب کرنا چاہئے۔ اس پر نوویل سی اسمتھ نے اپنی کتاب ورڈسورتھ کی ادبی تنقید میں بہت ہی معقول رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ "شاعری کی ایک شاندار خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مواد ہر اس موضوع سے فراہم ہو جاتا ہے جس سے انسان کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔" اسی طرح آرنلڈ نے "۱۸۳۵ء کی نظموں کے

دیباچے، میں بیان کیا ہے کہ "شاعری کے ابدی موضوعات افعال ہیں۔ اور وہ خارجی افعال، جو انسان کے بنیادی جذبات کو شدت سے متحرک کرتے ہیں"
مذکورہ بالا آرا پیش کرنے سے یہ واضح کرنا تھا کہ شاعری کا کوئی خاص موضوع نہیں ہے۔ شاعر زندگی کے ہر منظر اور کائنات کے ہر منظر پر شعر کہہ سکتا ہے۔ لیکن شاعری خواہ کسی موضوع پر کی جائے اس میں انسان کی دلچسپی کے بنیادی اجزا کا پایا جانا ضروری اور لازمی ہے۔ عبدالقیوم صاحب باقی کا یہ خیال بہت ہی معنی خیز ہے کہ شاعری "غربالِ حیات" ہے۔ اس میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ کچرا کورا، غلاظت اور گندگی، تعفن اور سڑاہند کو شامل کر دیا جائے۔ اور اگر بفرضِ محال شاعر اپنے مشاہدات اور تجربات کے سلسلہ میں ان چیزوں کو بھی نظم کا جامہ پہنانا چاہے تو اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اس کی نظم "مس میو" کی کتاب یعنی ڈرینج آفیسر کی رپورٹ نہ ہو جائے۔ شاعری میں جو چیز آ سکتی ہے وہ صرف زندگی، کائنات اور تخیل کا نچوڑ اسپرٹ اور ست ہے۔ ٹینی سن کا یہ خیال حقیقت پر مبنی ہے کہ "شاعری کو اگر دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے تو شاعری کو انسانی زندگی کا پھل اور پھول ہونا چاہئے۔" مثلاً امونیا گیس کی تیاری ایک صنعتی مسئلہ ہے اس کو شاعری کا موضوع بنانا نری حماقت ہے اور یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ جو شاعر صاحب "امونیا گیس کی تیاری" پر فکر فرمائیں گے وہ کس حد تک اس میں شعریت پیدا کر سکیں گے۔ اور کس حد تک علم کیمیا کے واقف کاروں کو مطمئن کر سکیں گے لیکن امونیا گیس کے شعلے کی دلفریبی، اور دلکشی شاعری کا موضوع ہو سکتی ہے۔ گلاب کے پودوں کا لگانا اور ان میں مناسب اور مفید کھاد کے ذریعے خوش رنگ اور خوشنما پھولوں کا پیدا کرنا، فنِ زراعت

سے متعلق ہے لیکن گلاب کا جمالیاتی مطالعہ شاعری کا موضوع ہو سکتا ہے۔ ہندوستانی کسان اور مزدور کے اعداد و شمار فراہم کرنا، ان کی اوسط آمدنی اور اخراجات میں تطابق پیدا کرنا، محنت اور سرمایہ میں باہمی توازن پیدا کر کے ان کو منظم طریقہ پر ترتیب دینا، ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا، یہ سب معاشی مسائل ہیں لیکن ان کے نفسیاتی حالات، ذہنی زندگی اور جذباتی کش مکش کا مطالعہ شاعری کا موضوع بن سکتا ہے۔ اسی طرح محبت کی کیفیات کے اظہار میں (خواہ وہ محبت افلاطونی نظریہ پر مبنی ہو یا فرائڈ کے نظریہ پر خواہ وہ کوئی خالص حیوانی اور کاروباری حیثیت رکھتی ہو یا روحانی و وجدانی) سماجی رکاوٹوں کا دکھڑا، اپنے یا محبوب کے معاشی حالات کا رونا، خاندانی خصومتوں کا تذکرہ، محبوب کے اور اپنے معاشرتی درجات کے تفاوت کا اظہار، محبوب کو حاصل کرنے کے لئے اپنی اور اپنے دوست و احباب و عزیز و اقارب کی کوششوں اور اس کے مختلف مراحل و مدارج کا بیان نہ صرف غیر ضروری، غیر دلچسپ اور تضیع اوقات کا باعث ہے بلکہ اجتماعی مسائل حیات میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ البتہ محبت میں قلب و ذہن پر گذرنے والے جذبات و خیالات کی کش مکش اور اس کے نچوڑ کو شعر کی گرفت میں لے لیا جائے، تو اس سے متاثر ہونے پر انسان مجبور ہو جاتا ہے مثلاً یہ شعر مذکورہ بالا دعوی کی ایک کامیاب مثال ہے ؎

یہ میری شومیٔ قسمت کہ تم کو پا نہ سکا\
غرورِ عشق امارت کے بت کو ڈھا نہ سکا

(جمیل فاروقی)

جگر کے یہ دو اشعار جنسی زندگی کی خاص کیفیات اور واردات پر مبنی ہیں۔

کچھ نہ کہا اور بس یونہی چل دئے   کچھ نہ سنا اور خفا ہو گئے

یا

جیسے رونق ترے قدموں نے دے کر چھین لی رونق
وہ لاکھ آباد ہو اس گھر کی ویرانی نہیں جاتی

یا غالب کا یہ شعر ؎

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ   اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

میں ان رنگین فسانوں کی جو ان اشعار کی اسیر طے میں پائے جاتے ہیں تشریح و توضیح کر کے ان کی لطافت اور نزاکت کو برباد کرنا نہیں چاہتا۔ ان اشعار کو سمجھنے کا تعلق دماغ سے نہیں دل سے ہے۔ ان کے معنی سمجھنے سے زیادہ محسوس کئے جاتے ہیں۔ یہ خاص ذہنی کیفیتوں اور قلبی واردات کا نچوڑ ہیں۔ یہ جذبات انسانی ہیں۔ خواہ کوئی شخص مزدور ہو یا کسان، سرمایہ دار ہو یا غریب، جو بھی ان حالات سے گذرا ہو، وہ ان جذبات کو ضرور محسوس کرتا ہے یہ اور بات ہے کہ اتنی لطافت اور پاکیزگی کے ساتھ نہ کرتا ہو اور نہ کر سکتا ہو ان کے اظہار پر قدرت نہ رکھتا ہو۔ اب اگر جگر سے یا غالب سے ان اشعار کے "محرکات" کو دریافت کیا جائے تو وہ ایک طویل فہرست ایسے واقعات کی پیش کر دیں گے جو ایک کامیاب ڈرامے، دلچسپ افسانے، اور دلکش ناول کے لئے مفید مواد کا کام دے سکتی ہے لیکن شاعری میں اس فہرست کا کوئی قیام نہیں۔ اس لئے کہ شاعری خواہ کسی موضوع پر کی جائے اس موضوع کا نچوڑ ہونا چاہئے نہ کہ خود موضوع۔ اس کی کامیاب مثالیں "جوش" کے "کسان" "نا سزا جوانی" اور "انگیٹھی" میں پائی جاتی ہیں شوق قدوائی کا "آئینہ خیال" بھی ہندوستانی ازدواجی زندگی کی ایک بہترین مثال ہے

مخدوم کا "پرسہ" اور نظر کی "وداع" بھی زندگی کا نچوڑ ہیں۔ میں جس چیز کو مثالیں دے کر زندگی کے نچوڑ اور اسپرٹ سے تعبیر کر رہا ہوں اس کو شاعری کا موضوع بنانا، قابلیت، محنت، عملی تجربے، اور دماغ و قلب کی ایک خاص متوازن کیفیت کا کام ہے۔ قدیم شعراء نے اس کو شاعرانہ انداز میں "حاصلِ زیست" کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

نیا شاعر خواہ دانستہ یا نادانستہ ان تمام نزاکتوں اور باریکیوں میں نہیں جاتا اس لئے کہ زندگی کے گوناگوں مسائل کی کثرت اور وقت کی قلت کے باعث وہ ان کو ترک کر دینے پر مجبور ہے۔ وہ عوامی خیالات کا پرچار کرنے والا شاعر ہے۔ عوامی خیالات اور زندگی کی ترجمانی سے کیا مراد ہے اشتراکیت کی اشاعت کس قدر دلچسپ منطقی استدلال ہے۔ اسکے استدلال کی صداقت کا تجزیہ کرنے کے لئے کسی شاعر یا آرٹسٹ کی ضرورت نہیں بلکہ ہر سنجیدہ اور متمدن شہری کر سکتا ہے۔ میں عوامی خیالات اور زندگی کی ترجمانی کے متعلق اب تک اجمالی طور پر کچھ بیان کر چکا ہوں، کسی قدر وضاحت اور تفصیل کے ساتھ پھر اسی موضوع پر بحث کروں گا۔ یہاں اس قدر ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ اب سے کچھ عرصہ پہلے اشتراکی شاعری ہندوستان میں نام کو نہ تھی اور اگر تھی بھی تو برائے نام جس کا نہ کوئی اثر تھا اور نہ وزن لیکن خوش قسمتی یا بدقسمتی سے جیسے ہی روس اور برطانیہ متحد ہو گئے، اشتراکی بھی منظرِ عام پر آنے لگے۔ اور برطانیہ نے اپنے اغراض و مقاصد کی پیش رفت میں ان کی باگیں کسی قدر ڈھیلی کر دیں جنگ کیا صورت اختیار کریگی انگریز اور روسی کی دوستی ایک دوسرے کے ساتھ خلوص و ہمدردی پر مبنی ہے یا مجبوری اور جنگی حکمتِ عملی پر۔ دیرپا ہے یا جنگ کے زمانہ میں قائم رہے گی۔

برطانوی شہنشاہیت کا روس کی امداد کرنا خود اس کے اپنے سیاسی مفاد کیلئے ضروری ہے یا اشتراکیت کے قیام کے لئے۔ کمیونسٹ کیوں اتحادیوں کو عملی امداد دینے اور تعاون کرنے پر آمادہ ہیں اور سوشلسٹ صرف ہمدردی کیوں رکھتے ہیں۔ جنگ کے بعد برطانوی شہنشاہیت، امریکن سرمایہ داری اور اشتراکیت میں سے کون، کہاں غالب رہے گا۔ اور اس کے اثرات و نتائج کیا ہوں گے یہ اور اسی قسم کے متعدد سوالات ہیں جو سیاسی نوعیت رکھتے ہیں۔ ان پر میں بہ حیثیت ایک شاعر کے سوچنے کی نہ ضرورت سمجھتا ہوں اور نہ یہ میرے مضمون سے براہ راست متعلق ہیں۔

نئی شاعری کا مطالعہ کرنے اور اس کو سمجھنے سے پہلے چند اصولوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے اولاً پڑھنے والے کے ذہن میں وہ تمام بلند بانگ دعوے ہونے چاہئیں جو اس شاعری کی تائید میں پیش کئے جاتے ہیں مثلاً معاشی اور سیاسی مساوات کی اشاعت، سرمایہ داری کو نیست و نابود کر دینے کی خواہش۔ مزدوروں اور کسانوں کو نظام سرمایہ داری کے مظالم سے رہائی دلانے کی کوشش، انقلاب آفرینی، ایک بہتر، مستحکم اور پرمسرت معاشرہ کی تخلیق وغیرہ۔ اور نئی شاعری میں ان کو تلاش کرنا چاہیے کہ کیا واقعی یہ تمام چیزیں اس میں موجود ہیں یا محض باتیں بنانے کی حد تک ہی ان اصولوں کا اظہار کیا جاتا ہے۔ شاعری کی بنیادی خصوصیات بھی اس شاعری میں پائی جاتی ہیں۔ یا یہ محض ایک "تک بندی" اور "دماغی بحران" ہے۔

مخمور جالندھری اپنی ایک نظم "اشتباہ" میں فرماتے ہیں کہ ؎

ہاتھ میں اُجلا تولیہ لے کر جب میں نہانے جاتا ہوں
صابن، کنگھی، تیل، وہاں پہلے ہی سے رکھے ہوتے ہیں۔

سب سے اچھا لباس بھی اک کھونٹی پہ ٹنگا ملتا ہے مجھے
بوٹ کے فیتے کسنے نہیں پاتا ہوں ابھی میں اچھی طرح
مکھن، توس، پیالی چائے کی میز پہ رکھ دی جاتی ہے
میرے کپ میں اوروں کی نسبت دودھ زیادہ ہوتا ہے۔

ملاحظہ فرمائیے کہ ان اشعار میں کس قدر بے ساختہ پن اور سادگی پائی جاتی ہے۔ شاعر نے خلوص اظہار کا حق پورا ادا کر دیا ہے۔ یہ روزمرہ زندگی کی باتیں ہیں، جن پر اب تک کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ واقعی دنیائے ادب کو مخمور صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ صاحب موصوف نے بڑی تحقیق و تلاش کے بعد اردو ادب کو ایسے خیالات سے روشناس کر دیا ہے جس کو اردو کے شاعروں نے اب تک نظر انداز کر دیا تھا لیکن کیا یہی انقلابی شاعری ہے؟ کیا اسی شاعری سے زندگی کی نئی قدروں اور ماحول کے تقاضوں کی ترجمانی ہوتی ہے؟ کیا "دندان تو جملہ در دہاں اند" زندگی کی شاعرانہ ترجمانی کرنے کے لئے کافی ہے۔

ن۔م راشد اپنی ایک نظم "خودکشی" میں فرماتے ہیں کہ ؎

کر چکا ہوں آج عزمِ آخری
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک یہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند

دو تین مصرعوں کے بعد پھر ارشاد ہوتا ہے کہ ؎

میرا عزمِ آخری یہ ہے کہ میں!
کود جاؤں ساتویں منزل سے آج

آج میں نے زندگی کو پالیا ہے بے نقاب
آتا جاتا ہوں بڑی مدت سے میں
ایک عشوہ ساز ہرزہ کار محبوبہ کے پاس
اس کے تختِ خواب کے نیچے مگر
آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو
تازہ درخشاں لہو

پھر چند مصرعوں کے بعد بیان فرماتے ہیں کہ ؎

جی میں آئی ہے لگا دوں ایک بے باکانہ جست
اس دریچے میں سے جو
جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کوئی بام کو

نظم میں عام طور پر ایک مرکزی خیال ہوتا ہے اور جیسے جیسے نظم بڑھتی جاتی ہے اس کا مرکزی خیال بھی زیادہ واضح اور روشن ہوتا جاتا ہے اور اس کو سمجھنے کے لئے ابتدائی اشعار سے ذہن میں ایک خاکہ مرتب ہوتا ہے اور پھر ہر آگے کا شعر نظم کے تدریجی ارتقاء کو نمایاں کرتا جاتا ہے۔ لیکن اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ اگر واقعی اس کے کچھ معنی ہو سکتے ہیں تو آخری اشعار سے ابتدا کی جائے اور ابتدائی اشعار پر نظم کو ختم کیا جائے اس طریقۂ عمل سے تھوڑے بہت معنی سمجھ میں آسکتے ہیں ورنہ لاکھ کوشش کر لیجئے کیا ممکن جو کچھ بھی مطلب نکل سکے۔ میری سمجھ میں جہاں کہیں اس نظم کا مطلب سمجھ میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ شاعر ایک ہرزہ کار و عشوہ ساز محبوبہ کے پاس ایک زمانۂ دراز سے آتا جاتا ہے جو ایک عمارت کی ساتویں منزل پر رہتی ہے۔ اور اس کے کمرے کی کھڑکی ایک کوٹھے بام کی طرف کھلتی ہے۔ شاعر نے اس کے تختِ خوا

کے نیچے تازہ درخشاں لہو دیکھ پایا ہے جس کو دیکھ کر وہ اس محبوبہ سے انتقام لینے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس کو ایسے مواقع حاصل نہیں یا اتنی جرأت نہیں کہ وہ اس محبوبہ کو ہلاک کر دے۔ اس لئے قہر درویش بر جانِ درویش ناچار غریب خود ہی اس کھڑکی میں سے جست لگا کر اپنے آپ کو ہلاک کر لینا چاہتا ہے اور اس کا وہ عزم کر چکا ہے۔" گرد دیوار کو نوک زباں سے چاٹنا اور اس کا صبح تک دوبارہ بلند ہو جانا، لہو کا پایا جانا، یہ سب ایسے معمے ہیں، جو انسانی عقل و ادراک سے بالاتر ہیں۔ یا پھر زندگی کے وہ تقاضے ہیں، جو انقلاب کے طوفان کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں۔ اور ن۔ م راشد صاحب کھلم کھلا ان کا اظہار اس لئے نہیں کر رہے ہیں کہ برطانوی سیاست اس کی اجازت نہیں دیتی۔ یہی وہ مایۂ ناز شاعری ہے جو ترقی پسندی کے کیمپ سے روزانہ نکلتی رہتی ہے۔ جو مزدور اور کسان، انسان اور مشنری، محنت و سرمایہ کے مسائل کا حل تلاش کر رہی ہے۔

ایک دوسری نظم "انتقام" میں راشد صاحب فرماتے ہیں کہ ؎

اس کا چہرہ اس کے خد و خال یاد آتے ہیں
اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم
میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جس سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام

اس نظم کے ابتدائی حصہ میں شاعر نے ایک مغربی طرز پر سجے ہوئے کمرہ کا ذکر کیا ہے، جس میں جا بجا دھات اور پتھر کے بت رکھے ہوئے تھے اور آتشدان کے قریب ایک برہنہ جسم ان کو دعوت نظارہ دے رہا تھا۔

دوسرا حصّہ وہ ہے جس کو میں اوپر درج کر چکا ہوں۔ اور جو "حکایتِ آغوش" بیان کر رہا ہے۔ نظم کی ترتیب اور "اربابِ وطن کی بے بسی" کا انتقام لینے سے صاف واضح ہے کہ وہ اجنبی عورت کس قومیت سے تعلق رکھتی تھی۔ راشد صاحب کے ہونٹوں نے اجنبی عورت کے جسم سے رات بھر اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام لیا ہے، اور وہ اپنی جگہ مطمئن ہیں کہ برطانوی سامراج سے ایسا انتقام لیا گیا ہے کہ پوری ہندوستانی قوم کو ان کا شکر گزار ہونا چاہیئے کس قدر معصوم خیال ہے اور کس درجہ طفلانہ جذبہ ہے۔ یہ شاید زندگی کی نئی قدروں میں سے کوئی ایک قدر ہے۔ راشد صاحب سے متعلق ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی یہ رائے بہت خوب ہے کہ "ان کی بعض نظمیں سپاٹ ہو کر رہ گئی ہیں" کاش ان کی نظمیں اتنی سلجھی ہوئی اور با معنی ہوتیں جتنا کہ "نقش فریادی" پر ان کا مقدمہ فیض احمد اس گروہ میں .... ستھرا اور پاکیزہ مذاق رکھتے ہیں۔ ان کا خیال آزاد اور فکر اوروں کے مقابلہ میں سلجھی ہوئی ہے۔ اُن کا ایک خاص اسٹائل ہے اور یہ اپنے رنگ میں خوب کہتے ہیں انکے کلام میں وہ سب کچھ نہیں جو ترقی پسندی کے لئے لازمی اور ضروری ہے "خدا وہ وقت نہ لائے" اور "مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ" ان کی انداز فکر کے بہترین نمونے ہیں۔

آزاد نظم اور نئی شاعری کے شہ پارے میراجی کے پاس بکثرت دستیاب ہوتے ہیں "سنگِ آستاں" اور "محرومی" ان کی بڑی کامیاب نظمیں ہیں۔ مگر جس قدر زیادہ ان کے معنی و مطالب پر غور کیا جاتا ہے اسی قدر مبہم اور ناقابل فہم ہو جاتی ہیں۔ فانی نے تو زندگی کو "دیوانے کا خواب" سے تعبیر کیا تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میراجی کی شاعری پر اس کا

اطلاق بڑی خوبی کے ساتھ ہوتا ہے۔

"سنگِ آستاں" میں میراجی فرماتے ہیں کہ ؎

پکڑ کر ہاتھ میں پنچھی کو اس دھرتی کے جنگل میں
اسی خلوت کے محمل میں
ترے دل میں
جگا دوں گا میں اپنی گرم آہوں سے
اسی نغمہ کو جو سویا ہے تیرے جسم کے محجوب تاروں میں

غور کا مقام ہے کہ "سنگِ آستاں" کو اس پنچھی سے کیا نسبت جس کو میراجی دھرتی کے جنگل میں پکڑنے کے لئے بے چین نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں تاثیر، جوش، سوز، صداقت اور دیگر خصوصیات شعری کا تو ذکر ہی کیا میں دریافت کرتا ہوں کہ اس کے کوئی معنی بھی ہیں۔ کیا یہی زندگی کی ترجمانی ہے۔ کیا یہی وہ شاعری ہے جو زندگی سے بہت قریب آگئی ہے کیا یہی وہ نئے خیالات، میلانات اور جذبات ہیں جن پر اردو کے دوسرے شاعروں نے اب تک کوئی توجہ نہیں کی تھی۔ اردو ادب میں یہ بہکی ہوئی فکر کا طرز یقیناً نیا ہے۔ اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک احمقانہ ریکارڈ سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ کیا ایسی ہی نظموں سے سامراج کو تباہ کیا جائے گا۔ کیا یہی وہ اشعار ہیں جو ہندوستان کے لاکھوں اور کروڑوں بھوکوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ کیا ایسے ہی اوٹ پٹانگ الفاظ کی بھرمار سے ہندوستان کے معاشی اور سیاسی مسائل کا حل دریافت کیا جا سکتا ہے۔ قدیم شعراء نے تو ساقی، میخانہ، اور گل و بلبل وغیرہ کو اشارۃً استعمال کیا تھا۔ اور اکثر و بیشتر ان الفاظ کے استعمال سے ان کا مقصد کچھ اور

دیتا تھا۔ لیکن جدید شاعری کے کیمپ سے ایسا کوئی اعلانیہ جاری نہیں کیا گیا جس میں یہ بتلایا گیا ہو کہ فلاں فلاں الفاظ کے یہ یا وہ معنی لئے جائیں نتیجہ یہ ہے کہ جس طرح میراجی دھرتی کے جنگل میں پریشان حال پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں اسی طرح جدید شاعری کا مطالعہ کرنے والے بھی الفاظ کے گورکھ دھندے میں کھو جاتے ہیں۔ ن۔م۔ راشد کی ایک آزاد نظم "اجنبی عورت" بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ سمجھنے سے نہیں۔ نئی شاعری کا وہ حصہ جو کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتا ایسے دقیق فلسفیانہ مسائل۔ یا گہرے نفسیاتی اور علمی نظریات پر بنی ہے جس کو سمجھنے کے لئے ایک خاص حد تک تعلیم یافتہ ذہن کی ضرورت لاحق ہو۔ بلکہ وہ سرے سے مہمل اور بے معنی ہے۔ ترقی پسند شعراء اگر "پارٹی سیاست" کے تحت کھینچ تان کر اس کے کوئی معنی نکال بھی لیں تو وہ ایسی ہی کوشش ہوگی جیسے کہ "نماز عاشقاں بر شاخ آہو" کے معنی نکالنے کی کوشش ہو سکتی ہے۔

وہ شاعر جو اپنے دماغ پر کوئی بار ڈالنا نہیں چاہتا۔ الفاظ اور عنوان کے انتخاب میں وقت خراب کرنا نہیں چاہتا، شاعری کی بنیادی خصوصیات کو شعر میں نمایاں کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس کے لئے نئی شاعری اپنے اندر بڑی کشش، اور ترغیب رکھتی ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کی شاعری چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے لیٹتے، ہنستے بولتے، غرض کہ ہر وقت کیجا سکتی ہے۔ رہا یہ اندیشہ کہ اس خرافات کو کون شائع کرے گا۔ اس کا اب کوئی وجود نہیں اس لئے کہ اردو زبان کے رسالے ہاتھوں ہاتھ ایسی شاعری کو لے لیتے ہیں۔ اور شائع کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی آبادی کا ہر تیسرا آدمی انقلابی شاعر بن گیا ہے۔ اور اگر اس کی رفتار کا یہی عالم رہا تو وہ دن دور نہیں جبکہ پوری ہندوستانی قوم انقلابی شاعروں کی

قوم میں تبدیل ہو جائے گی اور پھر سامراج کی تباہی اور ہندوستان کی آزادی منٹوں میں حاصل کی جا سکے گی!

میں نے اوپر کہیں بیان کیا ہے کہ نئی شاعری کو زیادہ سے زیادہ اشتراکی شاعری کہا جا سکتا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ روسی ادب میں ایسی شاعری کا کوئی وجود نہیں ہے۔ چونکہ ترقی پسند شعراء سیاسی حیثیت سے اشتراکیت کے حامی ہیں اور اسی مسلک کے پرچار کو انھوں نے اپنی شاعری کا مقصد قرار دے لیا ہے اسی لئے میں نے ان کی شاعری کو اشتراکی شاعری سے موسوم کیا ہے۔ بلکہ صحیح طریقہ پر یہ کہنا مناسب ہو گا کہ "یہ خود ساختہ اشتراکی شاعری" ہے۔ نہ اس میں شعریت ہے اور نہ ہندوستانیت۔ نہ یہ شاعری زندگی کی ترجمانی کرتی ہے اور نہ زندگی سے قریب ہے۔ بلکہ یہ فکری انتشار کا لازمی اور ضروری نتیجہ ہے۔ جس طرح مجذوب کی بڑ اور دیوانے کی بکواس میں کچھ کام کی باتیں نکل آتی ہیں۔ اسی طرح اس شاعری میں بھی کہیں کہیں حقیقت اور شعریت کی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں۔ شاعری خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی۔ داخلی ہو یا خارجی اس میں شعریت ضرور ہونی چاہئے لیکن مذکورہ بالا قسم کی شاعری میں، ایک معتد بہ حصہ ایسے خیالات و جذبات پر مشتمل نظر آتا ہے جس میں شعریت تو کجا معنی و مفہوم بھی نہیں پائے جاتے اس شاعری کے متعلق خود میراجی کی رائے بہت صحیح ہے جو انھوں نے ۷ر جنوری ۱۹۴۳ء کی "آواز" میں اپنے ایک مضمون "نئی شاعری کی بنیادیں" میں ظاہر فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ؎

"نیا شاعر ایک ایسے چوک میں کھڑا ہے جس کے دائیں بائیں آگے پیچھے کئی رستے نکلتے ہیں لیکن اسے پوری طرح نہیں معلوم ہے کہ کونسا رستہ

اس نے طے کر لیا ہے۔ ماضی کی تجربے کیا اہمیت رکھتے ہیں کب تک۔ اسے یونہی کھڑے رہنا ہے۔ حال کی اضطراری کیفیات کب تک۔ اس کا ساتھ دیں گی۔ اور کون سے راستہ پر اس کو چلنا ہے مستقبل کے خطرات اس کو کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ نیا شاعر ماحول میں اپنی گہری دلچسپی کا بہانہ کرتا ہے لیکن حقیقتاً وہ صرف اپنی ذات کے ایک دھندلے سے عکس میں محو ہے۔" (جامعہ دہلی)

کچھ نئے ادب کے متعلق

(جناب کلب مصطفےٰ صاحب ایڈوکیٹ)

ایک مخصوص اشتراکی حلقے کی طرف سے نئے ادب کے نام سے جن عریاں تصوّرات اور مبہم تخیلات کی پیشکش اور لفظوں نیز محاوروں کی جو تراش خراش کی جا رہی ہے اس کا مقصد خواہ جو بھی ہو لیکن اس کا موجب غالباً وہ اقتصادی اور سیاسی نظام ہے جس نے ہندوستان کو مخصوص طور پر سرمایہ داری کے شکنجہ میں کس رکھا ہے اور جس کے نتیجہ میں آج نہیں صدیوں سے ہندوستان کی ایک وسیع آبادی ایسی ہو گئی ہے کہ نہ تو اُسے پیٹ بھر کھانے کو ملتا ہے اور نہ تن ڈھانکنے کو پورا کپڑا۔ چنانچہ روس میں اشتراکی نظام کی فی الجملہ کامیابی نے نہ صرف یہ کہ ہندوستان میں ویسی ہی اشتراکی جماعت کے قیام میں مدد دی بلکہ دبی ہوئی آگ کو ہوا دیکر پوشیدہ جذبات بغاوت کو اُبھارا بھی لیکن چونکہ ہندی سامراجی نظام کو کلیتاً بدل کر اشتراکی نظام کی طرح ڈالنا خود ہندوستانیوں میں نظم و شعور کی کمی کی وجہ سے پڑھے لکھے اشتراکیوں کی تمام کوششوں کے باوجود جلد ممکن نہ تھا اس لئے ہمارے پڑھے لکھے نوجوانوں نے موجودہ صورتِ حال کو بدلنے، مزدوروں کی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے اور اشتراکی نقطۂ نظر کو کامیابی کے ساتھ پیش کرنے کا ایک نوکھا انداز اختیار کر لیا یعنی انھوں نے ہر اُس چیز سے عمداً نہیں قطعاً تحت الشعوری انداز میں خواہ مخواہ کی نفرت پیدا کرا لی جسے سرمایہ داری سے ذرا سا بھی لگاؤ ہوا!! اور چونکہ اردو زبان عہد سرمایہ داری ہی کی زبان ہے اس لئے باوجود اس کے کہ اب اُسے زبان کا مرتبہ حاصل ہو گیا ہے اور اس کے قواعد اور لغت مرتب ہو چکے ہیں ہمارے نوجوان اُردو زبان کی علی الرغم ایک نئی بولی اور اردو شاعری کے مقابلہ میں ایک عجوبہ شاعری کی داغ بیل ڈال کر گویا سرمایہ دارانہ ذہنیت سے بغاوت

کر رہے ہیں۔ نہ معلوم روسیوں کی زبان پر بھی روس میں اشتراکی نظام قائم ہونے سے قبل کسی قسم کا کوئی ایسا ہی اثر مرتب ہوا یا نہیں کہ سرمایہ داری شکنجے میں کسے ہونے کے اعتبار سے موجودہ ہندوستان اور سابقہ روس میں کافی ؟ ومماثلت ہے یا ہم ہندوستانیوں نے ہی جذبات پرستی کی بنا پر بندر کی بلا طویلے کے سر ڈال کر اُردو زبان اور اردو شاعری کی کانٹ چھانٹ کی بیخ کنی کا مترادف سمجھ لیا ہے ———— اور چونکہ یہاں کی معاشرتی پابندیوں کی وجہ سے جنسیات کے سلسلہ میں ہمارے نوجوانوں کو روٹی کی مانگ سے اس قدر ہم آہنگ کر دیا کہ روٹی کی آڑ لے کر جنسیات کی بھوک بھی بہ آسانی کم کی جائے۔ چنانچہ ہمارے نئے ادب میں جنسیات کا عنصر بھی غالب رہنے لگا وہ بھی اپنی انتہائی برہنگی کے ساتھ جسے ہمارے کرم فرما "اظہارِ حقیقت" کہتے اور اسی بنا پر اُسے حق بجانب ٹھہراتے ہیں اور یہ یقین کرنے کہ زندگی میں روٹی اور جنسیات کے علاوہ اور رکھا ہی کیا ہے اس نظریہ کا پرچار ان کے نزدیک ایک مذہبی فریضہ بن گیا ہے معلوم نہیں نئے ادب کے حامیوں کو اس نظریہ کی بنا پر ہندوستانی دہقان سے قریب تر ہونے میں بھی کچھ مدد ملی یا نہیں اس لئے کہ آج اپنی جگہوں سے ہمارا دیہاتی کاشتکار بھی اسی نظریہ کی اہمیت کو "بھوجن" اور دوسرے ہم وزن لفظ کا استعمال کر کے پیش کرتا رہا ہے جس کے زبان پر جاری کرنے کی اجازت ہماری قدامت پسندی کیلئے یا تہذیب ہم کو نہیں دیتی۔

ہاں تو سوال یا اعتراض یہ نہیں ہے کہ ادب میں ———— روٹی اور جنسیات کی مانگ کو جگہ کیوں دی گئی یا اس کے ذریعہ سے مارکسی تعلیم کیوں دی جاتی ہے یا "ادب برائے زندگی" کے دقیع لیکن پرانے نظریہ کو ایک نیا نظریہ قرار دے کر کیوں پیش کیا جا رہا ہے بلکہ پوچھنا یہ ہے کہ سرمایہ داری کی دشمنی میں ہمارے نوجوانوں نے اُردو زبان خصوصاً اُردو شاعری کو کیوں تختۂ مشق بنا رکھا ہے۔ کیا موجودہ انقلابی دور میں رنگ و توازن و مناسبت

اور حسن و دلفریبی وغیرہ کے متعلق انسان کے خیالات بدل گئے ہیں یعنی کیا اب ہم نے ان چیزوں کو دلکش سمجھنا چھوڑ دیا ہے جو کل تک ہمیں اچھی معلوم ہوتی تھیں۔ کیا گلاب خوشنما نہیں معلوم ہوتا یا حسین چہروں میں کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ کیا مصرعوں کا توازن کانوں کو برا معلوم ہونے لگا ہے اور کیا نظم و نثر میں فرق کرنے کی اہلیت ہم سے صلب کر لی گئی ہے جو ہمارے نوجوان "محروم مدعا" "نظم منشور" کو "موزوں" فرمانے پر تلے ہوئے ہیں اور اس طرح گویا خود اپنے توازن ذہنی کے کھو دینے کا مظاہرہ فرماتے ہیں؟

آخر موجودہ طرز شاعری میں جو نئے ادب کے نام سے ہم پر عائد کی جا رہی ہے وہ کون سی خصوصیت ہے جس کو اوزان کی پابندی کے بعد قائم نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اگر نئے شعراء واقعتاً قدرت شاعری رکھتے ہیں تو پھر وہ تنقید حیات کے لئے شاعرانہ محاسن سے معرا ہو جانا کیوں ضروری سمجھتے ہیں۔

نئے محاوروں، الفاظوں، اور ترکیبوں کے وضع کرنے کے سلسلے میں بھی نئے ادب کے محرکین اپنی ایسی ہی ذہنی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں جیسی کہ وہ اردو نظم کے معاملہ میں کرتے ہیں۔ چنانچہ تمام مقررہ اصول و قواعد کو روند کر وہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے پر مصر ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ نئے الفاظ، ترکیبوں اور محاوروں کے اضافہ سے زبان کی وسعت میں اضافہ ہوتا ہے لیکن کیا ساتھ ہی ساتھ یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ دوسری زبانوں کے محاوروں کو اپنی زبان میں ترجمہ کرنا خود اپنی زبان کے حق میں دوستی نہیں کھلی دشمنی ہے؟

رہا اردو لکھنے پڑھنے میں زیادہ وقت لگ جانے کی بنا پر اس کے حروف تہجی میں ترمیم کرنے کے سلسلہ میں ہمارے کرم فرماؤں کا زبانی انہماک تو ظاہر ہے کہ اس منزل کی طرف ہر وہ قدم جو سوچا اور سمجھا ہوا پڑنے لگا ہم سبھوں کی مبارکباد کا مستحق ہوگا۔ البتہ یہ

یاد رہے کہ اُردو رسم الخط سے واقف ہو جانے کے بعد "زود خوانی" اور "نثر نگاری" کی بنا پر جو وقت آخر کار بچتا ہے وہ اس تضیع اوقات سے کہیں زیادہ ہے جو اُردو زبان کی ابتدائی تعلیم میں پیش آتی ہے۔

بہر حال اردو زبان میں ایسے محاوروں کا وضع کرنا جو نامانوس اور غیر ضروری ہونے کے علاوہ دوسری زبانوں کے محاوروں کے حرف بحرف ترجمے ہوں یا ایسی تراکیب کو استعمال کرنا جو دوسری زبانوں سے اخذ کی گئی ہوں اُردو رسم الخط کو بدلنے کا خیال کرنا اور اُردو نظم کو منظوم نثر بنانے کی تدبیر میں نکالنا اردو زبان کی ہمہ گیری کو بڑھانے کا نہیں بلکہ گھٹانے کا ہم معنی ہوگا جو لسانی اعتبار سے نہیں سیاسی نقطۂ نظر سے بھی آخر کار مضر ہی ثابت ہوگا۔

نیا ادب

جناب سراج الحسن صاحب سراج لکھنؤ

نئے ادب کا بچپنا بھی نظر سے گذرا۔ یہ زمانہ دولار کا تھا جب اس کا نام غالباً ادب لطیف تھا۔ انگڑائیاں لیتی ہوئی جوانی پیش نظر ہے اور امید ہے کہ شکنوں اور جھرّیوں سے مالا مال اس کا بڑھاپا بھی نگاہ سے گذرے گا۔ وجہ تسمیہ کی حقیقت پر غور کرنے کی ضرورت نہیں، سامنے کی بات ہے۔ اس وقت شعر و سخن کی دنیا دو حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصّے میں کھدّر کی قسم کے پرانے ادیب اور شاعر آباد ہیں۔ دوسرا حصّہ نوآبادیات کے تحت میں آتا ہے۔ یہ حصّہ نئی پود کے روشن خیال نوجوان شعراء سے معمور ہے پرانے شعراء کا کلام "پرانے ادب" کے نام سے مشہور ہونے والا ہے۔ اور نئے شاعروں کی سخن سنجیاں نئے ادب کے نام سے خواہ مخواہ موسوم ہو کر رہ گئیں اس میں کوئی نہیں کہ اختلاف نام کے بغیر تفریق و امتیاز کے پیدا ہونے کی اور کوئی صورت نہیں نئے شاعروں کا نیا کلام اس نئے نام کا جائز حقدار بھی ہے۔ نیا ادب ہے کیا؟ حقیقت تو تجزیہ کرنے کے بعد ہر وقت رونما ہو سکتی ہے۔ نقد و تبصرہ کا آئینہ قاعدے سے سامنے ہو۔ ایسی مہمّت کی رسم، گوناگوں دلچسپیوں کے ساتھ ادا ہو رہی ہو اور ارباب نظر تھوڑی بہت رونمائی حسب حیثیت پیش کریں۔ چہرہ وہ نیک ساعت جب آئے گی تو دیکھا جائے گا۔ مگر یہ کیا قیامت ہے کہ پرانے ادب والے نئے ادب کو بے ارادہ بھی دشمنی کی نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہوتے جاتے ہیں۔ اُن کا عام خیال ہے کہ نیا ادب ترقی پسند نوجوانوں کے ذہنی ارتقا کی نام نہاد پیداوار ہے جو معنی سے بے نیاز اور مطالب سے یکسر ناآشنا ہے۔ اس کی غرض بھی فوت اور حاصل بھی ناپید ہے۔ نیا ادب مخرب اخلاق، تہذیب سوز اور فحش سے لبریز ہے۔۔۔۔

خدا جانے کیا ہے۔ ان اعتراضوں کو نامناسب اور نازیبا کہنے کو میرا جی چاہتا ہے۔

اس لئے کہ سب دھان بائیس پسیری نہیں ہوتے۔ نئے ادب کے نام لیوا میری معلومات کے مطابق تین گروہوں پر مشتمل ہیں۔ پہلا قبیلہ اُن ارباب حل و عقد کا ہے جو پرانے ادب کے پرانے گنہگار رہ چکے ہیں۔ پڑھے لکھے خاصے اور اعلےٰ درجہ کی تعلیم سے مالک ہیں۔ چونکہ یہ حضرات مغربی تہذیب میں شرابور ہیں اس لئے ان کی جدت طرازیاں ہر چیز کو نئے لباس میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ پرانے ادب کے چار گرہ کپڑے والے گریبان کو اپنے نزدیک چاک کر بیٹھے اور شاعری کے گلے میں کالر کا پٹہ اور نکٹائی بغیر بسم اللہ لکھے ہر وقت باندھنے کو تیار ہیں۔ دوسرا قبیلہ بھی ازیں قبیل ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پرانے ادب سے رسمی صاحب سلامت رکھنا بھی انھوں نے روا نہ رکھا۔ وہ شاعری کے پرندے کو نئے پر پُرزوں سے آراستہ و پیراستہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ قبیلہ پرانے ادب کی حسین پرچھائیں کو نئے ادب کے گورے گورے لطیف و عریاں جسم پر پڑتے دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ تیسری قوم جو سب سے زیادہ خطرناک ہے وہ نمبر ایک اور نمبر دو کے مقلدین حضرات ہیں۔ اس تیسری قوم کا وجود رہین منت ہے اُن ضمیر فروش اخبار کے مدیروں اور رسالہ سازوں کا جو ان کے بے معنی اور لغو افکار سفلیہ کو اپنے اخبار اور رسائل کے کالموں میں جگہ دیتے ہیں۔ اس تیسری قوم کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو اس کا امکان ہے کہ چند اصولی اختلافات رفع ہو جانے کے بعد پرانا ادب اور نیا ادب دونوں ہم آغوش ہو جائیں۔ میرے اس مختصر مقالے میں تیسری قوم والے دو شیزہ قسم کے شاعر قریب قریب خارج از بحث ہیں۔ میرا روئے سخن ان ادیبوں کی طرف ہے جو نئے ادب کے حق میں موجد فن کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی شاعرانہ عظمت ابھی تک میرے دل میں برقرار ہے۔ میں اس نظریہ کا پابند ہوں کہ ہر وہ چیز جو پرانے ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہو وہ ضرور قابل قبول ہے اور یہ ماننا پڑے گا کہ نئے

ادب کی طرف سے پرانے ادب میں ان خوشگوار اور قابل قدر اضافوں کا سلسلہ جاری ہے؟
لیکن ایسا نہ ہو کہ جو شاعری کے حسین کالبد کو تمام و کمال بدل دے۔ ایسی جدت جو
خد و خال شعر میں تغیر عظیم پیدا کر دے اور اس طرح کہ ہماری شاعری کی صورت بھی نہ پہچانی
جا سکے اُسے بالغ نظریں کسی طرح دیکھنا گوارا نہ کریں گی۔ نئے ادب کے طرفدار اور
موجد یہ دلائل پیش کرتے ہیں کہ "عریاں" نویسی دراصل حقیقت نگاری کا نام ہے۔ آرٹ
کو آرٹ کی حیثیت سے دیکھئے۔ ہر چیز کو اپنے اصلی لباس میں پیش کرنا چاہئے۔ "کیوں
کہا ہے" پر اعتراض نہ کیجئے بلکہ یہ دیکھئے کہ کس طرح کہا ہے۔ اپنی کوشش میں آرٹسٹ
کامیاب ہے یا نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شاعری کی اس ستر پوشی ہی نے ہماری
شاعری کو ایک معجون مرکب بنا کر رکھ دیا۔ ہماری شاعری ہماری زندگی کا حقیقی آئینہ
ہونا چاہئے۔ یہ دلیل اگر قوی ہے تو صرف نئے ادب کی شاعری ہی اس سے متاثر
کیوں ہو۔ حیات کی گوناگوں رنگینیوں اور دیگر شعبوں میں یہ قوی دلیل اتنی بودی
کیوں ہو جاتی ہے۔ یہ ہے پہلا اصولی اختلاف جو پرانے ادب اور نئے ادب کی
شاہراہوں کو جدا کر دیتا ہے۔ اس کا کیا سبب ہے کہ غریب شاعری کا قیمتی لباس
جدت طرازی کی نخاس میں کوڑیوں کے مول فروخت کر دیا جائے اور اشاعت حق
کی سعی بلیغ میں اس کا پیکر عریاں کبھی تو "لب سڑک" متحرک نظر آتا ہے کبھی ہوٹلوں
میں اور چائے خانوں میں شیشہ بدست و جام بہ لب کبھی پبلک مقامات پر برسر سٹیج
رقصاں نظر آتا ہے اور خدا رکھے ریڈیو کو جس کی وساطت سے فضاؤں اور ہواؤں میں
منتشر ہو کر ہمارے کانوں میں چھم سے یا چھم سے پھاند پڑتا ہے۔ حیات کے دیگر شعبوں
میں بھی عریانی اشاعت حق میں کار فرما نظر کیوں نہیں آتی۔ کوٹ، پتلون، اچکن
پاجامہ، کرتا، دھوتی پہننا بھی تصنع میں داخل ہے حقیقت انسانی صرف آئینہ عریاں
میں نظر آتی ہے جس طرح شاعر کے مجسمہ کو لباس کی ضرورت ہے مکان کی ضرورت ہے؟

آڑ کی ضرورت ہے اور تخلیے کی ضرورت ہے اسی طرح شاعر کی اولادِ معنوی کو بھی کم از کم
ایک لنگوٹی کی ضرورت ضرور ہے۔

جہاں تک آرٹ کی تکمیل کا تعلق ہے ہم معترف ہیں کہ ان مخصوص ترقی پسند
شعراء کے کلام میں جو نئے ادب کے روحِ رواں ہیں اور جن کا ذکر آگے آئے گا وہ جملہ
محاسن موجود ہیں جن کے وہ علمبردار ہیں۔ اُن کے آرٹ میں تکمیل بھی ہے اور دلکشی بھی۔
اب رہا نئے ادب کا مذاقِ شعر میرا خود بھی یہ قول ہے کہ کسی کے مذاقِ شعر پر [illegible]
کرنے کا کوئی حق نہیں مگر وہ مذاقِ شعر جو سوسائٹی کے رشتوں کو کڑی کے جالے کی طرح
توڑ ڈالے جو سماج کی بندشوں کو کاٹ کر پھینک دے یقیناً قابلِ اعتراض ہے۔ سوسائٹی
کا خوف اور سماج کا ڈر بھی کوئی چیز ہے۔ دنیا کی چھوٹی سی چھوٹی لغزشیں اور گناہ
چار دیواری کی آڑ میں، رات کی تاریکیوں میں گم ہو کر جنگلوں اور ویرانوں میں چھپ کر
انجام پاتے ہیں۔ یہ کیوں؟ محض سوسائٹی کے ڈر اور سماج کے خوف کی وجہ سے۔ ایک مصور
دو تصویریں بناتا ہے ایک برہنہ اور دوسری ملبوس، دونوں آرٹ کا بہترین نمونہ ہوتی
ہیں۔ نگاہِ خریدار دونوں کی قیمت ادا کرتی ہے۔ مگر ایک تصویر ڈرائنگ روم کی دیوار پر
مسکراتی ہوئی نظر آتی ہے اور ایک البم کی تہوں میں بند رہتی ہے۔ سوسائٹی کے خوف
کے علاوہ اس کا کوئی اور سبب بھی ہو سکتا ہے۔ اگر شدت کی گرمی پڑ رہی ہو تو کپڑے تک
اُتار کر پھینک دینے کو جی چاہتا ہے۔ مگر اس وقت وہ کون سی چیز ہوتی ہے جو ہمیں ننگے پن
سے محفوظ رکھتی ہے۔ وہی سوسائٹی کا خوف۔ اگر نئے ادب کے علمبردار یہ چاہتے ہیں کہ ہم
سوسائٹی کے اسی خوف کو دور کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں تو یہاں پر ہم بھی قائل
ہیں۔ اگر یہ خوف دور ہو جائے تو فریقین ایک ہی مرکز پر نظر آئیں گے۔ اگر ہندوستان
کے حمام میں سب ننگے ہوں تو اعتراض کرنے والا کہاں سے پیدا ہوگا۔

دوسری چیز نئے ادب میں قابلِ غور یہ ہے کہ بیشتر نظمیں جذبات و تخیل سے یکسر

معمّا نظر آتی ہیں۔ اور اگر کوئی چیز ہوتی بھی ہے تو ایسی کہ دلی جذبات برانگیختہ ہونے کے بجائے عجیب قسم کے جذبات تحریک میں آتے ہیں۔ ہندوستانی بہو بیٹیوں کی زندگی میں ماحول کی وجہ سے جو تغیر پیدا ہو گیا ہے اس کے لئے اصلاحی نظموں کی ضرورت ہے ان کی معاشرتی کمزوریوں کا خاکہ اُڑا کر منظر عام پر فخریہ پیش کرنا قوم اور وطن دونوں کی توہین ہے۔

بعض نظموں کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ تمہارے سب دانت تمہارے منہ میں ہیں اور تمہاری آنکھیں ابرو کے نیچے ہیں۔ غلط محاوروں اور غلط ترکیبوں سے نظم کرنے کی کامیاب یا ناکام (دونوں طرح صحیح ہے) کوشش بلیغ کی جاتی ہے اور شعر کی موزونی سے خواہ مخواہ دشمنی برتی جاتی ہے۔

ایک اصولی اختلاف بلینک ورس سے بھی ہے۔ اس وقت میرے محترم دوست میر اکبر حیدری مرحوم خدا انہیں جنت نصیب کرے بے اختیار یاد آ گئے۔ دوستانہ انداز میں خلوص و ایمانداری کے ساتھ اس مخصوص بحث پر میرے ان کے درمیان کچھ عرصہ تک مضمون بازی ہو چکی ہے۔ میں شرح و بسط کے ساتھ اپنے خیالات اس موضوع پر قلمبند کر چکا ہوں۔ اس وقت مختصراً اتنا اتنا ضروری سمجھتا ہوں کہ بلینک ورس کو مغربی تقلید کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ آخر اس کی ضرورت کیا ہے۔ موزونی شعر کا عنصر غالب ہو قافیہ اور ردیف کی قید کے ساتھ ہماری شاعری جب اپنے انتہائی کمال کو پہونچ چکی تو اس خواہ مخواہ کی جدت کی آخر ضرورت کیا ہے۔ اور اسی سلسلے میں یہ بھی عرض کر دوں کہ جان بوجھ کر موزوں کلام کو شعر کے موزوں نام سے پیش کرنا کس قسم کی جاپانی یا جرمنی ایجاد ہے۔ کوئی ٹکڑا نظم کا اگر دو سوت کا لمبا چوڑا ہے تو کوئی ایک میل کا۔ اس شاعرانہ پیمایش کا آخر حاصل کیا ہے۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ مقررہ موضوع سے کوئی واسطہ نہیں رکھا جاتا۔ عنوان تو ہے "ہوائی جہاز" اور نفس مضمون میں جاپانی رستے کھلنے نے ایک انتشاری

کیفیت میں بکھرے نظر آتے ہیں۔

زیادہ تر یہی دیکھا گیا ہے کہ تیسری قوم کے غیر ذمہ دار حضرات غلط تشبیہیں، ناقص استعارے اور اغلاط سے بھرپور ترکیبیں بے دھڑک نظم فرما دیتے ہیں مثلاً جاڑوں کی بارش کے لئے اگر یہ کہا جائے کہ چاندنی ٹپک رہا ہے تو کہاں تک روا ہے۔

ایک صاحب نے اپنی ایک نظم میں یہ ٹکڑا پیش فرما کر نئے ادب کی دنیا میں اپنے جینے کا ثبوت دیا ہے۔ فرماتے ہیں "سسکتی ہوئی لاش"۔ لاش تو نام ہے اُس بے حس و حرکت ڈھیر کا جو فراق زندگی کی مجسم شرح اور وصل مرگ کی خاموش تفسیر ہو۔ اسکے ساتھ سسکتے کا لفظ کس مصلحت سے صرف کیا گیا اس کی تفصیل شاعری کی تھرکتی ہوئی زبان سے سنی جا سکتی ہے۔

ذیل میں ایک شاعر کی نظم کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں ؎

میرے باورچی خانے میں
میری کانی نوکرانی کو
میرا کانا نوکر
اپنی کانی آنکھ سے
دیکھ رہا تھا

اس نظم میں تخئیل کی رعنائی ملاحظہ فرمائیے۔ جذبات کی فراوانی کے جو طوفان پوشیدہ ہیں انھیں ٹٹول کر محسوس فرمائیے۔ کانے عاشق اور کانی معشوق کے راز و نیاز کو تاک، شاعر بچشم خود ملاحظہ فرما کر ہمیں بھی حسن و محبت کی ان دلچسپ حقیقتوں سے روشناس کرانا چاہتا ہے جو اُس کی شاعری کے لئے واقعہ نگاری کا سامان بن سکے۔ خیر جو کچھ خدا دکھائے گا دیکھیں گے۔

ذیل میں یہ نادر الوجود نظم ملاحظہ ہو۔ پوری نظم نقل کرنا وقت کو ضائع کرنے کے

مرادف ہے۔ کچھ حصہ جہاں تک ضبط یاوری کرے گا ضرور نقل کروں گا جس ترتیب سے یہ نظم لکھی ہوئی ہے اس کے لئے اصلی مطبوعہ نسخہ یا پوسٹر ملاحظہ فرمایا جاوے۔

عنوان ہے "سادہ سوال" نظم حسب ذیل ہے ؎

ایک ــــ ابیکار ــــ فقیر اور بیچارا ــــ تنہا ــــ وجہ پریشانی خود !

ایک اور ایک ــــ ؟ ــــ دو ــــ جمع کا اک سادہ سوال ــــ رونق بزم ہستی

ایک ضرب ایک ــــ ؟ ــــ دو اور اک تین ــــ کبھی چار ــــ کبھی پانچ بھی ہو جاتے ہیں

...... ایک اور اک دو کا وہی سادہ سوال

باعث ہنگامۂ دہر ....

اس نظم کا آخری حصہ بھی ملاحظہ فرمائیے جو حاصل نظم ہے۔

تجھکو آجائے اگر جمع کا یہ سادہ سوال

تیری دنیا بھی حسیں ہو جائے

کس کی مجال ہے کہ اس نظم کے حسن وقبح پر قلم اٹھا سکے۔ ناظرین کرام اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس سے لطف اندوز ہوں۔

بہر حال اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ یہی تیسری قوم والے وہ حضرات ہیں جنھوں نے نئے ادب اور ان کے حامیوں کو بدنام کر رکھا ہے۔

تاثیر ایم اے، فیض، ابن حزیں، میرا جی۔ ن۔م۔ راشد۔ اختر شیرانی جذبی، مخدوم محی الدین، جاں نثار اختر، علی سردار جعفری، علی جواد زیدی، احتشام وغیرہ اور ان کے علاوہ بھی بعض نام ہیں جو اس وقت میرے ذہن میں نہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں جو اس وقت نئے ادب کی جان ہیں۔ ان میں سے بعض حضرات تو ایسے ہیں جو پرانے ادب سے ناآشنا نہیں اور پرانے ادب کی جھلک بھی انکے نئے ادب والے کلام میں نظر آتی ہے۔ اور بعض ایسے ہیں جو صرف نئے ادب کے حامی ہیں

بہرحال ان حضرات کا کلام سنا بھی اور پڑھا بھی۔ ان کے متعلق عام طریقے سے یہ حکم لگا دینا کہ ان کی ادبی جد وجہد ایک واہیات اور خرافات قسم کی کوشش ناکام ہے ان کا کلام بے معنی ہوتا ہے۔ یہ خود نہیں سمجھتے کہ یہ کیا کہتے ہیں، یہ سب اعتراض غلط اور عظیم الشان بہتان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں محاسن یقینی ہیں البتہ بعض چیزیں ایسی ہیں جن سے ہمیں اصولی اختلافات ہیں۔ نئے ادب کی عالمگیر خامیوں کے ذمہ دار یہ لوگ نہیں بلکہ وہ تیسری قوم والے نوجوان شاعر ہیں جن سے میں ناظرین کرام کو روشناس کرا چکا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس اس وقت مندرجہ بالا حضرات کا کلام موجود نہیں ہے۔ ورنہ میں ایمانداری کے ساتھ حسن و قبح دونوں سے بحث کرتے ہوئے نقد و تبصرہ کے ساتھ اسے پیش کرتا۔ بعض شعراء کے کلام کا ایک مختصر سا حصہ اس وقت موجود ہے جسے موجودہ صحبت کے لئے غنیمت سمجھتا ہوں۔ حضرت امین حزیں کی ایک نظم کسی زمانے میں نظر سے گذری تھی جو اس وقت موجود نہیں نظم اچھی خاصی تھی۔ صرف ایک مصرع پر تنقیدی نظر حسب عادت ٹھہر گئی تھی۔ وہ مصرع ذہن میں اب تک محفوظ ہے۔ وہ مصرع یہ ہے۔ ع

اللہ کا فٹ بال فرشتوں نے اچھالا

سورج کو فٹ بال سے تشبیہ دی گئی ہے۔ تشبیہ بری نہیں ہے فٹ بال بلندی پر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ روشنی نہ سہی مگر وجہ شبہ موجود ہے۔ یہ بلند خیالی قابل داد ضرور ہے۔ صرف اس ٹکڑے کی موحدانہ اور عارفانہ جدت ایک نئی اپج ضرور ہے۔ "اللہ کا فٹ بال" معلوم نہیں اللہ میاں فٹ بال کیا کھیلتے ہیں سینٹر فارورڈ کھیلتے ہیں یا گول کیپری فرماتے ہیں۔ خیر مصرعہ کا یہ حصہ تو حقائق و معارف سے متعلق ہے اور تصوف کے حدود میں سب کچھ کہنا روا ہے۔ اب مصرع کے دوسرے ٹکڑے کا گیند دھڑکا کیجئے تو اچھالنے کی حقیقت سے روشناس ہونے کا

موقع مل جاتا ہے بصدرِ اچھالنا کی گردان میں وہ چیز آتی ہے جو ہاتھ سے اچھالی جاتی ہے فٹ بال تو پاؤں سے کھیلا اور ٹھکرایا جاتا ہے۔

ایک اخبار میں میراجی کی ایک نظم اس وقت پیش نظر ہے جس کا عنوان ہے "رخصت" نظم اسی کتاب میں کسی جگہ درج ہے

نظم پڑھتے وقت سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ دوست کی رخصتی ہے یا خود قائل رخصت ہو رہا ہے نظم کے بعض ٹکڑے بتاتے ہیں کہ خود قائل کی رخصتی ہے جیسا کہ اس ٹکڑے سے ظاہر ہوتا ہے "آپ ہی آپ میں بیٹھے ہوئے دھارے کی طرح اپنے پاؤں کو بڑھا لیتا تھا" میں نے پوری نظم کو نہایت شوق سے پڑھا اور اس بات کا جائزہ لیا کہ میرا کوئی جذبہ متاثر ہوا مگر حد درجہ مایوسی ہوئی۔ نہ تو کوئی اثر دماغ پر پڑا اور نہ دل پر "وہی چوکھٹ جسے لاکھوں پاؤں روندتے روندتے اس حال پہ لے آئے تھے" یہ لفظیں اتنا پتہ دیتی ہیں کہ کسی بوسیدہ عمارت کی طرف اشارہ ہے۔ اور ایک خفیف سی عبرت کی جھلک ایک برباد جھروکے سے جھانک رہی ہے نظم کو کامیاب بنانے کی کوشش کسی طرح مشکور نظر نہیں آتی رستے میں پھسل کر بغیر چلے راستہ طے کیا مگر پھر بھی میدان شعر کی مسافت طے نہ ہوئی۔ ساون میں کسی ڈال پر گرگٹ نے رنگ بھی بدلا مگر نظم میں رنگینی پیدا نہ ہوئی۔ ایوان لپٹا ہوا ہے سمٹا ہوا ہے۔ اور پھر اشارہ ہے یہ شاعرانہ انجینیری کی صنعت کا معجزہ کبھی سامع کو ایمان لانے پر مجبور نہ کر سکا بھولی یادیں پھسلتے ہوئے بلبلوں کی طرح باتوں کو لے آئیں مگر پھر بھی کوئی بات نہ پیدا ہو سکی طائر نے بہتے بہتے ٹہنی پر بسیرا لیا مگر شعر کا آشیاں نہ سنوار سکا۔ جھومتی ٹہنی سے لپٹی ہوئی ہتھیلی بے جان زمین کے اوپر شاعر نے اپنی ہستی کو لدے گرا دیا مگر پھر بھی کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

اخبار کا کالم یہ بتاتا ہے کہ یہ نظم میراجی کی ہے۔ اور میراجی یہ باور کرنے کو

تیار نہیں کہ ایسی نظم بھی میراجی کہہ سکتے ہیں۔ لٹریچر نام ہے انتخابات کا۔ مصنو رہو یا شاعر وہ مجبور ہے کہ اپنے انتخابات منظر عام پر لائے جس کے پرکھنے کا حق ناظرین کو ہر وقت حاصل ہے۔ اگر یہ نظم میراجی کی ہے تو نئے ادب کا ایک ناکام نمونہ ہے جو معنی اور مطالب در موزونی کی دولت سے تہی دست ہو کر ایسی حقیر اور کم مایہ ہے کہ نگاہِ خریدار اس کی کوئی قیمت لگانے کو تیار نہیں۔

حضرت فیض کی بھی ایک مختصر سی نظم اخبار غازی بہرائچ میں نظر سے گذری نظم حسب ذیل ہے۔ سہ

لیڈر

سالہا سال سے بے آسرا جکڑے ہوئے ہات
رات کے سخت سیہ سینہ میں پیوست رہے
جسطرح تنکا سمندر میں ہو سرگرم ستیز
جسطرح تیتری کہسار میں یلغار کرے
اور اب رات کے سنگین و سیہ سینہ میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جا بجا نور نے اک جال سا بُن رکھا ہے
دور سے صبح کے دھڑکن کی صدا آتی ہے
تیرا سرمایہ تری آس یہی ہاتھ تو ہیں
اور کچھ ہے بھی تیرے پاس؟ یہی ہاتھ تو ہیں
تجھکو منظور نہیں غلبۂ ظلمت لیکن
تجھکو منظور ہے یہ ہات قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دن
رات کی آہنی میت کے تلے دب جائے

اس نظم میں لیڈر کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ یہ نظم کم از کم موزونی کی لطافت سے مالا مال ہے۔ الفاظ بھی بجائے خود بے معنی نہیں مجموعی حیثیت سے مضمون واضح طور پر سمجھ میں نہیں آتا۔ پہلا شعر یہ بتاتا ہے کہ کوئی لیڈر قید و بند میں گرفتار ہے اور ایک عرصے سے زندانی ہے۔ ہاتھ سالہا سال سے زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں مگر رات کے سخت و سیہ سینے میں وہ پیوست کیسے رہے یہ چیز سمجھ میں نہیں آتی اگرچہ شعر تھوڑے سے بہت اثر کا حامل ضرور ہے۔ اگر سخت و سیہ سینے سے تاریکی زندان مراد ہے تو روشن خیال حضرات یہ جانتے ہیں کہ آج کل کے زندان حفظان صحت کے خیال سے

تعمیر ہونے ہیں ۔ تاریکی زندان پرانی تخئیل ہے۔ نئے ادب نے اس زنجیر کو پہلے ہی توڑ دیا ہے نظم کا آخری حصہ بتاتا ہے کہ لیڈر ہر قربانی کے لئے تیار ہے۔ نظم کا درمیانی حصہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ زیب داستاں کے لئے شاباً بڑھا دیا گیا ہے۔

بہرحال میرا جی اور حضرت فیض کے یہ چند اشعار دیکھ کر میں کوئی مستقل رائے قائم کرنے کے لئے تیار نہیں اس لئے کہ ان کے اچھے کلام سے میرے کان اور نظر دونوں آشنا ہو چکے ہیں۔

اسی سلسلے میں ایک نظم حضرت مجید امجد بی،اے مدیر عروج کی نظر سے گذری حضرت پڑھے لکھے آدمی ہیں اور نظم میں نئے ادب کی جھلک بھی ہے۔ اسلئے ذمہ دار حضرات کے ساتھ ان کا کلام بھی پیش کیا جاتا ہے۔ نظم کا عنوان ہے "بُندا" "کاش میں تیرے بُنِ گوش کا بُندا ہوتا" نظم خاصی ہے۔ تین چار شعر درج ذیل ہیں۔

میں ترے چمپئی رخسار کو چوما کرتا
میں ترے گیسوؤں کی بینگ میں جھوما کرتا
تیری دوشیزگیوں کی میں ضمانت ہوتا
تیری بے لوث جوانی کی امانت ہوتا
صبح کو گرتے ترے جسم سے جب باسی پھول
میرے کھو جانے پہ ہوتا ترا دل کتنا ملول
تو مجھے ڈھونڈتی کس شوق سے گھبراہٹ میں
اپنے مہکے ہوئے بستر کی ہر اک سلوٹ میں
کان سے تو مجھے ہر گز نہ اُتارا کرتی
تو کبھی میری جدائی نہ گوارا کرتی
کاش میں تیرے بُنِ گوش کا بُندا ہوتا

جیسا کہ میں نے عرض کیا نظم خاصی ہے۔ آخری تینوں شعر اچھے ہیں، مگر نظم کا خیال ماخوذ ہے شیکسپیئر کے رومیو جولیٹ والے ڈرامے سے جس میں عاشق نے معشوق کو جھروکے میں بیٹھے ہوئے اس عالم میں دیکھا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ گال پر رکھے بیٹھی ہوئی اور ہاتھوں میں دستانے پہنے ہوئے تھی اور عاشق کی زبان سے بے اختیار نکلا تھا کہ کاش میں ترے ہاتھوں کے دستانے ہوتا کہ تیرے رخساروں کی قربت تو حاصل ہوتی۔

خیر اس تقلید میں کوئی نقصان نہیں نظم میں جدت ہے۔ مگر پہلے شعر میں بینگ کو تا نیث نظم فرمایا ہے۔ دوسرا شعر خدا جانے کیا ہے۔ ؎

تیری دوشیزگیوں کی میں ضمانت ہوتا | تیری بے لوث جوانی کی امانت ہوتا

دوشیزگی واحد صفت کا نام ہے۔ جمع کا صیغہ عجز نظم کا ثبوت دیتا ہے۔ یہ شعر بے معنی ہوتے کے باوجود رکیک خیال کا حامی اور گندہ ہے جنابِ شاعر تحفظ کی ضامن ہے شاعر صاحب گوشت و پوست کی صورت میں نہیں بلکہ بندے کی شکل میں دوشیزگیوں کی ضمانت فرمانے کے متمنی ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ ضمانت کیونکر فرمائیں گے۔ کیا معشوق کے دروازے پر قفل لگا کر نگہداشت فرما ہوں گے۔ بے لوث جوانی کیا ہے۔ غالباً معصوم اور بے گناہ جوانی سے مراد ہے۔ یہ سب کچھ سہی مگر آپ بذات خود بیک بینی و دو گوش جوانی کی امانت کیونکر ہوں گے۔ اور اس امانت کا امین کون ہوگا۔ جدتِ تخیل کی یہ ملمع سازی تنقید کی کسوٹی پر جھوٹی ثابت ہو رہی ہے۔

حضرت مسعود زاہدی کی ایک طولانی نظم مطبوعہ ہفتہ وار "ہندوستان" بمبئی بھی اتفاق سے اس وقت موجود ہے عنوان ہے "ترانے ہیں فسانے ہیں" نظم عجیب و غریب ہے۔ صرف ایک بند ملاحظہ ہو۔ ؎

ترانے ہیں فسانے ہیں

جہانِ عشق کے رنگین ترانے ہیں فرماتے ہیں

گر جاتی ہیں کسب تحقیق کی نظریں
تھوں ہیں زندگی کی چھوٹر کر سطحیں
اگر جائے کوئی تو جا کے یہ دیکھے
گراں ہیں کس قدر یہ بیت کے نغمے
محبت کس قدر انمول ہوتی ہے
حقیقت یہ ہے دنیا میں
مقرر مول ہوتا ہے ہر اک شئے کا
خواہ زیست ہو الفت ہو یا رسمی محبت ہو

نظم میں کھینچ تان کر معنی پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ نئے ادب کا نمونہ بھی ہے اس لئے پیش کی گئی بعض ٹکڑے موزوں ہیں اور بعض ناموزوں۔ خدا جانے یہ دورنگی مرغوب طبع کیوں ہے۔

یہ ہیں وہ چند اشعار جو مشتے نمونہ از خروارے کی مصداق نئے ادب سے بطور نمونہ پیش کئے گئے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نئے ادب اور پرانے ادب میں اختلافات کے اسباب و علل کیا ہیں۔ سننے میں یہ آیا ہے کہ نئے ادب کے شاعر پرانے ادب کو دریابرد کر دینا اس وجہ سے چاہتے ہیں کہ وہ پرانا فرسودہ اور بوسیدہ ہو چکا۔ اب نئے عنوان نئے خیالات نئے استعارے اور نئی تشبیہوں کی ضرورت ہے اور پرانے ادب کے شعراء اس لئے جلا وطن کر دیئے جائیں کہ پرانے ہو گئے اونھیں اب نئے نوجوان شعراء کے لئے جگہ خالی کر دینا چاہئے۔ ہم یہ عرض کریں گے کہ ہمیں ایک کونے میں الگ پڑا رہنے دیجئے۔ ہمارا مسلک شاعری جدا اور آپ کا مشرب الگ ہے۔ اگر محض قدامت اور پرانا پن کسی چیز کے رد کرنے کی دلیل ہے تو ذات باری تعالیٰ سب سے زیادہ قدیم اور پرانی ہے۔ پرانے خدا کو معزول کر دیجئے اور ایک نیا خدا انتخاب فرما لیجئے۔

ہمیں جو اختلاف نئے ادب سے ہے وہ ہم نے بصد ادب آپ کے سامنے پیش کر دیا یعنی آپ کے مذاق شعر میں جہاں تک عریانی کا سوال ہے ہم اُس سے متفق نہیں جیسا ہم تفصیل سے اوپر بیان کر چکے ہیں۔ دوسرا اختلاف بلینک ورس سے ہے جس کے متعلق چند مزید باتیں پیش کرنے کو جی چاہتا ہے یعنی اور مطالب سے اگر بیگانگی نہ برتی جائے اور موزونی کو اگر حدودِ شعر سے خارج نہ کیا جائے تو بلینک ورس کی اشاعت و اجرا میں چنداں مضایقہ نہیں لیکن پرانے ادب کے قافیے اور ردیف سے آخر اتنی دشمنی کیوں ہے۔ دنیا کی ہر چیز ایک نظام کے ماتحت ہے۔ شاعری کا نظام قافیہ ردیف اور وزن سے وابستہ ہے۔ ان عناصر کو مردود قرار دینا ملکۂ شاعری کی حکومت کے خلاف بغاوت ہے۔ اور اس بغاوت کی ضرورت کیا ہے جب نظام قابل عمل اور اس کی صنعتی تکمیل مسلم ہو چکی۔ نہ تو پرانا ادب برباد ہو سکتا ہے اور نہ نئے ادب کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکا جا سکتا ہے۔ پھر آخر اس ول فراد کی ضرورت کیا ہے۔ نئے اور پرانے ادب کے حامیوں کو ایک کانفرنس منعقد کر کے ان اختلافات کو طے کر لینا میرے خیال میں بہتر اور انسب ہوگا۔

معذرت

مجھے افسوس ہے کہ باوجود انتہائی کوشش کے چند غلطیاں عبارت میں رہ گئی ہیں جو درج ذیل ہیں۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۳۰	پہلی سطر	پیسا اپنیسرا پنیا	کانس اپنا
۱۳۱	۸	طوفاان	طوفان
۱۳۲	۱۳	گے گی	لگے گی
〃	۱۴	فری ڈھیل	فری ڈھیل
〃	۱۸	کھو یہ	کہو یہ
۱۳۳	۱	۱۳۲	۱۳۳
〃	۲	کھائی دیگا	دکھائی
〃	۵	ہمرادہیرسے	ہمراہ تیرسے
۱۳۶	۶	تو	تو
۱۴۱	۱۲	کھنچے کھنچے	کھنچے کھنچے
۱۴۲	۱۳	سر ذات	بدذات
۱۴۷	۴	نا کد خدا	نا کتخدا

مختصر فہرست کتب اردو

کتابوں کی قیمت میں اضافہ ہو رہا ہے اس وجہ سے فرمائش وصول ہونے پر جو قیمت ہوگی اس قیمت سے کتابیں روانہ ہوں گی

گرہن از راجندر سنگھ بیدی — حور بی از اختر انصاری — انگارے افسانے از غلام عباس

دانہ و دام 〃 — اندھی دنیا 〃 — آنندی و دیگر افسانے 〃

منٹو کے افسانے از منٹو — شبستان از زبیر سلطان — محشرستان از محشر عابدی

روسی افسانے ترجمہ منٹو — کلیاں اور کانٹے از اختر اورینوی — خار و گل از ایم اسلم

آؤ — از منٹو — نازو از اختر انصاری — سرگزشت عروس از شاہد احمد

آتش پارے 〃 — الاؤ از سہیل عظیم آبادی — ہفت پیکر از حفیظ جالندھری

دنیا کی عورت از کوثر چاندپوری — ان کہی از ممتاز مفتی — معیاری افسانے

عورتوں کے افسانے 〃 — لہریں از شفیق الرحمان — کلیاں از عصمت چغتائی

اور انجم 〃 — گرداب از احمد ندیم قاسمی — نازیا از الطاف مشہدی

ترکی کے افسانے از حاجی لق لق — خیالستان از سجاد حیدر مرحوم — محبت کا انتہا از ل احمد

ملنے کا پتہ :- یونیورسل بک ایجنسی لکھنؤ

زندگی کے کھیل از ل احمد	عمر	کیلے کا چھلکا از سند باد جہازی	عمر	طلسمی فانوس از سجاد حسین مرحوم	عار
کیمیاگر از پروفیسر محمد مجیب	عمر	جدید جغرافیہ پنجاب ″	عمر	جام سرشار از پنڈت سرشار	عمر
سدا بہار پھول از سدرشن	عہ	کولتار از عظیم بیگ چغتائی	عار	خدائی فوجدار ″	عمر
چندن ″	عہ	خانم ″ ″	للعہ	صبح زندگی از راشد الخیری مرحوم	عمر
سولہ سنگھار ″	۱۲ر	شریر بیوی ″ ″	عمر	شام زندگی ″	عمر
لمحات رنگین از رئیسہ سلطانہ	عار	جنت کا سوت ″	عمر	شب زندگی ″	عار
نگارستان از نیاز فتحپوری	عہ	چغتائی کے افسانے مکمل ″	سہ	طوفان حیات ″	عمر
جمالستان ″	للعہ	سچا جیکن از امتیاز علی تاج	عمر	شاہد رعنا از قاری سرفراز حسین مرحوم	عار
شہاب کی سرگذشت ″	للعہ	سنبل گلشن از خواجہ محمد شفیع	عمر	خمار عیش ″	۱۲ر
ترغیبات ″	سہ	زاد راہ از پریم چند	عمر	سلامبو از عنایت اللہ دہلوی	سہ
گہوارہ تمدن ″	عار	آخری تحفہ ″	عمر	نجم السحر نظم ″	عار
سیری نا تمام محبت از امتیاز علی	عمر	پریم بتیسی ″	عمر		عمر
لاش اور دوسرے افسانے ″	عمر	پریم چالیسی	سہ	دیوان غالب (جامعہ)	عمر
گوشت الیاس کی شہرہ ″	عمر	ایام عرب کامل از مولانا شرر مرحوم	سہ	کلیات اکبر الہ آبادی کامل	سہ
پطرس کے مضامین از پطرس	عار	روضۃ الکبریٰ ″	عار	باقیات فانی از فانی بدایونی مرحوم	عمر
سفر کی رقاصہ ″	عمر	جوہر ای حق کامل ″	للعہ	نشاط روح اصغر گونڈوی	عار
موج تبسم از شوکت تھانوی	عار	شوقین ملکہ ″	عار	کلیات حسرت	سہ
بحر تبسم ″	عار	زوال بغداد ″	عار	شعلۂ طور۔ جگر مراد آبادی	عمر
سودیشی ریل ″	عمر	حسن کا ڈاکو ″	عار	نغمۂ طور۔ بہزاد لکھنوی	عمر
بکواس ″	عار	جعفر و عباسہ از حکیم محمد علی مرحوم	عار	سریلی بانسری حضرت آرزو	عار
خنداں از رشید احمد صدیقی	عار	اختر و حسینہ ″	سہ	بانگ درا علامہ اقبال مرحوم	سہ
طنزیات و مضحکات ″	سہ	عبرت ″	سہ	بال جبریل ″	سہ
زندگی از ملا رموزی	عار	امراؤ جان ادا از رسوا مرحوم	عار	ضرب کلیم ″	عہ
شادی ″	عار	ذات شریف ″	عمر	شکوہ جواب ″	۸ر
گلابی اردو	عمر	حاجی بغلول از سجاد حسین مرحوم	۱۲ر	شعلہ و شبنم جوش ملیح آبادی	للعہ

اس کے علاوہ ہر قسم کی کتابیں ہم سے طلب کیجئے۔ منیجر یوسفی پریس لکھنؤ

[illegible]